افسانے

دورنگا

سلمان بخاری

عکس
AKSPUBLICATIONS

دو رنگا

دو رنگا

سلمان بخاری

عکس
AKSPUBLICATIONS

مہ واختر

کے

نام

پیش لفظ

اردو کہانی اکیسویں صدی میں داخل ہونے سے پہلے بھی اپنے امکانات کی سرحدیں انوکھے اور نامعلوم سمتوں اور علاقوں میں دریافت کر رہی تھی لیکن اب اردو کہانی پوری دنیا میں اسرار اور حیرت کے نئے سفر پر گامزن ہوتے ہوئے ہر لمحہ ہمیں چونکانے کے لیے اپنے دامن میں نت نئے کردار اور ان کا افسوں کہیں نہ کہیں سے تلاش کر کے لے آتی ہے۔ کہانی کبھی بھی کہیں سے آجاتی ہے، ہر لمحہ کہانی ایک حیرت بھی ہے اور تجربہ بھی ہے۔ لگتا ہے وہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ یہ بات میں نے اپنی کہانیوں کے مجموعے "کہانی مجھے ملی" میں بیان کیا تھا اور اب سلمان بخاری نے اپنے مجموعے "دورنگا" میں اپنے دیباچہ میں بھی بیان کی ہے، جس کا عنوان انھوں نے "بیدار تخیل" رکھا ہے۔ سلمان بخاری جاپان کے شہر کانا گاواکین میں رہتے ہیں۔ اس بیان میں انھوں نے کہانی کو یادداشت سے جوڑتے ہوئے زمانوں کے مدوجزر میں تلاش کیا ہے۔ خیال جب جاگ رہا ہو تو وہ زمان ومکاں کو توڑ کر کہیں بھی رشتہ جوڑ لیتا ہے اور پھر کہانی وہاں موجود ہوتی ہے۔ سلمان بخاری کے ان فسانوں یا کہانیوں کو سمجھنے کی یہ ایک کلید ہے۔ انسان کی تسخیر کی تمنا، اس تمنا کی معراج اور ازلی مجبوریوں کے درمیان ان کہانیوں نے کہیں جنم لیا ہے۔ سلمان بخاری نے خود اس بات کو یوں لکھا ہے:

> "میری یہ کتاب ایسے ہی کرۂ زمین کے دشمن لوگوں کے لیے ایک بیداری کا پیغام ہے، میری خواہش ہے کہ قارئین اس مثبت پیغام کو ہر شخص تک پہنچائیں۔ خاص طور پر ان لوگوں تک جو موسمیاتی تبدیلیوں سے بے خبر دنیاوی نشوں کا شکار ہو کر جیتے جی سو رہے ہیں۔"

ان کے اس بیان کے بعد ان افسانوں یا کہانیوں کا مرکز سمجھ میں آ جانا چاہیے۔ انھوں نے سائنسی معلومات اور تکنیکی ترقی کے ساتھ زندگی کے بدلتے ہوئے اسلوب کو اپنے تخیل کے زاویوں سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہانیاں طنز اور تنقید کا پیکر لیے ہوئے ہیں۔ یہ تمام موضوعات سائنسی ترقی اور انسانی مقدر کے حوالے سے کہیں پیروڈی تو کہیں براہ راست طنز کا اظہار کرتی ہیں۔ "دو رنگا" جو اس مجموعے کا نام ہے کلوننگ کی سائنس سے متعلق ایک بھرپور طنز ہے ہمارے سماجی رویوں پر، جو خوبصورتی کے معیاروں میں افراط و تفریط میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہ امکانی دنیا کا ایک نقشہ پیش آتا ہے۔ جنگل میں مشاعرہ دراصل ہمارے ہی معاشرے کا ایک رخ ہے۔ اسی طرح Aviation city بھی سائنس کے ان امکانات کے نتیجے میں انسان کا فطرت پہ حاوی ہونے کا خواب ہے جہاں ایک فیملی ایسا جہاز لینا چاہتی ہے جس میں اس کا خاندان ہر طرح سے محفوظ ہو کر ایک نئی بستی یا نئی دنیا میں جا سکے۔ یہ کسی حد تک سائنس فکشن ہی کی ایک شکل ہے۔ یہ تمام کہانیاں دراصل سلمان بخاری نے آج کے انسان کی قلابازیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے لکھی ہیں۔ اسی طرح "کسان موومنٹ" انڈیا کی موجودہ حکومت کے سفاکانہ حکومتی اقدامات پر گہرا طنز ہے۔ سلمان بخاری نے یہ سب افسانے دراصل آج کے عالمی تناظر میں ہونے والی تبدیلیوں اور انسان کے انتہا پسندانہ اقدامات اور سوچ کو طنز کا نشانہ بنانے کے لیے تحریر کیے ہیں۔

ان افسانوں کی خوبی ان کا اختصار ہے کہ یہ افسانے اپنے بیانیہ میں ایک فطری جذباتیت اور فطری تخلیل رکھتے ہیں۔ سلمان بخاری نے خیال کو کھلا چھوڑا ہے اور جو مستقبل کے امکانات ہو سکتے ہیں، ان کو کیری کیچر، طنز اور پیروڈی کے ذریعے بیان کر کے ہمیں آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انھیں ہم مکمل طور پر سائنس فکشن نہیں کہہ سکتے۔ یہ ہمارے ہی معاشرے کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں جو صرف سلمان بخاری کو دکھائی دے رہی ہیں، شاید ہمیں دکھائی نہیں دے رہیں۔ میں ان کے اس مجموعے پر ان کے اچھے مستقبل کی پیش گوئی کرتا ہوں۔

اصغر ندیم سید

21 اگست 2021

فہرست

	بیدار تخیل	سلمان بخاری	9
1	دورنگا		17
2	جنگل میں مشاعرہ		27
3	چھینکوں سے یہ زکام بھگایا نہ جائے گا		37
4	Shoe		43
5	Aviation City		47
6	کسان موومنٹ		53
7	Poison		67
8	چمگادڑ اور تتلی		75
9	دوسری شادی کا بخار		77
10	گھڑیاں		91
11	Death with Breath		107
12	بیل کی زندگی		115
13	Jumngundal Family Tree		119
14	Town of Khoor		127
15	Waterfall of Wisdom		135
16	Sphinx The Architect		139
17	Tale of Insi		147
18	گلدستہ		153
19	اداسی کے نشے کا آخری دن		161

0305 6406067
PDF Book Company

20	Tidal Force	165
21	چھوٹے بڑے پودے	173
22	Biometric Sensors	177
23	موقا	183
24	بیوپاری	189
25	گلاشم نائنہ	195
26	ہچل	207
27	جھوٹ اور سچ کی ملاقات	215
28	غم اور خوشی	219
29	بُری، اچھی، گھناؤنی، عجیب، بھیانک اور ہولناک عادتیں	223
30	چھوٹا اور بڑا پنجرہ	233
31	اجو بوا	235
32	دو معبد	245
33	Death of Old Brainia	251
34	کرہ ارض ریفارم ٹینڈر	257
35	تسبیح	263
36	مزدور لوگ	267
37	ایک انسان جو ہنس سکتا تھا	273
38	زمین و آسمان کی فریاد	277
39	آبِ حیات	281
40	جدیدیت	295
41	Transi & Boizay	301
42	ریس کا آخری کھلاڑی	309

ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

بیدار تخیل!

انسان اپنے تخیل کی مدد سے ہزاروں سال سے بے شمار قصے، کہانیاں، ایجادات، فن پارے اور شاعری وغیرہ تخلیق کرتا چلا آیا ہے اور تاحال یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ انسانی ذہن بھلے ہی وہ کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو تخیل کی طاقت پر ضرور یقین رکھتا ہے۔ دنیائے ادب ہو یا سائنس و ٹیکنالوجی یا کوئی بھی اور شعبۂ زندگی، ہر تخلیق ہر ایجاد کی ابتدا بہر حال خیال ہی کی مرہونِ منت ہے۔

کون سا ایسا لمحہ اور ایسا کیا ماحول انسان کو میسر ہوتا ہے جب انسان ایسی قلبی یا ذہنی واردات سے گزرتا ہے جس سے گزرنے کے بعد انسان جن میں آرٹسٹ، فن کار، کہانی کار، سائنس دان سب تخلیق کار شامل ہیں، ایسا آرٹ، ایسی تھیوری تخلیق کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جو رہتی دنیا تک امر ہو جاتی ہے۔

کچھ محققین اچانک نئے خیال کو القا یا وجدان سے تعبیر کرتے ہیں مگر بظاہر عقلی اعتبار سے اگر سوچا جائے تو ہم کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں کہ انسانی ذہن جس خطِ فکر پر مسلسل سوچتا ہے اسے ویسے ہی خیالات آنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی عقلی گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں تواتر سے مشغول رہیں تو عین ممکن ہے جب ہمارا ذہن اس سے ہٹ کر کچھ سوچنے کی طرف مائل ہو، اس وقت اچانک ذہن میں چھپاک سے وہ سارا معاملہ حل ہو جائے جس پر ہم

کئی گھنٹے سوچتے رہے ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بظاہر اس کی کوئی واضح وجہ ہم انسان نہیں جانتے۔ ممکن ہے انسان کا ذہن اپنے فوکس کا تابع ہو جس طرف ہم یک سوئی سے اپنا پورا فوکس، اپنی پوری توجہ لگاتے ہیں، ہمیں وہی چیزیں وہی خیالات تواتر سے آنے لگتے ہیں۔ ہر آرٹ اور ہر ایجاد کے پیچھے بھی یہی فوکس، یہی یک سوئی اور توجہ کی طاقت کار فرما ہے۔

فائن آرٹ یا فنون لطیفہ کی تمام صورتیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں مگر جہاں تک قصہ، داستان یا کہانی کا تعلق ہے یہ اس لحاظ سے اپنی جگہ اہم ہے کہ انسانی ذہن کی یادداشت کا اہم حصہ اور اس کے تمام پیٹرن کہانی کے ساتھ جڑے ہیں۔ ہم اگر کوئی بھی لفظ سنیں تو فوراً ہمارا دماغ اس لفظ سے جڑی یاد کے پیٹرن میں داخل ہو جاتا ہے اور ذہن میں فوراً اس لفظ سے جڑے کسی واقعے یا کہانی کا تصویری نقشہ ذہن کے پردے پر چلنے لگتا ہے۔ ہماری ہر یادداشت دراصل ایک تصویری کہانی کی طرح ہے جو ہمارے ذہن کے ایک حصے میں، جسے ویڈیو ریکارڈر کہا جا سکتا ہے، ہر لمحے محفوظ ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ انسانی ذہن دراصل تصویری کہانی ریکارڈ کرنے کی ایک ویڈیو ریکارڈنگ مشین کی طرح ہے جس میں مختلف کہانیاں ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہو کر ایک دوسرے کے اوپر ڈیجیٹل فائلز کی طرح دماغ کے ایک خاص مقام پر پھنسی پڑی ہیں۔ ادھر ہم کوئی لفظ، کوئی جملہ، کوئی آواز سنتے ہیں یا کوئی مانوس خوشبو، کوئی منظر، یا پھر کسی لمس کا احساس ہوتا ہے، فوراً ہی اس سے قریب ترین ایک کہانی ہمارے ذہن کے پردے پر چلنے لگتی ہے۔ یوں تو انسان کا ذہن تخیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ ہمیں صرف ایک تحریک ایک کلک درکار ہوتا ہے جس کی مدد سے ہمارا ذہن اس اعلیٰ ترین ذہنی واردات سے گزرتا ہے جس سے گزرنے کے بعد ہم میں سے کچھ انسان ایک نیا آرٹ، ایک نئی ایجاد، ایک نئی تھیوری، ایک نئی کہانی تخلیق کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

علم نفسیات کی بات کریں تو اس میں انسان کے تخلیقی جوہر اور انسان کے اعلیٰ ترین ذہنی و قلبی واردات کے محرک جاننے پر بہت سا کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ تقریباً تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی ہر تخلیق کی ابتدا اور انتہا کے بیچ کسی حد تک کہانی

بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔

بقول شاعر:

واقعہ کوئی بھی ہو، ہو گا کہانی ایک دن
ہر کہانی اک نہ اک دن واقعہ ہو جائے گی

ان معنوں میں اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ہر تخلیق کہانی کی مرہونِ منت ہے اور؛

ہر ایجاد کہانی کے بیج سے نمودار ہوتی ہے!

کہانی کار خدا کا پرتو ہیں۔

بغیر کہانی کے دنیا تمام ایجادات سے خالی اجاڑ اور بیابان مقام ہوتی۔

جوں جوں کہانیاں بڑھیں گی انسان کی اوسط عمر بڑھے گی۔

ایک اچھی کہانی دائمی امن وسکون و محبت کے پرچار کا کام کر سکتی ہے۔

سب دیوتا کہانی کار تھے۔

کہانی ہی آب حیات ہے اور کہانی ہی میں اسم اعظم پوشیدہ ہے، کہانی پارس کا کام کرتی ہے۔

راز حیات کہانیوں میں ہی پوشیدہ ہے۔

فکشن نگاری ہی علم کا نچوڑ ہے۔

دوسری طرف اس میں بھی شک نہیں کہ

کہانی کار تباہی اور امن دونوں لانے پر قدرت رکھتے ہیں۔

کہانیاں مستقبل کی پیش گویاں ہیں۔

کہانیاں ماضی کے سربستہ راز ہیں، کہانیاں حال کی سچائیاں ہیں۔

کہانی کبھی صرف سچی یا صرف جھوٹی نہیں ہوتی کہانی صرف کہانی ہوتی ہے۔ جیسا میں نے کہا:

انسانی دماغ کہانی بنانے کی مشین ہے۔

انسان اور کہانی لازم و ملزوم ہیں۔

بغیر کہانی کے سچ اور جھوٹ دونوں دم توڑ دیتے ہیں۔

سورج زمین کے گرد چکر لگاتا تھا یا آج زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، دونوں خیالات دو مختلف کہانیوں سے مستعار ہیں۔

ارتقاء انسانی اور وسعتِ ذہن انسانی سب کہانی کے مرہونِ منت ہیں۔

مستقبل کا خاکہ کہانی کار اس وقت لکھ رہے ہیں۔ صرف کہانی ہی ہے جو ایک ہی وقت میں مستقبل حال اور ماضی تینوں زمانوں کا یک مشت احاطہ کر سکتی ہے۔

ہر اگلے پل، ہر اگلے گھنٹے، ہر اگلے دن، ہر اگلی رات، ہر اگلے ہفتے، ہر اگلے مہینے، ہر اگلے سال، ہر اگلی صدی کا ذکر کہانی میں موجود ہے۔

روبوٹ، راکٹ، میزائیل، ڈرون، سیٹلائیٹ، موٹر کار، جہاز سب کہانی کی تکمیل ہیں۔ غم، محبت، ایثار، قربانی، دکھ، درد، صبر، ہر جذبہ، ہر شے حتیٰ کہ ہم انسان بھی کہانی ہی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان معنوں میں ہر ایجاد کہانی کی اولاد ہے۔

"دو رنگا" کی کہانیاں، میری دوسری کوشش ہے۔ گذشتہ سال "سیارگی" کے نام سے میری مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس میں زیادہ تر کہانیوں میں عالمی حدت میں مسلسل اضافے کے بعد پیدا ہونے والی موسمیاتی تبدیلیاں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو میں نے اپنی کہانیوں کا اوّلین موضوع بنایا تھا اور اِس کتاب کی اکثر کہانیوں کا محور و مرکز بھی اسی مدعا کو لے کر قارئین میں بیداری پیدا کرنا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں اور بے شمار مسائل نسل انسانی کو درپیش ہوں گے مگر ان سب میں میری نظر میں سب سے بڑا مسئلہ جو آج پوری نسل انسانی کے سامنے کھڑا ہے اور جو ہمارے ساتھ ساتھ اس کرہ زمین کی بقا سے بھی وابستہ ہے، وہ موسمیاتی تبدیلیوں کے بعد پیدا ہونے والا عالمی مسئلہ ہے۔ عالمی حدت کے مسلسل اضافے کے بعد پیدا ہونے والی

نا قابلِ یقین حد تک خطرناک صورت حال جس کا آج کے تمام ممالک اور ان میں بسنے والے انسانوں کو بلا رنگ و ملت کی تفریق کے سامنا ہے، ایک انتہائی اہم معاملہ ہے، جس پر جتنی بھی بات کی جائے کم ہے۔

یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جس سے آج کا انسان وقتی طور پر نظریں چرا تو سکتا ہے، اور گزشتہ ایک صدی میں مسلسل چراتا بھی رہا، مگر اب اس خطرے سے مستقل جان چھڑانا دنیا کے کسی بھی امیر اور غریب ملک اور اس کے باسیوں کے لیے کسی طور بھی ممکن نہیں۔ اگر آج کا انسان دور اندیشی کا مظاہرہ کرے اور اس مسئلے کی سنگینی کا باریک بینی سے صحیح اور درست اندازہ لگانے کے قابل ہو تو ہمیں صاف دکھائی دے گا کہ کرہ ارض کی موجودہ صورتِ حال روز بروز تنزلی کا شکار ہے۔ آج ہمیں درپیش تمام مسائل اسی ایک مسئلے کے ساتھ جڑے نظر آتے ہیں۔ دنیا میں حالیہ وبا کے اچانک پھوٹ پڑنے تک کے تانے بانے بھی براہ راست نہ سہی، کہیں نہ کہیں اسی موسمی تبدیلیوں کے مسئلے کے ساتھ ہی جڑے ہیں۔ ممالک کی آپس کی تجارتی جنگیں ہوں یا علاقائی چپقلشیں، بھوک، خوراک کی کمی، روزگار، توانائی کے بحران ہوں یا اقتصادی یا شدت پسندی سے نمٹنے کا مسئلہ، کہیں نہ کہیں یہ تمام بحران اس اہم مسئلے کے ساتھ جڑے ہیں۔

اس مسئلے کو شاید اس مثال سے کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔

کچھ دیر اگر ہم اپنے اس چھوٹے گول سیارے جسے ہم آپ دنیا یا کرہ ارض بھی کہتے ہیں، کی مثال ایک ایسے کرائے کے چھوٹے گھر جیسی لیں جہاں کرائے دار آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں گھر کے رہائشی گھر کی صفائی ستھرائی ٹھیک طریقے سے نہ کریں تو گھر میں جا بجا جالے لگ سکتے ہیں، کھڑکیاں گرد سے اٹ کر میلی ہو سکتی ہیں، کبھی کبھار اتنی کہ بسا اوقات باہر نظر آنا ہی بند ہو جاتا ہے۔ کرائے دار اگر گھر میں سامان زیادہ گھسا لیں تو گھر رہنے کے لیے چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ رہنے والوں کی تعداد کمروں سے بڑھ جائے تو گھر میں ہر قسم کی سہولت کی گنجائش کم پڑ سکتی ہے۔ ظاہر ہے سب گھر کو استعمال کرنے والے کرائے دار پر

منحصر ہے کہ وہ گھر کو سلیقے سے استعمال کرتا ہے یا نہیں۔ اگر کرائے دار گھر میں سگریٹ پھونکتا ہے تو ممکن ہے در و دیوار اتنے پیلے پڑ جائیں کہ نیا وال پیپر ڈالنا پڑے۔

اس صورت حال میں یا تو ایسا حل نکالا جائے کہ کچھ عرصہ سگریٹ پر ہی پابندی لگائی جائے یا دھوئیں کا مناسب سد باب کیا جائے تا کہ گھر کی اندرونی آب و ہوا صاف اور تر و تازہ رہے۔

سوچیں، اگر کرائے دار غسل خانے کے ٹب میں پانی بھر کر کچھ ماہ بھول جاتا ہے اور کبھی غسل خانے کی صفائی ہی نہیں کرتا تو غسل خانے کے سب پائپ کچھ عرصے بعد یقینی طور پر ناکارہ ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم گزشتہ ایک صدی پہلے کرہ ارض کے کرائے داروں کی بات کریں تو پرانے زمانوں میں کرائے دار یہ نہیں کہ آج کی نسبت زیادہ سلیقہ شعار اور زیادہ صفائی پسند ہوا کرتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت کنبہ چھوٹا ہوتا تھا اور خواہشات کم۔ اور رہائشی بھی اس دنیا کے کرائے کے گھر میں زیادہ سال قیام نہیں کرتے تھے اور لوگ یہ عارضی گھر چھوڑ کر کم عمری میں ہی زیرِ زمین شفٹ ہو جاتے تھے یا دریا برد۔ مگر آج صورتِ حال ماضی سے مختلف ہے، اوسط عمر ہر گزرتے دن بڑھ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس گول گھر کی آبادی آج آٹھ ارب کے لگ بھگ ہو چکی ہے جو ہر گزرتے سال اور بڑھ رہی ہے۔ مگر پچھلی آٹھ دس دہائیوں میں کرہ ارض کے وسائل کا جس طرح انسانوں نے استعمال کیا بلکہ استحصال کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا، دیکھتے ہی دیکھتے ایک صدی میں دنیا کا بڑا حصہ کاٹھ کباڑ چیزوں سے بھر گیا۔ سمندر کوڑے دان بنتے چلے گئے، کنکریٹ کے جنگل بڑھتے چلے گئے، دریا سوکھتے چلے گئے، اصل جنگل کٹتے کٹتے بیابان میدان بنتے چلے گئے۔ سمندری حیات سمندروں میں پلاسٹک اور فضلہ کھانے پر مجبور ہوتی چلی گئی۔ انسانوں نے ان مسائل کو وقتی بھلانے کے لیے گزشتہ صدی میں نئے سے نئے نشے ایجاد کر لیے تا کہ لوگ ان وقتی الیکٹرانک اور نظریاتی مذہبی نشوں میں مدہوش ہو کر اپنے ارد گرد پھیلی اس آلودگی اور اپنی طرف بڑھتی موسمیاتی تبدیلیوں سے نظریں چرانے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس نیم بے ہوش انسانی ادوار میں

دھواں اتنا بڑھتا رہا کہ آسمان سیاہ دبیز دھویں کی چادر سے بھر گیا۔ نیلے اور سبز پانیوں کے سمندروں کا رنگ روزانہ سمندر میں انڈیلے گئے پلاسٹک کچرے سے گدلا ہوتا چلا گیا مگر انسان اپنے وقتی نشوں میں دھت اپنی ظاہری دنیا میں مگن چیزوں میں گم رہے۔ مگر گزشتہ چند سالوں سے جب عالمی حدت میں اضافے کے باعث ان بچے کھچے جنگلوں میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے جو انسانوں کے عالی شان گھروں تک بھی پہنچ گئے، کچھ جگہ اَن دیکھے اَن سنے سیلاب تباہی مچانے لگے اور کہیں طوفانوں نے پر شکوہ شہروں میں اونچی اونچی عمارتوں میں بھی تباہی مچانی شروع کی اور کچھ دھویں کی دبیز چادر میں لپٹے آلودہ اونچی عمارتوں والے شہروں میں بسنے والے شہریوں کے باسی اسی دھویں سے کینسر اور پھیپھڑوں کی بیماریوں کا شکار ہونے لگے اور پھر آج ہم نے دیکھا جب وباؤں نے بغیر کسی رنگ، نسل اور امیر غریب ملک کی تمیز کے انسانوں کو سینوں سے پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کیا تو آج کے انسان کی عقل ذرا ٹھکانے لگی اور اس چھوٹے سے سیارے کے باسیوں کے چودہ طبق بھی روشن ہوئے اور انسان گہری نیند سے ذرا جاگے۔ آج گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ انسانی میں پہلی بار سب ممالک سر جوڑے اس خطرے کو سنجیدگی سے دیکھنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔

آج ہم دیکھتے ہیں دنیا بھر میں نئے قوانین بنائے جا رہے ہیں، جنگلات کو کاٹنے کی بجائے جنگلات لگانے پر توجہ دی جا رہی ہے۔ میں جس ملک میں رہائش پذیر ہوں وہاں کی موٹر کار بنانے کی کمپنیز نے گاڑیوں میں پلاسٹک کے استعمال کو کم سے کم درجہ پر کرنے کی شروعات کر دی ہے۔ پلاسٹک بیگ کے استعمال کی پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ ہر نئی چیز کو بنانے سے پہلے اس کو ری سائیکل کیسے کیا جائے گا، اس پر پہلے سے زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ فوسل تیل سے چلنے والی گاڑیاں مکمل ختم کر کے موٹر کار کمپنیاں اگلے دس سال میں صرف ریچارج ایبل بیٹری سے چلنے والی گاڑیوں کے ہدف کو حاصل کرنے کی طرف گامزن ہیں۔ ہر نئے گھر کی بجلی صرف سولر پینل کے ذریعے حاصل کی جائے گی۔ کچھ دور اندیش یورپی ممالک تو ان تمام اہداف کو کامیابی سے حاصل بھی کر چکے مگر اب بھی بہت سے ایسے انسان ہمارے ارد گرد

موجود ہیں جو وقتی فائدے کے لیے ان تمام مثبت تبدیلیوں کو وقت کا ضیاع سمجھ کر کرہ زمین کو باقی نظامِ شمسی کے سیاروں کی طرح دوزخ بنانے کی طرف لے جانے کی ضد کا شکار ہیں۔

میری یہ کتاب ایسے ہی کرہ زمین کے دشمن لوگوں کے لیے ایک بیداری کا پیغام ہے۔ میری خواہش ہے کہ قارئین اس مثبت پیغام کو ہر شخص کو پہنچائیں خاص طور پر ان لوگوں تک جو موسمیاتی تبدیلیوں سے بے خبر دنیاوی نشوں کا شکار ہو کر جیتے جی سو رہے ہیں۔

آپ سب کا خیر خواہ

سلمان بخاری

کاناگاوا کین

جاپان

+819088939855

salmanbukhari22@gmail.com

دورنگا!

بانجھی کو سیاہ رنگت کے بچے بہت پسند تھے لیکن کھاسیہ چاہتا تھا کہ وہ سفید، بھوری اور نیلی آنکھوں والا بچہ خریدے۔ دونوں جب سے اکٹھے رہنا شروع ہوئے تھے، اسی بات کو لے کر اکثر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے کہ کون سے رنگ کا بچہ وہ خریدیں۔

ملکی قانون کے مطابق وہ کلوننگ لیب سے ایک بچہ اپنی پسند کے رنگ، شکل اور عادات واطوار کا خرید سکتے تھے۔

یہ سب بچے آرڈر پر کلوننگ لیب میں تیار کیے جاتے تھے۔ جن لوگوں کو لڑکیاں پسند تھیں انھیں ان کی پسند کے رنگوں، مزاجوں، شکلوں کی ننھی بچیاں معینہ مدت میں کلون لیبارٹری میں تیار کر کے دے دی جاتی تھیں مگر ان تمام بچیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی بچہ دانیاں نکال دی جاتی تھیں اور لڑکوں کے فوطے بھی پیدا ہوتے ہی نکال لیے جاتے تھے۔ بانجھی کی ہمسائی جب سے ایک تابع فرماں سیاہ خوبصورت بچہ خرید کے لائی تھی اس کا دل بھی کرتا تھا کہ وہ بھی اس سے ملتی جلتی سیاہ رنگت کا لڑکا آرڈر پر تیار کروائے مگر کھاسیہ کسی طور بھی کالی رنگت کے بچوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا ان کا ماس ہر وقت میلا دکھائی دیتا ہے جس پر کوئی صابن، شیمپو، کریم، برش اثر نہیں کرتا اور جسم میلے کا میلا ہی رہتا ہے۔ اسے نیلی آنکھوں والی، سنہرے بالوں والی پری جیسی شکل کی سفید بچی چاہیے تھی جس سے وہ جب

چاہے بنا کسی جھجک کے کھیل کود کرے، اسے گود میں اٹھائے، اس کے گال پر پیار سے بوسہ دے تو اس کے ہاتھوں اور جسم پر میل یا کالا رنگ لگنے کا امکان نہ ہو۔

مگر بانجھی بضد تھی کہ اسے چمکتی جلد کا سیاہ رنگت کا پیارا بچہ ہی چاہیے۔

اس روز جب کھاسیہ کام سے گھر واپس لوٹا تو بانجھی نے پھر وہی موضوع چھیڑ دیا۔

بانجھی ناراض لہجے میں منانے کے انداز میں کھاسیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی،

"کھاسیہ او میرے پیارے کھاسیہ، تم کیوں کالی رنگت سے ڈرتے ہو، کیوں ضد کرتے ہو؟ میرا دل رکھنے کے لیے میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔ دیکھو ہمارے پاس ایک ہی بچہ خریدنے کا اجازت نامہ ہے، ہم دونوں خود اولاد پیدا نہیں کر سکتے تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔ تم میری خاطر سیاہ رنگ کا بچہ کیوں نہیں رکھ سکتے؟ میں وعدہ کرتی ہوں، میں اسے ہر روز نہلاؤں دھلاؤں گی، ہر روز اس کی صفائی ستھرائی کا خیال بھی رکھوں گی، اسے ہمیشہ خوشبو میں نہلایا ہوا رکھوں گی۔۔۔ تم میری خاطر ہاں کہہ دو نا میرے اچھے کھاسیہ۔۔۔"

بانجھی نے جذبات میں ڈوب کر کھاسیہ کو قائل کرنے کے لیے استدعا کی۔

"مگر کالی رنگت کے بچے سے کوئی آخر کتنے دن پیار کر سکتا ہے؟ تم خود عقل سے کام لو بانجھی!"

کھاسیہ نے ماتھے پر خارش کرتے ہوئے بانجھی کی طرف دیکھ کر افسردگی سے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟ وہ ہماری اولاد ہو گی تو کیا ہم اس سے پیار نہیں کریں گے؟ تم ایسا سوچ بھی کیسے لیتے ہو کھاسیہ۔"

بانجھی نے مایوس لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟!"

"تم خود سوچو، کچھ دن تو چلو میں اس سے کھیل کود کر لوں گا، پیار پچکار بھی لوں گا۔ اس کے بعد ہاتھ بھی مل مل کر دھو لوں گا مگر لمبے عرصے کے لیے یہ ممکن نہیں ہو گا میرے لیے۔"

کھاسیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"اچھا، اگر میں اس کی آنکھیں نیلی یا بھوری رکھوادوں تو تو تمھیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا نہ کھاسیہ؟"

"کالا رنگ اور آنکھیں نیلی۔۔۔! تم ہوش میں تو ہو؟"

کھاسیہ نے استہزائیہ لہجے میں بانجھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"بہت ہی عجیب لگے گا اس طرح کا بچہ۔"

"اچھا اگر مکمل سیاہ کی بجائے سانولا رنگ ہو تو تمھیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا کھاسیہ؟"

بانجھی نے کھاسیہ کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی۔

"ہم۔۔۔ مگر۔۔ سانولا بھی تو سیاہ رنگ ہی ہوتا ہے بس ذرا سا نظر کا دھوکہ ہی ہوتا ہے۔ بس!"

"اچھا، چلو میرے ساتھ۔ ہم متعلقہ کلوننگ لیبارٹری کے دفتر چلتے ہیں۔ وہاں ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا ممکنہ آپشنز ہیں اور کیا نہیں۔"

بانجھی نے کھاسیہ کا موڈ بدلنے کے لیے اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

دونوں اپنی ہوائی موٹر پر بیٹھے اور دو منٹ میں اس کلوننگ لیبارٹری کی چھت پر لینڈ ہوئے، جہاں آرڈر پر من پسند رنگ، شکل اور اطوار کے معیاری بچے مناسب قیمت میں تیار کیے جاتے تھے۔

بانجھی سیدھی اس کاؤنٹر پر پہنچی جہاں بہت سے بروشرز پڑے تھے جہاں تفصیلات اور ہر طرح کی رنگت کے سیمپل مع بچوں کی تصاویر بھی تھیں اور ان کے اوصاف بھی لکھے تھے۔ وہیں ایک بروشر پر بانجھی کی نگاہ پڑی جس پر ایک نئے ماڈل کے ڈیزائنر بچے کی تفصیلات درج تھیں، جنھیں پڑھ کر بانجھی دنگ رہ گئی۔ ان دونوں کی مشکل کا حل اس نئے طرز کے ماڈل بچوں میں موجود تھا۔

نئے ماڈل کے بچوں کے کان کے پاس ایک رنگت سیٹ کرنے کا سوئچ لگایا گیا تھا جس کے بعد ماں باپ بچے کی رنگت سیاہ سے سفید کے درمیان کہیں بھی سیٹ کر سکتے تھے۔

آنکھوں کی رنگت کے سوئچ کی آپشن بھی اضافی خرچ ادا کرنے پر لگوائی جا سکتی تھی۔ ریموٹ بھی خریدا جا سکتا تھا۔

بانجھی نے کھاسیہ کو وہ بروشر دکھایا تو وہ بھی بہت حیران ہوا۔

وہ دونوں خوش تھے کہ آخر ان کے مسئلے کا حل نکل ہی آیا۔ وہ عملے پر موجود روبوٹ کی ٹیبل پر پہنچے اور اسے وہ بروشر دکھایا کہ انھیں اس ماڈل کا ایک بچہ آرڈر پر تیار کروانا ہے۔ کھاسیہ نے فوراً کہا۔ ''بچہ گول مٹول ہو، بال گھنگریالے نہ ہوں۔ آنکھوں کی آپشن نیلی، کالی، بھوری اور سرمئی ہو۔ اپنی پسند کی رنگت بدلنے کی آپشن ضرور ہو۔''

عملے پر موجود روبوٹ نے انھیں سنجیدہ لہجے میں بتایا کہ معذرت چاہتا ہوں یہ بچے مستقبل قریب میں یہاں تیار ہوں گے۔ فی الحال ان کے پاس جو جدید ترین ماڈلز کے بچے یہاں تیار ہوتے ہیں، ان کی رنگت تبدیل کروانے کے لیے بچے کو دو سے تین دن تک ان کے پاس کلوننگ لیب میں چھوڑنا ہو گا جس دوران وہ اس کی پرانی کھال اتار کر نئی رنگت کی کھال جو بھی آپ کی فیملی چنے گی، وہ چڑھا دی جائے گی جس کی قیمت تیس بٹ کواین کے لگ بھگ ہو گی۔ آنکھوں کے کورنیا/ڈیلوں کی تبدیلی کے نرخ اس طرح ہیں؛ نیلے کورنیا ڈیلے دس بٹ کواین، بھورے سات اور سیاہ ایک بٹ کواین میں تبدیل کر کے دیے جا سکتے ہیں۔ کورنیا ڈیلوں کی تبدیلی کے لیے صرف ایک گھنٹے کا وقت لگے گا۔ ساڑھے چار سے ساڑھے پانچ فٹ تک قد نکالنے والے سیاہ رنگت کے لاپروا، اکھڑ بچے بچیوں کی قیمت ایک سو تیس بٹ کواین، سانولے، گورے، سیاہ، گندمی، خر دماغ، شدت پسند، جسمانی کمزور اور فربہ بچوں کی قیمت ایک سو ستتر بٹ کواین۔ چھ فٹ سے اوپر قد نکالنے والے گورے، مہذب، تہذیب یافتہ، ذہین، ریشنل، سیکولر لڑکوں کی قیمت چار ہزار بٹ کواین ہے۔ غیر تہذیب یافتہ، نکھٹو، جھگڑالو، نسل و قوم پرست سفید بچہ ساڑھے تین ہزار بٹ کواین کے آس پاس ہم کلون کر دیں

گے۔"

روبوٹ کی بتائی ہوئی اقسام سن کر کھاسیہ نے شرما کر اپنی بغلیں جھانکنی شروع کر دیں۔ بانجھی کے لیے بھی اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ وہ کھاسیہ کے کان کے پاس ہولے سے بولی: ''کھاسیہ میرا خیال ہے، تمھارے والدین نے یہی آپشن چنی تھی۔"

سن کر غصے سے کھاسیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

روبوٹ نے کھاسیہ کے چہرے کے بدلتے تاثرات بھانپ لیے، اس نے بات کو نپٹانے کے لیے لمبی سانس کھینچ کر آخر میں کہا۔

"میں آپ کو بتا تا چلوں، دوسری کلون لیبارٹریز کی نسبت ہمارے نرخ انتہائی مناسب ہیں۔"

"اور اگر لڑکے کی بجائے ہمیں لڑکی چاہیے تو اس کے کیا نرخ ہوں گے؟"

کھاسیہ نے ہزیمت بھلاتے ہوئے سیلز مین روبوٹ سے نیا سوال پوچھا۔

"لڑکیوں کی قیمتیں ان کے لب ولہجہ، ذہنی استعداد، جسم و رنگ کی ساخت، کولہے کی ہڈیوں کی چوڑائی اور سینے کی چربی کے حساب سے متعین کی جاتی ہے۔ یہ نرخ کیس بائی کیس فی زمانہ فیشن کے حساب سے اوپر نیچے ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کو کس قسم کی لڑکی چاہیے، پہلے آپ وہ طے کر لیں۔"

کھاسیہ نے بانجھی کے کان کے پاس جا کر کہا۔ "کاش تمھارے والدین اس وقت دو چار بٹ کوائن زیادہ خرچ کر دیتے تو تمھارے بھی کٹس اچھے نکل آتے۔"

بانجھی نے اپنی کہنی زور سے کھاسیہ کی بغل میں گھسائی۔ کھاسیہ کی مسکراہٹ فوراً سنجیدگی میں بدل گئی۔

روبوٹ نے دونوں کو مخبوط الحواس حالت میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مشورہ ہے، اگر آپ کا بجٹ کم ہے تو آپ لوگ ایک کالا گھنگریالے بالوں والا سستا شرارتی لڑکا ہی خرید لیں۔ وہ میں آپ کو مفت کے بھاؤ میں تیار کر کے دے سکتا ہوں۔

چھ سات سال بعد اگر آپ نے رنگت بدلوانی ہو اور پرانا ماس کھینچ کر سفید چم چماتا دودھیا ماس چڑھوانا ہو تو ہم سیاہ رنگ کے بچہ کو مناسب قیمت میں ریفارم کر دیں گے۔ اس طرح مجموعی طور پر پیدائشی سفید رنگت کا بچہ اب بنوانے کی نسبت آپ کو سفید، نیلی آنکھوں والا بچہ چھ سات سال بعد پرانی استعمال شدہ چمڑی کے ریفارم کے ساتھ کافی سستے میں پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس بسا اوقات رامیٹریل میں سفید ماس ری سائیکل کے لیے آتا رہتا ہے۔ نئی سفید چمڑی کی نسبت وہ سستے میں پڑتا ہے۔ البتہ چہرے کا سفید ماس نایاب ہوتا ہے اور اس کی مانگ بھی زیادہ ہے۔ جسم کا سفید پرانا ڈھلکا ماس پھر بھی اکادکاری سائیکل کے لیے آجاتا ہے۔"

روبوٹ نے ساری تفصیلات جزیات سمیت بانجھی اور کھاسیہ کے گوش گزار کیں۔

دونوں سوچ میں پڑ گئے کہ انھیں اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیے۔ کچھ دیر مشاورت کے بعد دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ ایسا بچہ آرڈر پر بنوالیں جس کا صرف منہ سیاہ ہو، باقی جسم کی چمڑی سفید ہو۔ کیونکہ کھاسیہ کے پاس جتنے بٹ کواین تھے ان میں پورا سفید دودھیا ماس والا بچہ وہ خرید نہیں سکتا تھا اور بانجھی کے سر پر ویسے بھی سیاہ رنگت کا بچہ خریدنے کا بھوت سوار تھا۔

اس صورت میں دونوں کا کام ہو سکتا تھا۔

کھاسیہ نے سوچا، کچھ عرصے بعد جب اس کی مالی پوزیشن مضبوط ہو گی، وہ بچے کے سیاہ چہرے کا ماس سفید دودھیا اپنے جیسے ماس میں بدلوالے گا۔"

ان دونوں نے اپنے اکلوتے بچے کا آرڈر دیا اور اپنا ڈی این اے اور باقی جسم کے نمونے بھی۔

چھ ماہ بعد ان کی پہلی اولاد انھیں ملنے والی تھی، وہ دونوں اندر سے بہت خوش تھے کہ دونوں کی پہلی اولاد اس کلوننگ لیب میں پروان چڑھ رہی ہے۔ وہ ہر ماہ انکیوبیٹر میں اپنے کلون بچے کو دیکھنے لیب جاتے۔ بچے کا دل انھیں شیشے کے پیچھے دھک دھک کرتا صاف سنائی

دیتا اور بچہ بھی تیاری کے مراحل طے کرتا دکھائی دیتا۔

بچہ جس کا چہرہ چمکتا سیاہ تھا اور جسم دودھ کی طرح سفید۔ بانجھی جب بھی کلوننگ لیب کے انکیوبیٹر کے پاس جاتی وہ ہمیشہ اپنے لخت جگر کے چہرے کو تکا کرتی اور کھاسیہ اس کے دودھیا جسم کو تکا کرتا۔ اسے اپنے بیٹے کے ہاتھ پاؤں بالکل اپنے جیسے لگتے تھے۔

وقت کا پتا ہی نہیں لگا۔ چھ ماہ جلد ہی گزر گئے۔ بانجھی اور کھاسیہ دونوں اپنا آرڈر وصول کرنے کے لیے اس روز کلون لیبارٹری پہنچے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد اوئیں اوئیں کر کے روتا چمکتے سیاہ منہ اور دودھیہ سفید جسم کا پیارا گول مٹول ڈبہ شیر خوار بچہ وہاں موجود روبوٹ نرس نے بانجھی کی گود میں اچانک لا کر رکھ دیا۔ جونہی بچہ بانجھی کی گود میں آیا بانجھی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔ پاس کھڑے کھاسیہ نے بچے کے گورے گورے چھوٹے چھوٹے پاؤں کا بوسہ لیا۔ بچہ اپنے پاؤں کے دونوں انگوٹھے باہر کی جانب اٹھائے ہوئے مسلسل ہلا رہا تھا۔

بانجھی نے کھاسیہ کی طرف ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا اور بولی۔ "کیا خیال ہے ہمارے بیٹے کا نام دور نگا کیسا رہے گا؟"

"میرے لعل کا نام دور نگا ہو گا دور نگا۔"

بانجھی بچے کو دیکھ دیکھ کر دور نگا دہرانے لگی۔

"دور نگا۔۔؟"

"ہم۔۔"

"ہاں نام تو اچھا ہے۔"

کھاسیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہمارے بیٹے کا نام دور نگا ہو گیا آج سے۔"

"دور نگا۔"

"میرا بیٹا!"

کھاسیہ نے خوشی سے ہنستے ہوئے اعلان کیا۔

دور نگا بچپن سے ہی تھوڑا شرارتی واقع ہوا تھا۔ جونہی باپ گود میں اٹھاتا فوراً پیشاب کر دیتا۔

وقت گزر رہا تھا۔ دور نگا آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں نکال رہا تھا۔ اس کا دودھ جیسا سفید بے داغ بدن اس کے باپ کو بہت اچھا لگتا تھا۔

لیکن کھاسیہ کبھی دور نگا کے چہرے کی طرف نظر نہ کرتا۔ نو عمر دور نگا ہمیشہ باپ کی تھوڑی زبردستی ہاتھ سے اپنے چہرے کی طرف کرتا مگر کھاسیہ کبھی اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتا تو کبھی بازو پر مگر کبھی اس کے چہرے پر نگاہ نہ ڈالتا۔

جبکہ بانجھی اپنے بیٹے کے چہرے کی ہر وقت بلائیں لیتی، اس کے بال بناتی، اسے اچھے کپڑے پہناتی۔

جوں جوں دور نگا بڑا ہو رہا تھا، وہ عجیب عجیب سوالات اپنی ماں سے پوچھتا تھا۔

ایک دن اس نے اپنی ماں سے پوچھا:

"ماں، ابا میرے چہرے کی طرف کیوں نہیں دیکھتے؟ اور میرا چہرہ باقی جسم سے مختلف کیوں ہے؟"

"کیا میں تم دونوں کا بیٹا نہیں ہوں؟ ہمارے ہمسائے میں موجود میرے دوست منہ سیاہ کا تو پورا بدن ایک جیسا ہے، میرا بدن منہ سیاہ جیسا کیوں نہیں ہے ماں؟"

بانجھی بیٹے کے اچانک سوال سے بہت حیران ہوئی اور بولی۔ "میرے بیٹے میرے لعل، تو ہمارا ہی بیٹا ہے۔ بات صرف اتنی ہے مجھے سیاہ رنگ پسند تھا اور تیرے باپ کو سفید، اس لیے ہم نے تیرا چہرہ میری پسند کا اور تیرا بدن تیرے باپ کی پسند کا آرڈر پر تیار کروایا تھا۔ اگر تجھے اچھا نہیں لگتا تو ہم کسی دن تیرا پورا بدن ایک رنگ کے ماس کا کروا دیں گے اور تیرا نام بھی بدل کر یک رنگا رکھ دیں گے۔"

"نہیں ماں مجھے اپنا یہ نام بہت پسند ہے۔ میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ مجھے اپنا آپ

اچھا لگتا ہے ماں اور مجھے اپنے دورنگا ہونے میں کوئی شرم بھی نہیں آتی۔ البتہ ابا کے رویے پے حیرت ضرور ہوتی ہے۔"

اس شام جب دورنگے کا باپ کھاسیہ گھر آیا تو دورنگے نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس کے چہرے کی طرف ایک نظر ضرور دیکھے اور اس کے چہرے پر پیار بھی کرے، مگر کھاسیہ کسی طور بھی دورنگے کے چہرے پر پیار کرنے پر راضی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

دورنگا باپ کے عجیب رویے سے بہت دکھی ہوا۔ اس نے ایک سفید مارکر سے اپنے پورے چہرے پر سفید دھاری دھار رنگ کر لیا اور باپ کے پاس جا پہنچا۔ اس کا باپ اس کے عجیب حلیے کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

"اب تو آپ میرے چہرے کو دیکھ سکتے ہیں نہ ابا؟"

کھاسیہ اس کے چہرے کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں نے غور کیا آج پہلی بار آپ نے میرا چہرہ غور سے دیکھا ابا، صرف اس لیے کہ اس کا رنگ بدل گیا۔"

اپنے نو عمر بیٹے کی بات سن کر کھاسیہ دم بخود رہ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی ندامت کیسے چھپائے۔

دورنگے کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو اس کے سفید رنگ کیے منہ پر دو کالی لکیریں کھینچتے اس کے کالر پر آکر گرے۔

کھاسیہ نے بے اختیار اپنے بیٹے کو گلے لگا لیا اور اس کے دونوں گالوں سے سفید رنگ اتارنے لگا اور پھر زندگی میں پہلی بار کھاسیہ نے اپنے بیٹے کے سیاہ گالوں پر بوسہ دیا۔

اگلے دن کھاسیہ، بانجھی اور دورنگا تینوں کلون لیب پہنچے۔ کھاسیہ نے عملے پر موجود روبوٹ کو اپنے بیٹے کی چہرے کی جلد کی تبدیلی کا آرڈر دیا۔

کچھ دیر بعد روبوٹ نرس آرڈر فارم لیے بوکھلائی ہوئی کھاسیہ اور بانجھی کی طرف بھاگتی آئی اور حیران ہو کر پوچھنے لگی؛

"کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ غلطی نہیں کر رہے؟ کیا واقعی آپ نے اپنے بیٹے کا چہرہ سفید کروانے کی بجائے الٹا اس کی جسم کی جلد سیاہ کروانی ہے؟"

دونوں یک زبان ہو کر بولے:

"جی بالکل، ایسے ہی کرنے کا آرڈر ہم نے دیا ہے۔"

"مگر۔۔"

"ہم۔۔"

"ایسا کیس تو آج تک ہمارے پاس نہیں آیا۔۔!"

روبوٹ نرس نے حیرانی سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور واپس چلی گئی۔

اسی شام دورنگے کے جسم کی سفید کھال کھینچ کر اس پر سیاہ چمک دار چمڑی چڑھا دی گئی۔ کھال کی منتقلی کے آپریشن کے بعد اپنے بیٹے کو دیکھ کر بانجھی اور کھاسیہ خوشی سے چہک رہے تھے۔

نرس نے انھیں سوبٹ کو اپنی سفید کھال عطیہ کرنے پر الٹا ادا کیے اور دورنگا کے کھال کی منتقلی کے آپریشن کا کوئی معاوضہ بھی وصول نہ کیا۔

دونوں باپ بیٹا اور بانجھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے، گردنوں میں بازو ڈالے خوش گپیاں کرتے گھر کی جانب نکل پڑے۔

جنگل میں مشاعرہ

(مرحوم شعرا اکرام سے معذرت کے ساتھ)

کل جنگل میں سیر کو نکلا تو عجب منظر دیکھنے کو ملا، جنگل میں جانوروں کے مشاعرے کی شروعات ہو رہی تھی۔

جانوروں کے عوام الناس زمین پر اور کچھ صاحب کلام شعرا پتھر کے بڑے چبوترے پر سلیقے سے براجمان تھے۔ ہر جانور کے آگے چاندی کے ورقوں میں لپٹے پانوں کے بیڑے دھرے تھے جس میں سے سلیقے سے پان نکال نکال کر کچھ جانور چبا بھی رہے تھے۔ ایک طرف گینڈا تونددی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، دوسری طرف چھچھوندر گول عینک پہنے بیٹھی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں، شاید تازہ آمد ہو رہی تھی۔ کان لگا کر سنا تو:

ہم تم ہوں گے کیڑے ہوں گے
رقص میں سارے پی رہے ہوں گے

گنگنا رہی تھیں۔

اور ہاتھی سونڈوی اپنی سونڈ اوپر اٹھائے آسمان کو تک رہے تھے مگر ساتھ ساتھ پان بھی چبا رہے تھے۔ شاید ان کا کوئی مصرع اٹکا ہوا تھا۔

ایک طرف بندر کھجلوی ہاتھ ہلا ہلا کر گنگناتے ہوئے کوئی غزل پکار رہے تھے، جو آج

کے مشاعرے میں انھیں شاید پڑھنی تھی۔

مجھے اشتیاق ہوا، سنوں کہ جناب بندر کھجلوی آخر کیا گنگنا رہے ہیں۔ اس طرف کان لگایا تو وہ اس شعر کو پڑھ رہے تھے:

ہیں اور بھی دنیا میں جانور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ بندر کا ہے اندازِ بیاں اور

شعر واقعی کمال کا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگا شاید پہلے کہیں سن رکھا ہے۔ میں نے اس خیال کو جھٹکا اور دبک کر ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ سوچا آج کے اس خاص مشاعرے کو سنے بغیر نہیں جانا چاہیے۔ آخر اتنے عالی مرتبت شعرا ایک ساتھ اتنے جم غفیر مجمع کے سامنے کہاں سننے کو ملتے ہیں۔

اچانک میری نظر سٹیج پر عینک کی اوپر سے کن اکھیوں سے چاروں جانب دیکھتی لومڑی عیاروی پر پڑی۔ میں نے غور کیا، وہ قریب بیٹھے مشہور شاعر گدھے دولتوی کے لکھے کلام کی پیچھے سے چھپ چھپ کر نقل کر رہی تھی اور گدھے دولتوی صاحب اپنی دنیا میں گم لگاتار قلم گھستے چلے جا رہے تھے۔ سب سے زیادہ موٹی ڈائری گدھے میاں کی تھی، جسے دیکھ کر کوئی بھی کانا یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس میں سات آٹھ سو غزلیں اور نظمیں تو لازمی ہوں گی۔

میں نے سوچا، کیوں نہ میں بھی لومڑی عیاروی کے پیچھے سے گدھے دولتوی کے ایک دو شعر پڑھ کے دیکھوں۔ محترمہ لومڑی عیاروی نے صرف سامنے نظر رکھی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے لومڑی بی کے پیچھے دبک کے بیٹھ گیا۔ سامنے گدھے کے ایک تازہ لکھے شعر پر نظر پڑی:

آ گدھی مل کے کریں ڈھینچوں زاریاں
تُو ہائے بوجھ پکار میں کھینچوں ریڑھیاں

شعر واقعی بہت برجستہ تھا۔ مجھے بہت ہی پسند آیا مگر اس سے پہلے کہ میں گدھے دولتوی کا اور کلام خاص دیکھ پاتا، لومڑی اپنی نقل مکمل کر چکی تھی اور اپنی ڈائری بند کرنے

لگی تھی۔ میں فوراً قریب پتھر کی اوٹ میں چھپ گیا۔

اتنے میں تھوڑا شور ہوا۔ سامنے دیکھا تو ایک چھوٹی سی ڈائری منہ میں دبائے ایک اٹھارہ فیٹ لمبے ذرافہ میدانوی سٹیج کی طرف خراماں خراماں بڑھ رہے تھے۔ سب شعرا اور معززین نے ذرافہ میدانوی کا اٹھ کر پرتپاک استقبال کیا جسے دیکھ کر مجھے بھی یقین ہو گیا، ہو نہ ہو، حضرت ذرافہ بھی کوئی معمولی شاعر نہیں بلکہ یقیناً صاحب دیوان شاعروں میں سے ایک ہوں گے۔

ذرافے میاں چوکڑی مار کر سٹیج پر بیٹھ گئے اور اپنی چھوٹی سی ڈائری کو سامنے کھول کے ران پر رکھ لیا اور فوراً ہی پان نکال کر ایک تازہ قوام بنانے میں مگن ہو گئے۔

لیکن مشاعرہ ابھی تک شروع کیوں نہیں ہو رہا تھا؟ میں نے دل میں سوچا۔ شاید سب لوگ ابھی کسی بڑے شاعر اعظم یا مہمان خصوصی کا انتظار کر رہے ہوں گے تاکہ مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہو سکے۔ میں ذہن پر زور ڈالنے لگا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ تقریباً بھی معزز شعرا تو یہاں پہلے سے موجود ہیں۔

اسی سوچ میں گم تھا کہ ہاتھی سونڈوی پر نظر پڑی۔ سوچا ہاتھی سونڈوی کے پیچھے چل کر یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ ان کی ڈائری میں کیا ریختہ چھپا ہے۔ میں خاموشی سے رینگ کر چھپتا چھپاتا ہاتھی سونڈوی کے پیچھے پہنچ گیا۔ ہاتھی صاحب سونڈ اٹھائے بہت دیر سے ایک ہی مصرع بار بار دہرا رہے تھے مگر شعر تھا کہ مکمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ دسویں بار وہی مصرع بے سری آواز میں گایا؛

نازکی اس کی سونڈ کی کیا کہیے

مجھ سے رہا نا گیا اور میں نے اپنے سے ملتی جلتی مینڈک کی آواز نکالتے ہوئے اگلا مصرع جوڑ دیا:

گنّے گڑ کی مٹھاس کی سی ہے

ہاتھی سونڈوی نے ایک ہاتھ پے اپنا دوسرا ہاتھ مارا اور سونڈ نیچے کر کے بولے،

"بھئی واہ میاں کیا مصرع لگایا ہے، واہ مینڈک میاں! مگر اب ناز کی کی جگہ چاشنی کرنا بہتر ہو گا۔"

یہ کہہ کر ہاتھی سونڈوی پیچھے دیکھنے لگے، مگر میں تب تک رفو چکر ہو چکا تھا۔

اتنے میں مشاعرے کے منتظم گیدڑ بھگوڑوی صاحب نے اعلان کیا کہ جنابِ صدر عالی جناب شاعرِ اعظم ہرن جنگل آبادی صاحب تشریف لا رہے ہیں، جو تمام شعرا کے استادِ محترم بھی ہیں۔ ہرن جنگل آبادی صاحب اپنی پتلی پتلی ٹانگوں کے ساتھ خراماں خراماں سٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تمام حاضرین اور شعرا و شرکا سب کے سب ان کے ادب میں کھڑے تھے۔ ہرن صاحب کے پیچھے ایک زیبر ادھاروی صاحب بھی اپنی کمر پر ہرن جنگل آبادی کا سارا کلام لادے گلے میں پان دان اور پیٹھ پر پانوں کی دو ڈھولیاں اٹھائے باادب چلے آ رہے تھے۔ زیبر ادھاروی شاید ہرن جنگل آبادی کے اسسٹنٹ بھی تھے۔

ہرن جنگل آبادی آرام سے سٹیج کے بالکل درمیان ایک گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر منہ میں گلوری دبا کر سٹیج پر بیٹھ گئے۔

اتنے میں چیتے خونخواری عرف مکاروی نے، جو جنگل کے وزیرِ اعظم بھی تھے، اعلان کیا کہ بادشاہ سلامت جناب ببر شیر اعظم بھی مشاعرے میں شرکت کے لیے کچھار سے ادھر کے لیے نکل چکے ہیں۔ ان کا حکم ہے کہ ان کی آمد تک مشاعرے کا آغاز نہ کیا جائے۔

کچھ ہی دیر میں بغیر منہ ہاتھ دھوئے بغیر بال بنائے کھچڑی بالوں کے ساتھ بادشاہ شیر اعظم وہاں خون سے تربتر دانتوں کے ساتھ پہنچ گئے۔ شاید تازہ تازہ کسی بھینس کو چیر پھاڑ کر آئے تھے۔ ان کے پیچھے ان کی تین ازواجِ بے پردہ دار شیرنیاں بھی ببر شیر اعظم صاحب سے زیادہ بری حالت میں موجود تھیں۔

ہرن جنگل آبادی نے بادشاہ کے نیم عریاں کنبے کو دیکھ کے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

وہ آئے مشاعرے میں ہمارے! خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم خود کو کبھی ان کے دانتوں کو دیکھتے ہیں

شاعرِ اعظم ہرن جنگل آبادی کا شعر سن کر مشاعرے میں واہ واہ کا ایسا شور اٹھا جو تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ایک شاگرد بکری بار بار مکرر مکرر کی صدائیں بلند کرنے لگی۔

چیتے مکاروی اور لگڑ بگے نے غصے سے سب کو خاموش ہو جانے کو کہا اور کہا کہ بادشاہ سلامت کی اس توہین کی ضرور سزا دے جانی چاہیے۔

ہاتھی سونڈوی نے چنگاڑ کر سب کو خاموش کروا دیا اور بولے، ”خبردار! اگر کسی نے استاد محترم ہرن جنگل آبادی کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا۔“ گینڈے توندوی، زرافے میدانوی، ریچھ بھالوی اور دریائی گھوڑے پانی پوری نے بھی ہاتھی سونڈوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے شیر اعظم کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولے: ”ہم یہاں مشاعرے کی نیت سے آئے ہیں، شکار کے لیے نہیں۔ ہماری کچھار میں سالم بھینس کا گوشت وافر مقدار میں پڑا ہے بلکہ میں آپ سب کو اور جناب ہرن جنگل آبادی کو دعوت دیتا ہوں کہ مشاعرے کے فوراً بعد وہ ہمارے مہمان بنیں اور ہمارے ساتھ طعام کریں۔“ یہ کہہ کر شیر اعظم نے اپنے ساتھ کھڑی شیرنی بڑی بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ایک آنکھ میچ کر انھیں اشارہ دیا جو لومڑی عیاروی کی بیٹی لومڑی چالاک پوری اور میں نے دیکھ لیا۔

لومڑی عیاروی مجھ سے ذرا آگے تھی، خود سے بولی: ’دھت تیرے کی۔ استاد محترم ہرن میاں جنگل آبادی تو آج گئے کام سے۔ آج آخری مشاعرہ ہے ان کا بس۔“

شیر اعظم کی بات سن کر سب جانور بہت خوش ہوئے اور یک زبان ہو کر بولے:

”شیر اعظم بادشاہ سلامت کا اقبال بلند ہو۔“

وزیر اعظم چیتا مکاروی، بادشاہ شیر اور لومڑی عیاروی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

نو وارد شاعرہ محترمہ بکری مینگنی نے سب بھانپ لیا اور ممیا کر یہ فی البدیہہ شعر پڑھا:

ہمیں جو شیر کی دعوت نہ دے سکی چارا
وہ شیر شیر تو ہے روحِ شاعری تو نہیں

اسے سن کر ہرن جنگل آبادی نے بکری کو بلا کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

مگر یہ شعر شیر اعظم اور چیتے مکاروی کے سر کے اوپر سے گزر گیا اور وہ بھی واہ واہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

ریچھ بھالوی جو وہاں بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے، انھوں نے بھی موقع کی مناسبت سے فی البدیہہ شعر پڑھا:

ہم کو معلوم ہے دعوت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو بھالو یہ خیال اچھا ہے

حاضرین اور شعرا نے کھڑے ہو کر ریچھ بھالوی کو داد دی۔

خیر جیسے تیسے مشاعرے کا آغاز ہوا، شمع محفل بندر کھجلوی کے آگے رکھی گئی۔

بندر کھجلوی نے بادشاہ شیر اعظم کی طرف دیکھا اور کان کھجا کر بولے: "حضور اجازت دیں یا نہیں مگر شعر پیش خدمت ہے۔"

سب جانور بادشاہ شیر اعظم کی سبکی پر پھر ہنسنے لگے۔ مگر شیر اعظم دانت پیستے ہوئے غصہ پی گئے۔

بندر کھجلوی نے لومڑی چالاک پوری کی طرف دیکھ کر، جس سے پرانی مخاصمت چل رہی تھی، غزل شروع کی۔ مطلع تھا:

بنی ہے شیر کی مصاحب پھری ہے اتراتی
وگرنہ جنگل میں لومڑی کی آبرو کیا ہے

لومڑی اور شیر اعظم شعر سن کر اندر سے جل کر کوئلہ بن گئے مگر باہر سے ہنس ہنس کر واہ واہ کرنے لگے۔

ہرن جنگل آبادی اور زرافہ میدانوی بھی دونوں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میرے لیے بھی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔

بندر کھجلوی نے اپنی اور بھی غزلیں سنائیں جن میں سے کچھ یہ تھیں:

ہم تو ٹھہرے بندر ہی اتنی صلاواتوں کے بعد
اور ہوں گے آشنا گھونسے اور لاتوں کے بعد

لومڑی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہو گا تیرا دل
تیرے سینے میں تو بس گند کا دفتر نکلا

میں بوٹی نہیں کباب کی جسے توڑ کے تو کھا جائے گا
میں پانی نہیں جلاب کی جسے گھول کے۔۔۔

"بس بس بس بس۔" ہاتھی سونڈوی نے زبردستی بندر کھجلوی کے منہ پر اپنی سونڈ رکھ کر ان کا شعر مکمل نہ ہونے دیا اور انھیں چپ کروادیا۔

اس کلام کے آخر پر ہاتھی سونڈوی نے خوشی سے جھوم کر سونڈ سے پانی کا فوارہ پھینکا جس سے سارے شرکا اور شعرا اور بادشاہ شیر اور اس کی تینوں بیویاں بھی پوری بھیگ گئیں۔

شیر کی تینوں بیویاں اس اچانک غسل سے غصے سے واپس چلی گئیں مگر سب کو یہی بہانا بنایا کہ دعوت کا انتظام کرنا ہے، اس لیے جلد جا رہی ہیں۔

اب باری تھی لومڑی عیاروی کی۔ لومڑی صاحبہ چوری کا کلام سُر میں پڑھنے کے لیے مشہور تھی۔ لومڑی عیاروی نے اپنی غزل کا مطلع شروع کیا:

کنگھی باریک جوؤں کے سر پر ہی پھیر لے
بندر تُو اپنے سر کو ذرا دُور پھیر لے

شعر سن کر شیر اعظم اور چیتا مکاروی کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ بندر کھجلوی کے والدِ محترم بندر دم داروی شرم سے اپنا سر کھجانے لگے۔

سب شاعروں نے خوب کلام پڑھا مگر بلاشبہ بندر کھجلوی نے آج کا مشاعرہ لوٹ لیا۔ انھیں انعام میں دو درجن کیلے اور ایک باریک کنگھی دی گئی۔

کچھ دیر بعد جب مشاعرہ ختم ہوا تو سب لوگ جلوس کی صورت شیر اعظم کی دعوت پر

ان کے ہاں پہنچے۔ شیر اعظم نے مہمانوں کو کہا:

"سب مہمان لائن میں کھڑے ہو جائیں، میری کچھار ذرا تنگ ہے۔ ایک ایک کر کے اندر جاتے جائیں اور کھانا کھا کر پچھلے دروازے سے نکلتے جائیں۔ سب سے پہلے مہمان خصوصی ہرن جنگل آبادی تشریف لے آئیں۔ ان کا من پسند زعفرانی پالک بنایا گیا ہے۔"

جونہی ہرن جنگل آبادی کچھار میں داخل ہوئے، اندر موجود شیر کی دو بیگمات شیرنیوں میں سے ایک نے انھیں گردن سے دبوچ لیا اور دوسری شیرنی بیگم نے ایک شعر پڑھا اور بادشاہ اعظم شیر کو آواز دی:

"سنیے! ایک منٹ اندر آیئے گا ذرا، ہرن جنگل آبادی آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ہرن پر فوراً جھپٹ دعوت میں ورنہ بعد میں
شوربا اور گردنوں کی ہڈیاں رہ جائیں گی

ہرن جنگل آبادی کے بعد بندر کھجلوی کو اندر آنے کا کہا گیا۔ اب مجھ سے صبر نہ ہوا۔ میں نے اپنی اصل آواز سے ملتی جلتی مینڈک کی آواز میں باآواز بلند کہا:

"جناب ہرن جنگل آبادی مارے گئے، ان کو اندر قتل کر دیا گیا۔
ہائے مظلوم ہرن جنگل آبادی کا ظالموں نے کیا حشر کر دیا۔۔۔"

یہ سننا تھا کہ ایک چیخ و پکار بلند ہوئی۔ ہاتھی سونڈوی نے ایک ہی وار میں غصے میں کچھار توڑ دی۔ اندر ہرن جنگل آبادی کی صرف ہڈیاں اور کٹا سر پڑا تھا۔ ہاتھی سونڈوی نے اپنا سینہ زور سے پیٹ کر اعلان کیا:

"ہرن جنگل آبادی مارے گئے۔ شیر اعظم نے ہم سب سے دھوکا کیا۔"

یہ سننا تھا کہ چاروں طرف سب جانوروں نے شیر اعظم اور ان کے اہل و عیال کی وہ درگت بنائی کہ رہے نام جنگل کا۔ شیر اور اس کے اہل خانہ، چیتا، لگڑ بگے سب وہاں سے دم دبا کر ایسا بھاگے کہ پھر نہ لوٹے۔

اس فتح کے بعد آخر میں بکری میمنگی نے اپنا مشہور شعر پڑھا:

اے شیر بد تجھ سے تو مچھر نہیں مرتا
بکری ہوں مجھے کون ممیانے نہیں دے گا

بکری صاحبہ نے سب سے التجا کی کے یہاں اسی متبرک مقتل گاہ پر ہرن جنگل آبادی کا عالی شان مزار تعمیر کیا جائے اور یہاں ہر سال آج کے دن عظیم الشان مشاعرہ کا اہتمام کیا جائے۔سب نے اس کی تجویز کی تائید کی۔

میں بھی کافی تھک چکا تھا۔اٹھا اور واپس گھر کی راہ لی۔

گھر آیا تو آگے بکرے کا گوشت پکا تھا۔ ہرن جنگل آبادی کی موت سے دل پہلے ہی اچاٹ تھا، پھر بکری کا چہرہ نظروں کے سامنے آنے لگا۔ دل نہ کیا کہ کھاؤں۔ بیگم کو آلو کی ترکاری بنانے کا بول دیا۔

ذہن میں بندر کھجلوی کے اس شعر کا دوسرا مصرع دوڑنے لگا اور ابکائی سی آگئی۔

میں بوٹی نہیں کباب کی جسے توڑ کے تُو کھا جائے گا

چھینکوں سے یہ زکام بھگایا نہ جائے گا

کچھ لوگوں کے بقول نزلے زکام کا کوئی علاج اب تک دریافت نہیں ہوا۔ یہ بیماری آتی بھی اپنی مرضی سے ہے اور جاتی بھی اپنی مرضی سے ہے۔ مگر اس کے باوجود کے یہ ایک لاعلاج مرض ہے۔ اس مرض میں جتنے ناک، اتنے علاج تجویز کیے جاتے ہیں۔

میرے عزیزوں میں سے ایک چھکن صاحب کو اس بار جب نزلے کی شکایت ہوئی تو سب عزیزوں نے انھیں مختلف طرح کے علاج ٹوٹکے اپنے حساب سے بتائے مگر چھکن صاحب کا نزلہ تھا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ موصوف نے جب مجھ مسکین سے رابطہ کیا تو ہم نے بھی اپنے گزشتہ نزلی تجربات کے حساب سے انھیں نزلہ بھگانے کے لیے مختلف خاندانی ٹوٹکے اور تراکیب بتائیں۔

چھکن صاحب خود پچاس کے پیٹے میں تھے اور خاکسار بھی اپنی پچپنویں سالگرہ نزلے کی دائمی بیماری کی نظر کر چکا تھا، اس لیے نزلے سے بر سرپیکار ہمارے پانچ اضافی سالوں کے تجربات ان کے بہت کام آسکتے تھے۔

آج وہ جب ہمارے غریب خانے میں تشریف لائے تو چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ خط بڑھا ہوا، ناک سرخ، آنکھیں زرد، ہاتھ میں پرانا رومال تھا۔ ہم نے پوچھا، ”چھکن صاحب خیریت؟“

ایک زور دار چھینک کے بعد فرمانے لگے، "بس ذرا زکام ہے۔" ہم نے ان کے "ذرا" کو ان کی کسرِ نفسی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اور پھر ہماری بات چیت کا آغاز ہوا جس کا محور و مرکز رفعِ نزلہ و زکام تھا۔

چھکن صاحب پھر ایک زور دار چھینک مار کر فرمانے لگے: "چھمن صاحب آپ کا کیا خیال ہے کیا یہ مفروضہ درست ہے کہ نزلہ نا قابلِ علاج مرض ہے اور اس پر اٹھنے والا تمام دوادارو کا خرچ بھی جیب کا زیاں ہے؟"

ہم نے شیر وانی سے اپنا دو ہفتہ پرانا رومال نکال کر اپنی ناک زور سے رگڑی اور چھکن صاحب کی سرخ ناک کی طرف دیکھا اور ایک بے آواز چھینک مارتے ہوئے کہا:

"جی ہاں چھکن صاحب، بڑے بوڑھوں سے یہی سنا ہے کہ یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ نزلہ و زکام واقعی لا علاج مرض ہے، مگر اس بدیہی حقیقت کے باوجود یہ واحد لا علاج مرض ہے جس کا علاج ہر ذی روح تجویز کر سکتا ہے۔"

چھکن صاحب کو ہنسنے کی کوشش میں بے ساختہ چھینک آئی اور ان کے بلغم کا بلیغ چھینٹا ہماری شیر وانی کی جیب پر چھپاک سے آگرا۔

جس حصہ پر بلغم زیادہ لگی تھی وہ حصہ چھوڑ کر باقی ماندہ ناک صاف کر کے بولے:

"اس کا مطلب تو یہی ہوا پھر نزلہ کا شکار لوگوں کو بغیر علاج کیے چھینکیں مار مار کر اس دارِ فانی سے کوچ کر جانا چاہیے؟"

ہم نے کہا:

"جی چھکن صاحب، بات تو کچھ ایسی ہی ہے مگر ایک حکیم صاحب جو ابھی تازہ تازہ مکتب سے نکلے ہیں، ان کا نزلے کو لے کر بہت ہی انوکھا علاج ہے۔ ان کے بقول ہر بیماری کا علاج اسی بیماری کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس حساب سے ان کے مطابق اگر نزلے کا مریض ایک دن میں پوری تینتالیس چھینکیں مارے، نہ ایک کم نہ زیادہ، تو نزلہ اگلے دن صبح تک رفو چکر ہو جاتا ہے۔"

چھکن صاحب نے پھر ایک خوف ناک چھینک دے ماری اور حیران ہو کر بولے:

"مگر تینتالیس کی تعداد کو یاد رکھنا اور صرف تینتالیس چھینکیں مار کر نزلے کو بھگانا اپنے اندر خود ایک مشکل امر ہے، نہیں۔"

یہ کہتے ہی انھیں پھر ایک باآواز بلند کرخت چھینک آگئی۔

ہم نے بھی اس فارغ وقت میں ناک میں انگلی ڈال کر اپنی جمی ہوئی بلغم زور سے کھینچتے ہوئے یر حمکم اللہ کہا اور بولے:

"چھکن صاحب، اگر ارادہ مستحکم ہو اور نزلے کو بھگانے کا فیصلہ بھی اٹل ہو تو یہ کچھ ایسا مشکل کام بھی نہیں۔"

اور ہم نے بھی جوابی ہلکی آواز میں مدھر مگر ان کی ہم قافیہ چھینک مار کر شعر مکمل کر دیا۔

چھکن صاحب ایک بھیانک اونچے سُر کی چھینک مار کر بولے:

"مگر کون کم بخت یاد رکھ سکتا ہے؟ یا تو بیگم کے ذمہ چھینکوں کی گنتی کا یہ اہم کام سونپا جائے، ہم خود تو چوبیس سے آگے تک کی گنتی بھی ٹھیک سے نہیں گن سکتے۔"

"ہم م م، ہاں بیگمات کس دن کے لیے ہیں؟ سارا دن جماہیاں لیتی ہیں اور ہم چھینکیں مار مار کر بھری جوانی میں مرنے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

ہم نے بھی پھر مخصوص ایک بغیر وزن کی چھینک مار کر چھکن صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

چھکن صاحب بولے:

"مگر چھمن صاحب یہ جوشاندے، ادرک، دار چینی کے قہوے، خالص شہد چاٹنے سے بھی اگر یہ موذی زکام نہیں ہٹ رہا تو چھینکوں کی مخصوص تعداد کی گنتی سے یہ کیسے بھاگے گا؟ اس کا کوئی عقلی۔۔۔ آچھوں۔۔۔ جواز ہمیں سمجھ نہیں آرہا۔"

چھکن صاحب حالیہ بے سری چھینک کے بعد بالکل نڈھال ہو چکے تھے۔

ہم نے فوراً ادب سے اپنا پرانا سوکھا بلغمی رومال انھیں ہدیہ کیا اور حوصلہ دیا کہ وہ اس مشکل زکامی گھڑی میں ہمت نہ ہاریں اور علاج پر توجہ دیں۔

چھکن صاحب نے ہمارے رومال سے اپنی ناک زور سے نچوڑتے ہوئے رومال تازہ بلغم سے بھر کر ہماری جانب مسکرا کر لوٹا دیا۔ ہم نے بھی اُسے فوراً سلیقے سے بند کا بند اپنی شیروانی کی جیب میں زبردستی گھسیڑ دیا۔

"تو پھر کل سے اس نئے علاج کو شروع کیا جائے؟"

ہم نے شیروانی کے ایک بازو سے اپنی ناک صاف کرتے ہوئے چھکن صاحب کی ناک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چھکن صاحب ہمت کر کے بولے۔۔ "آچھوں۔۔ چھمن صاحب۔۔ آآآچھوں۔۔ اب ہم چلتے ہیں ابھی آپ کی بھاوج کو بھی قائل کرنا ہے تاکہ وہ تینتالیس چھینکوں کی گنتی کرنے پر 'قبول ہے' بول سکیں۔"

چھکن صاحب گھر پہنچے اور بیگم کے قریب جا کر بولے:

"ثریا بیگم۔۔ آچھوں۔۔" بیگم کے سرمئی نئے رنگے دوپٹے پر ہر طرف بلغم جا گری۔

"ہائے ہائے پرے ہٹو، سارا دوپٹہ ستیاناس کر ڈالا۔ کل ہی رنگوایا تھا۔"

"سنو تو بیگم۔ چھمن میاں نے ہمیں زکام کا دائمی۔۔ آچھوں۔۔ علاج بتا دیا بس تمھیں ہماری ذرا۔۔ آچھوں۔۔ مدد کرنی ہوگی۔"

"ہیں، ہیں، میں اور کیا کروں؟ تین دن سے ادرک، دار چینی کے قہوے، جوشاندے بنا بنا کر سارے باورچی خانے کو مطب بنا ڈالا۔ اور کیا مدد کروں میں اب؟"

ثریا بیگم بھنا کر بولیں۔

"بس تمھیں کل صبح سے چھ چھو۔۔ آچھوں۔ چھینکوں کی گنتی کرنی ہے اگر تا۔۔ تن۔۔ آچھوں۔۔ تالیس چھینکیں ہم نے کسی طرح مار ڈالیں تو اس موئے زکام سے ہمیشہ۔۔ آآ۔۔ نجات۔۔ چھوں۔۔ مل جائے گی۔"

ثریا بیگم ہنستے ہوئے بولیں:

"مگر چھینکوں سے تو زکام بڑھتا ہی ہے اور اگر مارنے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا ہے تو تینتالیس کیوں چھیالیس کیوں نہیں؟ چھ سے چھینک، چھ سے چھیالیس، ٹھیک ہیں نہ؟"

چھکن صاحب نے فوراً لقمہ دیا:

"اور چھ سے چھکن۔"

ثریا بیگم بولیں: "ہاں اور کیا!" اور بے اختیار ہنسنے لگیں۔

"ہاں یہی تو۔۔۔"

"مجھے لگ رہا ہے یہ کسی سر پھرے نیم حکیم نے آپ کو اور چھمن میاں کو علاج کے نام پر ٹھگ لیا ہے۔"

"بس بس، جو ہم نے کہا اس پر۔۔۔ آچھوں ں۔۔ عمل کرو۔" چھکن صاحب نے نسبتاً کم آواز کی بغیر ردیف کی چھینک مارتے ہوئے اس بار بجھے انداز میں، کہا۔

اگلے دن صبح سویرے ہی پہلی نہار منہ چھینک سے جب ان کی آنکھ کھلی تو ساتھ ہی خوابِ خرگوش کے مزے لیتی بیگم پر نظر پڑی۔ فوراً کاندھے کو ہلایا اور زور سے دوسری چھینک ان ہی کے منہ کے پاس دے ماری۔ بیگم کے منہ پر جگہ جگہ فوارے کی طرح نزلہ جا گرا۔

وہ بھونچائی ہوئی اٹھیں اور غصے میں بولیں:

"کیا بولا گئے ہیں آپ۔ صبح صبح بلغمی تھوک سے نہلا دیا مجھے۔ اخ تھو۔۔۔"

"بیگم دو۔۔۔ آچھوں۔۔۔ تین ہو گئیں کہیں لکھ لو۔"

بیگم نے ساتھ پڑی ڈائری پر چھینک ضرب تین لکھ کر تین لکیریں کھینچ دیں۔

اس دوران چھکن صاحب ٹٹی کے لیے گھس گئے۔ اندر سے زوردار آواز آئی:

بیگم نے زور سے پوچھا: "کیا؟ چار؟"

بولے: "نہیں یہ کچھ اور تھا۔۔۔ آچھوں۔۔۔ پانچ۔۔۔"

اس دوران بچے بھی اٹھ گئے۔ ببن میاں جو بڑے صاحب زادے تھے، والدہ سے پوچھا: "اماں جان، ابا جان یہ بار بار گنتی کیوں یاد کر رہے ہیں؟ انھیں تو ہم سے زیادہ چوبیس تک گنتی آتی ہے۔"

ثریا بیگم تڑاک سے بولیں:

"یہ مصیبت تمھارے موے دوست جمن کے بابا چھمن صاحب نے تمھارے ابا کے پیچھے لگائی ہے۔ آج سارا دن چھینکوں کا حساب کتاب ہو گا۔ انھوں نے منکر نکیر سمجھ رکھا ہے مجھے۔"

اس دوران غسل خانے سے چھکن صاحب نے با آواز بلند تین اکٹھی مختلف کافیوں کی چھینکیں بلند کیں اور بیگم کو آواز دی:

"اکیس ہو گئیں، بیگم اکیس۔"

بیگم نے حیرت سے پوچھا:

"ہائیں اکیس کیسے؟ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو دس تھیں۔ بے ایمانی نہیں چلے گی۔ ٹھیک سے گنتی کریں بس۔"

دوپہر تک جیسے تیسے چھکن صاحب نے تینتالیس چھینکیں مکمل کیں اور فتح سے نعرہ بلند کیا۔ اس دوران ثریا بیگم نے ان کے کمرے کی ٹھیک سے صفائی ستھرائی جھاڑ پونچھ بھی مکمل کر لی اور سارے کمرے کے سالوں سے چمٹے جالے بھی اتار لیے۔ بہر حال چھکن صاحب کا نزلہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ اب اس کے پیچھے تینتالیس یا چھیالیس چھینکیں آنا تھا یا جتنے ناک اتنے دعوے تھے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ چھکن صاحب کے نزلے کا وقتی اختتام ہوا۔ خلافِ توقع اگلی صبح ان کی بیگم کا نزلہ پورے گھر پر ایسا گرا کہ پورا گھر چھینکوں کی چھنکار سے گونجنے لگا۔ موصوفہ ہر بحر، ہر قافیے کی چھینک مارنے میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔ جہاں سے گزرتیں، چھا... چھو... چھن... چھن... کرتی پیچھے نشانیاں چھوڑتی گزرتیں اور چھکن صاحب پورا دن صفائی ستھرائی اور چھینک شماری کرتے پھرے۔

Shoe

کچرے کے ڈھیر میں لوہا اور دوسری کام کی چیزیں تلاش کرنا ان دونوں کے لیے آسان کام نہیں تھا۔ دن بھر وہ دونوں ننگے پاؤں ایک بڑا تھیلا کمر پر ڈالے کچرے کے ڈھیروں کے گرد گھومتے اور کام کی اشیا اپنے تھیلے میں ڈالا کرتے۔

امیریا اور امیرن دونوں بہن بھائی تھے۔ دونوں کی عمریں نو اور دس سال کے قریب تھیں۔ امیریا بڑا تھا اور امیرن چھوٹی۔ ان کا باپ چھ ماہ پہلے خون کی الٹیوں کی عجیب گمنام بیماری سے مر گیا تھا۔ ماں کے ساتھ وہ دونوں شہر سے دور ویرانے میں ایک جھگی میں رہا کرتے تھے۔ ہر روز صبح پانچ بجے اٹھ جاتے۔ ان کی ماں انھیں کچرے میں سے ایک دن پہلے ملی ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکرے چائے کے ساتھ ناشتے میں کھلا کر کمر پر تھیلے پہنا کر کام پر بھیج دیا کرتی۔ اس کی اپنی صحت بھی اچھی نہ تھی۔ آئے دن بخار اور خشک کھانسی کا شکار رہتی تھی۔

بہت دن سے امیریا کو اپنے اور اپنی بہن کے لیے جوتوں کی تلاش تھی۔ وہ دونوں ہر روز جگہ جگہ کچرے کے ڈھیروں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھتے مگر جوتا ہزار کوشش پر بھی انھیں کبھی نا ملتا۔

اس دن ان دونوں نے سوچا کیوں نہ کسی دوسرے رستے سے آج شہر جایا جائے، شاید انھیں کہیں سے کوئی جوتا مل جائے۔ دونوں نے اپنے پاؤں میں پلاسٹک کے تھیلے ربڑ بینڈ سے

باندھ رکھے تھے مگر اس میں جوتے کے تلے کی مضبوطی والی بات نہیں تھی۔ ان دونوں نے اپنے مرے باپ کا مضبوط جوتا دیکھ رکھا تھا جس کے تلے میں صرف دو جگہ سوراخ تھے مگر وہ پاؤں کو ہر طرح سے محفوظ رکھتا تھا۔ امیریا نے ایک بار کوشش بھی کی کہ وہ اس جوتے کو کاٹ کر اپنے سائز کا بنالے۔ ایک موچی سے بھی بات کی مگر اس نے اس کے بہت چھوٹے پاؤں دیکھ کر انکار کر دیا۔ مجبوراً وہ جوتا ان دونوں نے آٹھ آنے میں موچی کو بیچ دیا اور اس سے مزیدار نمک پارے اور بادانہ خرید لیا تھا۔

آج وہ دونوں شہر کے جس حصے میں آئے تھے وہ بظاہر بہت صاف ستھر اعلاقہ تھا۔ وہاں بڑی بڑی دکانیں تھیں جن میں بڑی بڑی ہاتھی کے سائز کی کرسیاں، میزیں اور نہ جانے کیا کیا سجا تھا، جو اس سے پہلے کبھی ان کی نظر سے نہ گزرا تھا۔ بڑے بڑے ٹرک پاس سے تیزی سے گزرتے تھے۔ کچھ پر کھانے کا سامان لدا ہوتا اور کچھ پر ان دونوں کے نا سمجھ میں آنے والی مصنوعات۔۔۔ جلد ہی ان دونوں نے وہاں بھی کوڑے کرکٹ کا ایک ڈھیر تلاش کر لیا۔ وہ دونوں کچرے میں کچھ کام کی چیزیں تلاش کر رہے تھے۔ وہاں انھیں آدھ کھائے کیلے اور بہت سی ایسی کھانے کی چیزیں ملیں جنھیں دیکھ کر وہ دنوں دنگ رہ گئے۔ وہ دونوں افسوس کرنے لگے کہ وہ پہلے اس علاقے میں کیوں نہ آئے جہاں بہت سا اچھا کھانا پھینک دیا جاتا ہے۔ ان دونوں نے جلدی جلدی کچھ آدھ کھائی بوٹیاں اور چاول زمین سے اٹھائے اور ایک لفافے میں اپنی ماں کے لیے رکھ لیے۔ وہ دونوں یہ سوچ سوچ کر ہی بہت خوش تھے کہ ان کی ماں آج مرغ چاول اور کیلا کھائے گی۔

امیرن جلدی جلدی پلاسٹک اور لوہے کی بوتلوں کو اپنی پشت پر لگے تھیلے میں ڈال رہی تھی کہ اچانک اس کے ہاتھ ایک پیر کا جوتا لگا۔ وہ خوشی سے چیخی، "امیریا جلدی آؤ، جلدی آؤ۔ یہ دیکھو جوتا مل گیا، جوتا مل گیا۔" امیریا نے اپنا تھیلا وہیں پھینکا اور فوراً امیرن کے پاس دوڑا آیا۔ اس کا چہرہ بھی خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ دونوں اس جوتے کو الٹ پلٹ کر خوشی سے دیکھنے لگے۔ جوتا امیریا نے پہنا تو وہ اسے ذرا سا تنگ تھا۔ اس نے جوتا اتارا اور وہ دونوں

دوسرا پاؤں ڈھونڈنے لگے مگر ہر طرف دیکھنے کے باوجود انھیں دوسرا پاؤں نہ ملا۔ مگر وہ دونوں پھر بھی بہت خوش تھے کہ انھیں ایک جوتا تو ملا۔ امیریا نے زبردستی وہ ایک جوتا امیرن کو پہنا دیا۔ وہ دونوں مسلسل اس جوتے کو بار بار دیکھتے گھر واپس جا رہے تھے۔ امیرن کو اس پاؤں میں بے حد سکون مل رہا تھا۔ امیرن نے ضد کی کہ بھائی آدھے راستے میں نے جوتا پہنا، آدھے راستے تم پہنو۔ امیریا نے بہت انکار کیا مگر بہن کی بات ٹال نہ سکا اور جوتا پہن لیا۔ جوتا ذرا تنگ ضرور تھا مگر اسے بہت سکون ملا۔ چلتے ہوئے وہ جب اس جوتے والے پاؤں سے آگے قدم اٹھاتا تو اسے لگتا وہ آسمان میں اڑ رہا ہے۔ وہ دونوں سارے راستے یہ باتیں کرتے رہے کہ اگر وہ اس علاقے میں اور آگے جائیں تو شاید ایک ماہ میں انھیں تین اور جوتے کے پاؤں مل جائیں، شاید ماں کے لیے بھی۔

"بالکل۔" امیریا نے جوتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جب وہ دونوں گھر پہنچے تو ماں جوتے کا ایک پاؤں دیکھ کر بہت حیران ہوئی اور ان دونوں کو گلے لگا کر خوب روئی۔

ان دنوں نے خوشی سے ماں کو آدھ کھایا کیلا اور مرغ چاول کھلائے۔

اگلے دن وہ دونوں پھر اسی پوش علاقے میں تڑکے ہی نکل گئے۔ اس بار بھی انھیں نگٹس کے بہت سے ٹکڑے کچرے میں پڑے ملے۔ انھوں نے صفائی سے سب کچھ اکٹھا کیا اور جوتے کی تلاش شروع کر دی۔ اس بار امیریا کی قسمت اچھی نکلی۔ اسے ایک عجیب و غریب جوتے کا جوڑا ملا۔ اس نے امیرن کو خوشی سے بلایا اور دکھایا۔ اور پوچھا کہ یہ کیا ہو سکتا ہے؟ دکھنے میں تو جوتے جیسا ہے مگر ایسا جوتا کبھی دیکھا نہیں، یہ کیا ہے؟

بظاہر تو وہ جوتا ہی تھا مگر تلے پر ایک لمبی چونچ جیسی عجیب و غریب ایڑی لگی تھی اور اوپری حصہ پر صرف دھاگے تھے جنھیں گرہ لگانی تھی۔ شاید امیریا نے اسے زبردستی پہننے کی کوشش کی مگر وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔ امیرن زور زور سے ہنسنے لگی۔ اب باری تھی امیرن کی۔ امیرن نے اس عجیب نوک تلے والے جوتوں کو کسی طرح چڑھایا اور چلنے کی کوشش کی۔ کچھ

قدم تو وہ اٹھا پائی مگر اس کے پیر دکھنے لگے۔ اس نے جوتے اتارے اور ان کی ایڑی کے نیچے لگی چونچ کو ایک پتھر سے توڑنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں جوتے کا تلا دو ٹکرے ہو گیا۔ وہ دونوں اس انجام پر بہت افسردہ ہوئے۔

امیرن نے دلاسہ دیتے ہوئے امیریا کو کہا، ”بھائی پریشان نہ ہو، ہم موچی چچا سے کہہ کر اسے کسی طرح ٹھیک کروالیں گے۔“

وہ گھر واپسی کے لیے نکل پڑے۔ راستے میں ایک کچرے کے ڈھیر پر انھیں دو اور لوگ نظر آئے۔ ایک بچہ اور ایک اس کا بوڑھا اندھا باپ۔ وہ دونوں کچرے کے ڈھیر پر بیٹھے کچھ کھانے کو کھوج رہے تھے۔ امیرن نے اس بچے کو ایک آدھ کھایا کیلا اور آدھ کھایا نان دیا۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔

جب وہ بچہ زمین سے کھڑا ہوا تو امیریا نے دیکھا، اس کی ایک ٹانگ نہیں تھی اور وہ صرف ایک ٹانگ پر ننگے پاؤں کھڑا تھا۔ امیریا کو اور کچھ نہ سوجھا، اس نے فوراً اپنا ایک جوتا اتارا اور اس بچے کو پہنا دیا۔ وہ بچہ اپنے اکلوتے پاؤں میں جوتا دیکھ کر بے انتہا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اور جب اس نے اپنے اندھے باپ کو بتایا کہ اسے ان انجان دوستوں نے جوتا دیا ہے، تو یہ سن کر اس کا باپ بھی خوشی سے مسکرانے لگا۔

اس دوران وہ سب کچرے کے جس ڈھیر پر کھڑے تھے وہاں اچانک ایک تیز موٹر کار آکر رکی اور زمین پر کھڑا بارش کا کیچڑ ملا پانی ان سب پر جا گرا۔ موٹر کار کی پچھلی سیٹ سے شیشہ نیچے ہوا اور تین فاسٹ فوڈ کے لفافے کچرے کے ڈھیر پر جا گرے۔ پھر وہ کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ امیرن نے فوراً ان لفافوں کو کھولا، اندر آدھ کھائے برگر اور چپس کی اتنی مقدار موجود تھی کہ وہ چاروں پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے۔

وہ چاروں ہنس ہنس کر باقیات کھانے لگے۔ تینوں بچے کھانے کے دوران جب بھی اس ایک جوتے کے پاؤں کو دیکھتے، بے پناہ خوشی سے ان کے چہرے چمک اٹھتے۔

Aviation City

اس پروجیکٹ کے مکمل ہونے کا ہم سب بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ میں، کین اور ہمارے دو بچے۔ آٹھ سالہ بیٹا کیپلر اور سات سالہ بیٹی ہوپ، جس جگہ رہ رہے تھے وہاں حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ Hindenberg جہاز جہاں ذاتی باتھ روم اور ٹوائلٹ کی سہولت نہیں تھی بلکہ ہر دس اپارٹمنٹس کے لیے ایک مشترکہ باتھ روم تھا جس کی وجہ سے رہائشیوں کو کافی دقت کا سامنا رہتا تھا۔

ہم نے بہت عرصے سے نئی آبادی میں اپنے ذاتی جہاز کے لیے اپلائی کر رکھا تھا۔ یہ الاٹمنٹ قرعہ اندازی کے ذریعے ہونے والی تھی۔ ہمیں پوری امید تھی اس سال ہمیں Aviation City میں تقریباً دس ہزار نئے جہازوں کی جس بستی کا افتتاح ہوا ہے اس میں ہمارے نام کا جہاز بھی ضرور نکل آئے گا۔ ہمیں زیادہ بڑا جہاز نہیں چاہیے کوئی Gulf 1 Stream سائز کا چھوٹا جہاز ہو جائے بس، جس میں کاک پٹ میں بچوں کا کمرہ بن جائے، پیچھے ہمارا لاؤنج اور ایک کمرہ۔ بس یہی ہماری ضرورت تھی۔ باتھ روم بھی صرف ہمارے استعمال کا ہو گا۔ میں اور کین یہ سوچ سوچ کر ہی خوش ہوا کرتے کہ اب ہمارے برے دن جلد ختم ہو جائیں گے۔

آج مجھے کام سے چھٹی تھی، سوچا کیوں نہ کین اور بچوں کو لے جا کر نئی بستی دکھلاؤں

اور وہاں ان کے پراجیکٹ دفتر کے انچارج سے بھی مل لوں، شاید اب تک ہماری قرعہ اندازی کا نتیجہ نکل آیا ہو۔

ہمیں نئی بستی تک ایک چھوٹے ڈائمنڈ سٹار جہازی رکشے میں بیٹھ کر جانا ہوتا تھا جو ہمیشہ راستے میں ڈھلوانوں کی وجہ سے بار بار رک جاتا تھا اور یوں ایک گھنٹے کا سفر دو گھنٹوں میں مکمل ہوتا تھا۔

جیسے تیسے آج بھی ہم اپنی اس مفلوک الحال بستی سے نکلے جہاں ایک ایک جہاز میں سو سو لوگ چھوٹے چھوٹے ڈربوں میں رہنے پر مجبور تھے۔ ہمارے ارد گرد سب ستر اسی سال پرانے کھنڈر جہاز تھے جن میں ہزاروں لوگ بڑی مشکل سے گزارا کر رہے تھے۔ بچوں کا اسکول بھی ایک ٹوٹے جہاز میں بنایا گیا تھا، جس کی چھت بھی ٹپکتی تھی۔

ہمارے سمیت زیادہ تر رہائشی اس بوسیدہ بستی سے نکلنا چاہتے تھے۔ تقریباً سبھی لوگوں نے New Aviation City میں اپنے لیے جہاز کی قرعہ اندازی میں قرعہ ڈال رکھا تھا۔

سبھی چاہتے تھے جلد از جلد اس نئی بستی کے رہائشی بن جائیں جہاں صاف ستھرے نئے جہاز آئے ہیں اور بستی بھی صاف ستھری ہے۔ سکول و ہسپتال سب Boeing 787 اور Boeing 777 میں بنائے گئے ہیں۔

جیسے تیسے ہم پراجیکٹ انچارج کے دفتر پہنچے۔ انچارج بظاہر سلجھا ہوا انسان معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے اپنی فائل اسے دکھائی اور پوچھا کہ ہمارا قرعہ کیا نکلا اور ہمیں کون سا جہاز الاٹ ہوا؟ انچارج نے بتایا کہ ہمارے نام کا ایک Concorde نکلا ہے جس میں صرف چار فیملیز ہوں گی۔ ہم یہ سن کر بہت پریشان ہوئے کیوں کہ ہماری ضرورت اتنے بڑے جہاز کی نہیں تھی اور ویسے بھی یہ جہاز بہت شور کرتا ہے اور خرچہ بھی زیادہ ہو گا بجلی کے بلوں کا۔

ہم نے انچارج سے درخواست کی کہ وہ کسی بھی طرح ہمیں کوئی اور آپشن دے۔ انچارج نے کچھ دیر فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا کے ایک دوسری آپشن ہے Airbus A320 اس میں صرف دس فیملیز ہیں اور سب فیملیز کے باتھ روم بھی علیحدہ ہیں۔ میں

نے کین کی طرف دیکھا، وہ بچوں کی طرف دیکھنے لگی۔ بچوں نے اکٹھے نفی کے طور پر گردن دائیں اور بائیں گھما کر اس آپشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

میں نے مودبانہ طریقے سے انچارج سے دوبارہ اپیل کی کہ وہ براہ مہربانی کوئی چھوٹا جہاز دیکھے جہاں صرف ہماری فیملی رہ سکے۔ میں نے اسے کہا وہ Falcon 7 X یا TBM 700 یا بیچ کرافٹ ٹائپ کے چھوٹے جہاز تلاش کر کے دے جہاں صرف ہماری اپنی فیملی آزادی سے رہ سکے۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ بظاہر ممکن نہیں، ایک تو چھوٹے جہاز بہت کم ہیں دوسرا جو ہیں وہ سب الاٹ ہو چکے ہیں۔"

اس کی بات سن کر ہم بہت مایوس ہوئے مگر اس نے ہمیں تھوڑی دیر رکنے کے لیے کہا اور اندر کچھ مشورہ کرنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ہمیں امید بندھی شاید کوئی خوش خبری ہو۔ اس نے ہمارے سامنے Lock Head P38 Lightning کی آپشن رکھی۔ یہ جہاز دوریا دو مختلف کیبنز کو اپنے پروں کے ساتھ جوڑے ہوئے تھا۔ اس نے بتایا کہ اس میں صرف دو فیملیز کی رہائش ہو گی، دو مختلف کیبنز میں، البتہ کچن صرف ایک ہے۔ یہ بات سن کر کین کی مسکراہٹ فوراً مایوسی میں تبدیل ہو گئی۔

اس نے بغیر کچھ سوچے اچانک اونچی آواز میں کچھ اس طرح 'نہیں' کہا کہ انچارج اپنی سیٹ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا مگر ہم دونوں کو ہی فوراً احساس ہو گیا اور دونوں دوبارہ نارمل ہو گئے۔ میں نے انچارج سے دوبارہ درخواست کی کہ وہ کسی بھی طرح ہمیں ہمارا ذاتی طیارہ دلوا دے تاکے ہماری فیملی سکون سے اپنی زندگی اپنے حساب سے گزار سکے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور دوبارہ اپنی فائل ہاتھ میں لیے اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے کین سے پوچھا۔ "یہ کیا حرکت تھی؟ اتنی اونچی 'نہیں'۔" بچے میری بات سن کر ہنسنے لگے۔ کین کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا، وہ بولی: "آپ کیا چاہتے ہیں، ایک کچن میں روز دو خواتین کی لڑائی ہو؟ آپ کھانا کیسے کھائیں گے؟ ابھی ہم جہاں رہتے ہیں وہاں باتھ روم سانجھا ہے مگر

کچن تو کم از کم اپنا ہے۔" یٔں کین کی جرح سے کسی حد تک قائل ہو گیا اور خاموش ہو گیا۔

اتنے میں انچارج دوبارہ آیا اور بولا: "ہمارے پاس ایک Wright flyer چھوٹا جہاز ہے یا Stearman Biplane چھوٹا جہاز مگر ان دونوں جہازوں میں سافٹ روف ہوتی ہے اس لیے ان میں مستقل رہنا مشکل ہے۔ البتہ ایک Beech T34 جہاز کی چھت کو اگر بند کر دیا جائے تو ایک بڑا کمرہ بن سکتا ہے، آپ چار لوگوں کے لیے، مگر مسئلہ پھر وہی ٹوائیلٹ اور باتھ روم کا ہے۔"

ہم بہت مایوس ہوئے۔ اس کی بات سن کر آخر ہم نے اسے کہا۔ "کیا جہاز کے علاوہ بھی کوئی آپشن ہے؟" اس نے کچھ دیر فائلز کو دیکھ کر کہا کہ ہاں، ایک ہے، مگر اس میں آپ چاروں کے لیے رہنا مشکل ہو گا۔"

میں نے اصرار کیا تو وہ بولا، "ایک راکٹ ہے Space Shuttle نامی، ابھی ابھی آیا ہے مگر اسے کوئی بھی لینا نہیں چاہتا۔ اترنے اور چڑھنے کا کوئی مناسب بندوبست نہیں ہے بلکہ ابھی تک ہم سمیت کوئی اندر بھی نہیں گیا۔ اگر آپ لینا چاہتے ہیں تو آپ کو ابھی چابی دے سکتا ہوں۔" میں نے کین اور بچوں کی طرف دیکھا، بچوں نے گردن سے ہاں کا اشارہ کیا۔

ہم نے فوراً چابی لی اور پیدل راکٹ کی طرف چل پڑے۔ کچھ ہی دیر میں آسمان سے باتیں کرتا راکٹ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ ایک چھوٹی سیڑھی سے ہم چاروں کسی طرح اوپر چڑھ گئے اور ایک بھاری دروازے کو کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔

اندر جگہ جگہ کافی پیچیدہ سوئچ لگے تھے۔ ایک جگہ ٹوائیلٹ لکھا تھا۔ کین نے فوراً کہا: "مجھے یہ جگہ رہنے کے لیے منظور ہے۔"

آگے ہمیں بیٹھنے کے لیے چار نشستیں نظر آئیں۔ ہم چاروں اس پر بیٹھ گئے۔ دیوار پر چار خلائی لباس ٹنگے تھے۔

میرا بیٹا کیپلر اور بیٹی ہوپ دیوار پر لگے سوئچ کو دبانے لگے۔ اچانک راکٹ کی سب لائٹس آن ہو گئیں۔ ہم دونوں میاں بیوی بہت حیران ہوئے۔ سب چیزیں ٹھیک کام کر رہی

تھیں۔ ایک جگہ آن کا بٹن لگا تھا، میں نے سوچا کیوں نہ اسے آن کروں۔ جونہی میں نے بٹن آن کیا، الٹی گنتی کی آواز چل پڑی۔ راکٹ کا انجن سٹارٹ ہو چکا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی اپنی سیٹ بیلٹس کس لیں۔ ون کی آواز آتے ہی راکٹ اوپر کی جانب تیزی سے اٹھنے لگا اور ہم سب نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ راکٹ فضا میں بلند ہوا، اس کے بعد ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔

ہم خلا میں کہیں اوپر سفر کر رہے تھے۔

راکٹ میں کچھ کھانے کے پیکٹ بھی تھے۔ ہم سب نے انھیں کھایا۔ دو راتوں بعد ہمارا راکٹ خود ہی ایک جگہ جا کر رکا۔ جب دروازہ کھلا تو وہاں بہت سے لوگوں نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں بتایا کہ اس قرعہ اندازی میں راکٹ کو چننے والوں کو اس آسمان میں خلا میں بسائے شہر کی شہریت دی جانی تھی جس میں ان کی فیملی کو کامیابی ملی۔ جب وہاں ہمیں ہمارا گھر دکھایا گیا تو میں، کین اور بچے دنگ رہ گئے۔ ایسا گھر ہم صرف خواب ہی میں سوچ سکتے تھے۔ ایک کھڑکی سے زمین نظر آتی تھی، ایک سے چاند، سورج اور ستارے۔

ہم سب اپنے خوابوں کا گھر پانے کے بعد بہت خوش تھے۔

کسان موومنٹ

چیف منسٹر کا پی-اے شرما بہت دیر سے ان کی خواب گاہ کے باہر ٹہل رہا تھا، مگر گیارہ بجنے کو آئے تھے، وہ اب تک سو کر نہ اٹھے تھے۔

مجبوراً پی-اے شرما نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور انھیں اٹھایا۔ اٹھتے ہی ہمیشہ کی طرح انھیں سب سے پہلے تازہ سنگتروں کا جوس پیش کیا گیا اور تین انڈوں کا آملیٹ اور خستہ تیار ہوئی ڈبل روٹی کا ناشتہ کروایا گیا۔ ناشتے کے فوراً بعد انھیں خالص دودھ سے بنی ملائی والی چائے پینے کی عادت تھی، وہ دی گئی۔

سب چیزوں سے فارغ ہو کر وہ پہلی دفعہ سی-ایم-پی-اے کی طرف متوجہ ہوئے اور اکتاہٹ سے پوچھا: ''شرما کیا افتاد آن پڑی تھی جو صبح صبح مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا؟''

پی-اے شرما کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ شرمندگی سے بولا:

''سر! وہ جو--- وہ لوگ ہیں نہ--- سر جو بہت دن سے---''

''کیا بڑبڑ کر رہے ہو--- کون لوگ؟''

مکھ منتری نے درمیان میں ہی ٹوکا۔

''سر وہ جو بہت دن سے دھرنا دیے بیٹھے ہیں سر، ان میں وہ جو ایک تھا ناں----''

''کرتار سنگھ--''

"ابے کیا وہ وہ وہ لوگ کی تکرار کر رہے ہو۔۔۔ کون کرتار سنگھ؟"
مکھ منتری نے پھر غصے سے پی-اے کو ٹوکا۔

"سر وہ جو لوگ تھے بھوک ہڑتال دھرنے والے، ان میں سے دو بھوک ہڑتال کرنے سے کل رات مر گئے۔ کرتار سنگھ اور بھشن لال۔"

"تو مَیں کیا کروں؟ مم۔۔۔ میرا کیا قصور ہے؟"

مکھ منتری نے ٹیبل پر پڑے سنگِ مرمر کے سیب کو زور سے لاٹو کی طرح تیزی سے گھماتے ہوئے خفت سے کہا۔

"لیکن سر وہ۔۔"

"پھر وہ وہ وہ شروع کر دی تم نے۔ صبح صبح میرا موڈ خراب نہ کرو۔ جاؤ ابھی، مجھے کچھ دیر میں گولف کے لیے بھی نکلنا ہے۔ ڈرائیور کو کہو میرا گولف کا سامان سب تیار کرے۔"

"جی سر۔" پی-اے بولا اور جلدی سے باہر نکلنے لگا۔

"اور ہاں، باورچی موتی لال مہاراج سے کہو کہ آج دو بجے ہم بھوجن کریں گے۔ لنچ میں تازہ سرسوں کا ساگ اور تازہ مکئی کے آٹے کی روٹیاں بنوائے، اور ہاں، بھنڈی اور کریلے کی ترکاری بھی ضرور بنائے مگر صرف ناریل کے اصلی تیل میں۔ آج میرا ایک پرانا دوست جج گپتا بھی ساتھ لنچ کرے گا۔ دو بجے تک سب تیار رہے سب۔"

"جی سر مگر سر آپ پچھلے گیٹ سے باہر نکلیے گا، وہ سب کسان دو لاشیں لیے مین گیٹ کے باہر پہنچ چکے ہیں۔"

"ہیں۔۔۔ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ یہ راتوں رات کیسے یہاں پہنچ گئے؟"

"راتوں رات نہیں سر، صبح آٹھ بجے آ گئے تھے سب لوگ۔ اب تو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں سر۔ اسی لیے میں صبح سے آپ کے کمرے کے باہر آپ کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔" پی-اے شرمانے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ذرا ایس-پی کو کال کرو۔ ابھی فوراً، بلکہ رہنے دو اس جاہل کو۔ آئی-جی سے ہی بات

کرواؤ۔ زندگی نرگ بنا دی ان مورکھوں نے۔ صبح صبح دن خراب کر دیا تم لوگوں نے میرا، اوپر سے کل رات گئے غزلوں کے پروگرام میں دیر ہو گئی، نیند بھی پوری نہیں ہوئی میری۔ جسم اب تک تھکا ہوا ہے۔"

"سر آئی-جی صاحب لائن پر ہیں، بات کریں۔"

"ہاں فون دو۔"

"ہیلو ہاں جوگیندر یہ سب کیا ہو رہا ہے بھئی؟ یہ کیا چک چک ہے یار؟"

"سر صورت حال آپ کے سامنے ہی ہے، میں نے تو پردھان منتری سے ملاقات کے دوران آپ کو بھی اور انھیں بھی بتا دیا تھا کہ حالات کافی گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں۔ کسان برادری بہت واویلا کر رہی ہے۔ ہر ماہ خود کشیاں بڑھ رہی ہیں۔ اگر انھیں کنٹرول نہ کیا تو سرحد پار کے دشمن ملک اس کا فائدہ اٹھائیں گے اور ان مورکھوں کو ساتھ ملا کر ہمیں ٹف ٹائم دیں گے، مگر آپ کو یاد ہو گا پی-ایم نے ہنستے ہوئے کہا تھا، سرحد پار والوں کا پہلے ہی سب کام ٹھپ پڑا ہے، ان کا اپنا بیڑہ غرق ہے اور ویسے بھی ان کی اتنی پسلی ہی نہیں کہ ہم سے ٹکر لیں۔" آئی-جی نے کہا:

"لیکن جوگیندر کیا تمھیں اب بھی لگتا ہے کہ یہ گیم باہر سے کنٹرول ہو رہی ہے؟"

مکھ منتری دوبے نے منہ میں ٹوتھ پک گھسا کر کہا:

"سر کرنٹ صورت تو اب انٹیلی جنس والے ہی بتا سکتے ہیں، میں گرداری سے بات کرتا ہوں۔" آئی-جی جوگیندر بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے، دیکھا جائے گا لیکن جوگیندر فی الحال تم ذرا اپنے کا ہل ایس-پی کو کہو وہ ان جاہلوں پر آنسو گیس اور تھوڑا لاٹھی چارج وغیرہ کرے تاکہ میں باہر آ جا تو سکوں۔ بلکہ تیز دھار پانی پھینکو فائر بریگیڈ والوں کو بول کے، تاکہ ان گنواروں کے چودہ طبق روشن ہوں۔"

"جی سر جی، میں کہتا ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں سر۔"

"اور ہاں جو گندر رُ کو، یاد آیا پچھلے سال جو باسمتی چاول تم نے بھیجے تھے وہی اعلیٰ قسم کے، ویسے ہی دوبارہ بیس پچیس بوری بھجوادو۔ پھر آج کل مہمان داری، ظہرانے، عصرانے، عشائیے بہت زیادہ کرنے پڑ رہے ہیں ہمیں۔ اپنی اس ٹینیور میں کلچر کو پروموٹ کرنے کا بیڑا بھی میں نے اٹھا رکھا ہے، چاہتا ہوں ہماری ثقافت پھلے پھولے۔"

"جی سر ہو جائے گا، کوئی مسئلہ نہیں۔ اسی ہفتے پہنچ جائیں گے سر سیم چاول۔"

"تھینکس جوگیندر۔"

"مینشن ناٹ سر!"

"سر وہ۔۔۔ میرے تبادلے والی فائل کا ذرا دیکھ لیجیے گا۔۔۔ میں یہیں آپ کی چھتر چھایا میں ہی کام کرنا چاہتا ہوں سر۔"

آئی۔جی جوگندر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں فکر نہیں کرو، میں سب سنبھال لوں گا۔"

"تھینک یو ویری مچ سر! سو نائس آف یو!"

مکھ منتری دوبے 'اِٹس اوکے' کہہ کر لائن کاٹ دیا۔ سامنے پڑے ڈرائی فروٹ کی ایک مٹھی ہاتھ میں پکڑ کر ایک ایک دانہ چبانے لگا۔

"شرما یہ پکڑو فون۔"

مکھ منتری دوبے نے شرما کو فون تھمایا۔ پی۔اے شرما نے بھاگ کر فون پکڑا۔

"آدھ گھنٹہ خراب کر دیا میرا۔ آج کی میری گولف کے سارے پروگرام کا ستیاناس کر دیا۔ لگتا ہے شوگر بھی ڈاؤن ہو رہی ہے میری۔ شرما فریش جوس دو مجھے ذرا۔"

"جی سر جی۔ سر تازہ گنے کا جوس پلاؤں آپ کو؟"

پی۔اے شرما نے مکھ منتری کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔

"ہاں لاؤ اور تھوڑی تازہ بیریز اور انگور بھی لاؤ تاکہ میری توانائی واپس آسکے۔"

"جی سر، ابھی منگواتا ہوں سر۔۔۔ ابھی فوراً منگواتا ہوں۔۔۔ ایک منٹ میں ابھی سب

آتا ہے۔"

"دیال، پردیپ، موتی لال مہاراج، شیوانی، علی کہاں مر گئے سب؟"

پی-اے شرما نے سب ملازموں کو آوازیں دینی شروع کیں۔

سارے ملازم ملزموں کی طرح لائن بنا کر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ پی-اے شرما نے سب کو ڈانٹا اور کہا کہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ان کے دوست جج گپتا جی بھی دو بجے لنچ کے لیے آرہے ہیں۔ تازہ مکئی کی روٹیاں اور تازہ سرسوں کا ساگ بنانا ہے اور کریلے اور تازہ توڑی ہوئی بھنڈی کی ترکاری بھی بنانی ہے۔"

"جی شرما جی، سب سامان تازہ، فریش سبزیاں، ساگ، مچھلی، مرغ، گوشت منگانے کے لیے جگدیپ صبح سویرے ہی جا چکا ہے اور ہم دل لگا کر بھوجن تیار کریں گے۔ کلدیپ جی کی پسند کا، اصلی گھی میں۔"

"لیکن کلدیپ جی تو نہیں آرہے۔"

"گپتا جی بولا ہے میں نے... گپتا جی... کان بند ہیں کیا تم لوگوں کے؟ کان کھول کر سن لو، انھیں صرف اصلی ناریل کے تیل میں پکا بھوجن پسند ہے۔ اور ماس مچھلی، گوشت، انڈہ ونڈہ کچھ نہیں لیتے وہ، پرنتو اپنے صاحب کو ڈنر میں یہ سب دے دینا۔ ان کا ٹوٹل ویج بوجھن ہو، نان ویج کوئی چیز ٹیبل پر نہیں پروسنی۔ کوئی غلطی نہیں چاہیے آج!"

"ٹھیک ہے شرما جی، میں سمجھ گئی۔" شیوانی نے یک دم درمیان میں ہی جلدی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے ٹھیک ہے، جلدی سب کام پر جاؤ بس اب۔"

اس دوران باہر ہاو ہو کی اونچی اونچی آوازیں پھر سنائی دینے لگتی ہیں۔ کوئی کسان سپیکر پر تقریر کر رہا تھا۔

"اس ملک میں اگر ہم زمین میں ہل نا جوتیں، بیائی نہ کریں تو اس ملک کے محلوں میں رہنے والے سب امرا بھوکے مر جائیں۔ تب انھیں پتا لگے گا کھیتی باڑی کے بغیر یہ دیش دس

دن بھی نہیں چل سکتا۔ صرف کمپیوٹر پروگرام پیچ کر اپنے بچوں کو برگر کتنے دن کھلالو گے؟ اناج تو ہم اگاتے ہیں ہم۔۔۔ہم!"

مجمع میں پھر شور و غوغہ اور نعرے بازی شروع ہو گئی۔

مکھ منتری نے گنے کے جوس کا ایک گھونٹ پی کر ہنستے ہوئے کہا۔ "سن رہے ہو شرما، اِن مورکھوں اجڈوں کی باتیں؟ بندہ پوچھے جاہلو، بے وقوفو، اندھو، مر تو تم خود رہے ہو اس ملک سے غداری کر کے شمن ملک کی کٹھ پتلی بن کر خود بھوک کاٹ رہے ہو۔ آئے دن خودکشیاں کرتے ہو کام چور و اور الزام دوسروں کو دے رہے ہو۔"

"جاہل، مورکھ، بے وقوف، دیش دروہی کہیں کے۔"

مکھ منتری نے بلغم تھوک کر کہا۔

پی-اے شرما مکھ منتری کی طرف دیکھتے ہوئے زبردستی اپنے پورے دانت نکال کر زور سے ہنسا اور بولا۔ "بالکل ٹھیک بات کی سر آپ نے، سولہ آنے ٹھیک بات ہے آپ کی۔ بس سر کیا کریں تعلیم کی کمی ہے بہت ہمارے ملک کے اس حصے میں سر، ورنہ اگر ان جاہلوں میں عقل ہوتی تو کھیتوں میں کام کرتے اور اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کی فکر کرتے نہ کہ یہاں بیٹھ کر بھوک ہڑتال کی ایکٹنگ۔"

"ایکٹنگ؟"

مکھ منتری دوبے نے ایک انگور منہ میں ڈالتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں سر، جی ہاں!"

پی-اے شرما جھٹ سے بولا۔

"مجھے ایک اندر کے بندے سے پتا لگا، وہ جو دو کسان بھوک سے مرے ہیں نہ سر، وہ پہلے سے ہی بیمار تھے سر، بلکہ ان میں سے ایک بھشن لال تو بیماری سے تنگ آکر ایک بار خودکشی کی بھی کوشش کر چکا تھا سر۔ وہ تو رسی ٹوٹ گئی اور دو سالہ بچ گیا۔ سر میں نے یہ بات ان سب رپورٹرز کو بتا دی ہے جن کو آپ کی طرف سے ماہانہ خرچ ملتا ہے۔ سب کل اس جھوٹ کا

پردہ فاش کردیں گے کہ یہ کسان کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں دشمن دیش کی اور ان کو کوئی ایسا ویسا مسئلہ نہیں ہے سر، جب بھلا چنگا ہے اور وہ دونوں بندے بھی بھوک سے نہیں، اپنی طبعی موت مرے ہیں۔"

پی-اے شرمانے راز دارانہ لہجے میں مکھ منتری کو بتایا۔

"ہمم، ہوں ں ں۔ ہمم م م م م۔ تو یہ ڈرامے چل رہے ہیں۔ گڈ گڈ، شرما ٹھیک کیا تم نے، بالکل ٹھیک ہے۔ گڈ، ویری گڈ!"

"ان دیش دروہیوں، ان اپنی دھرتی کے دشمن، جاہلوں، مورکھوں سے ایسی ہی توقع کی جاسکتی ہے کہ طبعی موت مرے ہوؤں کو بھی شہید بنالیں۔"

پی-اے شرما پھر دونوں باچھیں کھول کر زبردستی دانت نکال کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس دوران پھر لاؤڈ سپیکر سے ایک نئی تقریر شروع ہوئی۔

"بھائیو جاگو اور آج سے وچن لو۔ جب تک ہمارے جائز مطالبات پورے نہیں ہوتے نہ ہم ان منتریوں کی شوگر ملوں کو اپنا محنت سے اُگایا گنا دیں گے نہ ان کی آٹے کی ملوں کو گندم، نہ کپڑے کی فیکٹریوں میں کپاس اور نہ ان آڑھتیوں کی سبزی منڈی میں کوئی تازہ سبزی اور نہ ہی کوئی پھل اتارا جائے گا۔"

منتری جی نے پی-اے شرما کی طرف دیکھا اور زور سے قہقہہ لگایا۔ "سنا شرما تم نے۔ مجھے یہ رنویر کی آواز لگ رہی ہے، وہی ہے نا یہ جو پچھلے سال اپنی سائیکل پر میری پراڈو کے نیچے آتے آتے بچا تھا، وہی جاہل ہے نا یہ؟"

"کتنے دن یہ مہاشہ میرے پاس 'نوکری دے دیں!' بولنے آتا رہا مگر کون اِن اَن پڑھوں کو کام دے سکتا ہے، نقل کر کے پاس ہو جاتے ہیں بس۔"

مکھ منتری نے کان میں انگلی ڈال کر زور سے گھماتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں سر، مجھے بھی یہ وہی لگ رہا ہے۔ جب سے اس کے باپ نے حالات سے تنگ

آکر خودکشی کی ہے ناسر، اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے سر۔ بالکل جھلا سا ہو گیا سر، پاگل ہے سر، پاگل۔ دفعہ کریں اس کو سر۔"

"ہاں شرما، بندہ پوچھے ان مورکھوں سے اگر یہ فصل نہیں اگائیں گے تو خود کیا ان کے لیے من و سلویٰ اترے گا سورگ سے؟ ان پاگلوں کو یہ بھی نہیں پتا جتنی گندم یہ سال میں پیدا کرتے ہیں اتنی تو امیر ملک ہر چھ ماہ بعد سمندر میں گرا کر پھینک دیتے ہیں۔ ہم ان سے امداد میں لے لیں گے اگر یہ نہیں اگائیں گے چاول باسمتی تو اور کہیں سے لے لیں گے۔ برابر ملک سے سمگل کا چاول بھی آسکتا ہے اور نہ بھی کھایا تو کیا، دوسرے چاول باہر سے منگا لیں گے۔ مجھے تو جاپانی چاول بہت پسند ہیں، پچھلی دفعہ ٹوکیو گیا تو کھائے تھے۔ کپاس بھی دوسرے ملکوں میں ٹکہ ٹوکری ملتی ہے کوئی محتاجی تھوڑی ہے ہمیں ان کی۔ دوسرے صوبے کے کسان تو ان کی طرح پاگل نہیں ہیں۔ ویسے بھی آج کل ٹیکنالوجی کا دور ہے، ٹیکنالوجی کا!"

"جی بالکل سر، سولہ آنے ٹھیک بات کی سر آپ نے۔ سر بہتر ہو گا آپ آج گولف کی بجائے ایک دو گھنٹے آرام کر لیں۔ جب گپتا جی آئیں گے تو میں آپ کو اٹھا دوں گا۔"

شرما نے مودبانہ انداز میں کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے شرما، میں تھوڑا آرام کرتا ہوں۔ رات کی تھکاوٹ بھی ٹھیک سے نہیں اتری۔ مجھے ایک بجے تک اٹھا دینا۔ اور ہاں اگر آئی۔جی کی کال آئے تو اسے کہنا کہ ایک بجے تک گیٹ کلیئر دکھائی دے تاکہ گپتا جی کو کوئی پریشانی نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے سر، آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گا سر۔ آپ ریسٹ کریں سر، ریسٹ۔"

مکھ منتری دوبے اپنی آرام گاہ کی طرف چل پڑے کہ اتنے میں شیوانی بوکھلائی ہوئی شرما کے پاس آئی۔

"شرما جی، جگدیپ کی کال آئی ہے۔ وہ مین گیٹ سے اندر داخل نہیں ہو پا رہا۔ باہر کسانوں نے اس سے سارا سامان لے کر اسے بھگا دیا ہے۔"

"ہیں۔۔۔ کیا بک رہی ہو؟ اس کے ساتھ تو گارڈ ہوتے ہیں ہمیشہ۔"

"شرما جی وہ بتا رہا ہے کسانوں نے گارڈز کو بھی بھگا دیا ہے۔ گپتا جی نے دو بجے تک آنا ہے، تب تک بھوجن تیار رکھنا تھا سر، مگر نہ تازہ ساگ ہے نہ تازہ مچھلیاں ہیں۔ میں کیا کروں سر؟"

شیوانی نے پریشان لہجے میں شرما سے کہا۔

شرما نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا:

"میں ابھی منحوس ایس-پی کو کال کرتا ہوں۔"

شرما نے کال ملائی۔

"مکیش جی میں شرما بول رہا ہوں، بھئی مین گیٹ تو کلیئر کرو۔ گپتا جی نے آنا ہے ملنے، مکھ منتری جی سے ملنے۔ آئی-جی صاحب نے بتایا ہوگا؟"

مکیش؛ "شرما جی ہم سے جو بن پڑ رہا ہے اس کا پریوگ کر رہے ہیں مگر ابھی تک کسان ہماری بات سننے کو تیار نہیں۔ آئی-جی صاحب اور جنرل پرشاد نے گرو سوامی رام داس جی کو ان اجڈوں سے مذاکرات کے لیے بھیجا ہے۔ وہ آشرم سے نکل چکے ہیں کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں۔ امید ہے سوامی جی کی آگیا کا پالن کریں گے اور گیٹ کلیئر کر دیں گے۔ مگر تھوڑا ٹائم لگے گا، آپ تھوڑا شانت رہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے، ہم شانت ہی ہیں۔ ہمیں کیا ہوا؟" شرما نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

اتنے میں رسویا مہاراج اندر آیا اور بولا:

"شرما جی نمستے۔ شرما جی ہم سے اب اور نہیں ہو پائے گا۔"

"کیا نہیں ہو پائے گا مہاراج؟"

"نہ سبجی ہے، نہ دال، نہ چھلّی بھٹہ، اب آپ ہی بتائیں کہاں سے بنائیں شدھ بھوجن۔ رام رام رام، یہ ساری نحوست ماس مچھی کے کارن ہے اسی لیے ہم نے ای کو صاف بول دیا

رسوئی میں پاؤں نہیں ڈالنے کا۔ مگر آج جب اتنے عرصے بعد گپتا جی کے لیے شد بھوجن بنانے کا تھا تو سامان ایک دو دن پہلے منگانے کا تھانی۔"

"سب گڑبڑ گوٹالہ ہو گیا ہے۔"

"دو بجنے کو ہیں مگر نہ تاجہ ساگ ہے نہ بھٹے، اب ہم کیا بنا پائیں گے بھوجن بغیر سامان کے؟"

مہاراج نے روہانسی آواز میں کہا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے مہاراج، آپ جو بن سکتا ہے وہ بنائیں دو بجے تک۔ مجھے اور بھی بہت کچھ کرنا ہے۔"

مہاراج رونی شکل بنائے چندیا کھجاتا، رسوئی کی طرف چل نکلا۔ اس نے رسوئی کے فریزر میں زمانوں سے پڑے فروزن مکئی کے دانے نکالے اور پانی میں بھگو دیے۔ پاس ہی ایک فروزن آلو کا پیکٹ پڑا تھا جس کی میعاد بھی گزر چکی تھی، اور آلوؤں کے کتلوں کی رنگت کالی ہو چکی تھی، انھیں پانی میں بھگو دیا۔

اس دوران دو بج گئے اور پی-اے شرما مکھ منتری جی کو اٹھانے لگا۔

اٹھتے ہی انھوں نے پوچھا:

"گپتا جی آگئے؟"

"نہیں سر، باہر ابھی حالات ٹھیک نہیں۔ سوامی جی کسانوں کو مت دینے کے لیے باہر آ چکے ہیں۔ کچھ دیر میں گیٹ کی جگہ خالی ہو گی تو ہی کوئی اندر باہر آ سکے گا۔"

اس دوران پھر ایک بندہ لاؤڈ سپیکر پر تقریر شروع کرتا ہے:

"بھائیو! کیوں نہ ہم مکھ منتری دوبے جی کے راج دھون کا گیٹ توڑ کر اندر جائیں اور دیکھیں کہ ان کے رسوئی گھر میں کون کون سی ایسی خوراک اور بھوجن ہے جو ہماری محنت اور ہاتھوں کے بل بوتے پر اگائی گئی ہے، کیوں نہ وہ سب خوراک ہم وہاں سے چھین کر اپنے قبضے میں کریں تاکہ انھیں پتا لگے سمارٹ فونوں اور کمپیوٹروں سے پیٹ کی آگ نہیں بجھتی۔ کیا

خیال ہے بھائیو؟"

یہ سنتے ہی مکھ منتری دوبے اور پی-اے شرما کے ماتھے پر پہلی دفعہ پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔

"شرما فون دینا ذرا، ایس-پی جاہل ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ ذرا آئی-جی کو کال کرو۔ جلدی کرو۔ ابھی فوراً!"

"یہ لیں سر، آئی-جی صاحب لائن پر ہیں۔" شرما نے فون تھماتے ہوئے کہا۔

"جوگیندر، ابھی تک کوئی آیا نہیں۔ یہ جاہل تو اندر آنے کو پر تول رہے ہیں۔ یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ سوامی جی کہاں ہیں؟"

"سر باہر حالات بہت خراب ہیں۔ آپ کہیں محفوظ کمرے میں رہیں۔ دو کلو میٹر تک سب کسان ہی کسان ہیں۔ پولیس بے بس ہے۔ ہم آپ کے دروازے تک کم سے کم بھی تین گھنٹے سے پہلے تک نہیں پہنچ سکتے۔ گرو سوامی جی ان مورکھوں کو سمجھا رہے ہیں مگر ان کو شاید گولی کی زبان سمجھ آتی ہے۔"

"ہیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم جوگیندر؟"

"سوری سر، میں نے جنرل پرشاد کو بھی ہیلپ کے لیے بول دیا ہے۔ وہ دو گھنٹے میں ہیلی کاپٹر پر کسی کو آپ کی مدد کے لیے بھیج رہے ہیں۔ مجمع بہت زیادہ غصے میں ہے سر، انھیں روکنا آسان نہیں ہوگا سر۔ سر آپ اپنی سیفٹی پر فوکس کریں سر۔"

"جوگیندر۔" آئی-جی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ہیں۔۔۔ یہ یکایک کیا ہو رہا ہے، کل تک تو سب نارمل تھا۔۔ یہ کیا بکواس ہے؟" مکھ منتری نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"جی سر بس آج صبح پانچ بجے سے یہ سب نا جانے کیسے ریڈ ایریا کراس کر کے آگے آپ کے راج دھون تک پہنچ گئے۔ اب انھیں پیچھے دھکیلنے کے لیے فوج ہی کچھ کرے تو کرے، ہمارے بس میں اب کچھ نہیں رہا سر۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔"

"آواز نہیں آ رہی آپ کی سر، ہیلو ہیلو ہیلو۔۔۔"

"جوگیندر، جوگیندر، جوگیندر۔۔۔"

اور لائن ڈراپ ہو گئی۔

"شرما مجھے جلدی سے میرے کمرے میں کہیں چھپا دو، اگر یہ سب اندر آ گئے تو ہم سب کی خیر نہیں۔۔ جلدی چلو۔۔۔"

"سر آپ فکر نہیں کریں، میں نے تینوں گارڈز کو کہہ دیا ہے وہ اپنی سیون ایم ایم بندوقیں تیل دے کر لوڈ کر کے رکھیں۔ اگر کوئی گیٹ کراس کرنے کی کوشش کرے، فائر کھول دیں۔"

"شرما، ان کی پرانی گھوڑے والی بندوقیں پندرہ سال پرانی زنگ آلود صرف ڈرانے والی ہیں بس، ان سے کچھ نہیں رکنے والا۔ تم بس مجھے کہیں چھپاؤ، جلدی۔ اندر چلو بس۔۔"

پی-اے شرما کو اپنی بھی فکر لگ جاتی ہے اور ہنسی ونسی سب رفو چکر ہو کر اس کی جگہ چہرے پر ہوائیاں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔

پی-اے شرما مکھ منتری دوبے کو ایک کمرے کی الماری میں چھپا کر خود مالی کے حلیے میں باغ کو پانی دینے لگ گیا۔

تھوڑی دیر میں آئی-جی کی کال آتی ہے کہ کسانوں سے مذاکرات کامیاب ہو گئے ہیں۔ سوامی جی کا لالی پاپ اپنا کام کر گیا۔ سارے بے وقوف واپس اپنے اپنے گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔

شرما فوراً یہ خوش خبری مکھ منتری جی کو سنانے کے لیے ان کی آرام گاہ میں گھستا ہے۔ مکھ منتری جی ایک الماری میں دبکے بیٹھے ہوتے ہیں۔

"سر، خطرہ ٹل گیا سر، کسانوں کو بھگا دیا ہے سر ہمارے جوانوں نے، سر باہر نکل آئیں، سر۔"

مکھ منتری باہر نکلتا ہے۔

ہکلاتی زبان کے ساتھ کہتا ہے:

"یہ سب بھگوان کی کرپا ہے، جیت ہمیشہ سچ کی ہی ہوتی ہے۔"

"جی ٹھیک کہا سر آپ نے۔"

اتنے میں پتا لگتا ہے گپتا جی پہنچ چکے ہیں۔

گپتا جی اور مکھ منتری ڈاینِنگ ٹیبل پر بیٹھے گپ شروع کرتے ہیں۔ ٹیبل کے بیچ ہاتھی دانت کے بنے سیب اور انگور پڑے ہیں۔

بات چیت کا مرکز کسانوں کی جاہلیت ہوتی ہے۔

اتنے میں ویٹر ڈرتے ڈرتے آج کا بنا کھانا ٹیبل پر پروستا ہے جس کا پہلا لقمہ لیتے ہی گپتا جی اسے تھوک دیتے ہیں۔

مکھ منتری زور سے آواز لگاتے ہیں۔ "یہ کیا باسی بدمزہ ترکاری بنائی ہے آج تم لوگوں نے؟"

پی-اے شرما بھاگا بھاگا رسوئی کی طرف دوڑ لگاتا ہے۔

Poison

ایمبولینس کی آوازوں سے پورا شہر گونج رہا تھا۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا آخر ہوا کیا ہے۔

ٹی وی آن کرنے پر پتا لگا کہ پورے شہر میں بھاری تعداد میں اموات ہوئی ہیں۔ زیادہ تر لوگ گھروں میں مردہ حالت میں پائے گئے تھے جنھیں آج صبح سے ایمبولینسیز ہسپتالوں میں پہنچا رہی تھیں اور یہ سلسلہ صبح سے شام تک بغیر رکے چلتا رہا تھا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے حکومت نے شہر بھر میں ایمرجنسی نافذ کر دی تھی۔

اب تک شہر کے مختلف ہسپتالوں میں سترہ ہزار پانچ سو ڈیڈ باڈیز لائی جا چکی تھیں اور یہ تعداد ہر اگلے گھنٹے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

جتنے بھی مردے اسپتالوں میں لائے گئے تھے بظاہر ان کی موت کی وجہ ایک جیسی تھی۔ جن ڈیڈ باڈیز کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ان میں ایک خاص قسم کے زہر کے اثرات بھی دیکھنے میں آئے تھے۔

ڈینیل کرائم سپیشل برانچ میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ اور اس کی ٹیم پورے معاملے پر نظر رکھے ہوئی تھی۔ مگر ان کی اپنی ٹیم میں سے آج رات ایک کانسٹیبل کی اس کے گھر میں پُراسرار موت نے ان کے ڈیپارٹمنٹ کو بھی ہلا کے رکھ دیا تھا۔

ان حالات میں عوام کو ہر طرح کے بازاری کھانوں سے قطعی طور پر دور رہنے کے

اعلانات کیے جارہے تھے کیوں کہ ابتدائی تحقیقات میں یہی بات سامنے آئی تھی کہ جتنے بھی لوگ مارے گئے ہیں، ان کے جسم میں انتہائی خطرناک اور کمیاب زہر موجود تھا اور یہی زہر ان کی موت کی وجہ بنا۔ اس لیے ان حالات میں یہ بے حد ضروری تھا کہ عوام کو ہر طرح کے کھانے پینے سے جتنا ممکن ہو باز رکھا جائے تاوقتیکہ حکومتی ادارے شہر میں سپلائی کیے جانے والا پانی اور تمام کھانے کی اشیا کو مکمل چیک کر لیں کہ یہ زہر آخر کیسے اور کس خوراک کی وجہ سے ان کے جسم میں داخل ہوا۔

ڈینیل نے پہلے شہر کے واٹر سپلائی اداروں کا دورہ کیا۔ وہاں تفصیلی معائنے سے پتا لگا کے ان کا نظام انتہائی تسلی بخش تھا اور پانی کو دن بھر ہر خاص وقفے کے بعد جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ہر طرح کے مہلک جراثیم اور بکٹیریا سے پاک کر کے شہر میں چھوڑا جاتا ہے، اس لیے پانی کے ذریعے زہر کا پھیلنا تقریباً ناممکن امر تھا۔ محکمہ واٹر سپلائی کے ہیڈ نے ڈینیل کو بتایا کہ اگر یہ زہر پانی کے ذریعے پھیلتا تو اموات اس سے بھی زیادہ ہوتیں بلکہ شاید اب تک ہم سب بھی زندہ نہ ہوتے۔

اب ایک لمبی لسٹ تھی، بازاری کھانوں اور باقی کھانے پینے کی چیزوں کی جن کی جانچ ہونا باقی تھی۔ تقریباً ہر بڑی کمپنی خود ہی اس خوف کا شکار تھی کہ کہیں وہ نادانستہ طور پر ان اموات کی ذمہ دار نہ ہو۔ سب کمپنیز کی اپنی اپنی پراڈکٹس کو جن میں ڈبل روٹی، انڈے، دودھ، دہی، جوس، پھل، سبزیاں اور اس نوعیت کی بے شمار کھانے کی اشیا تھیں، انھیں مختلف آزمائشوں اور جانچ پڑتال سے گزارا جارہا تھا مگر کسی بھی کھانے پینے کی چیز میں اس خاص طرح کے زہر کی نشان دہی نہیں ہو پارہی تھی۔ البتہ ایسی کئی کھانے کی چیزیں جن پر جب ٹیسٹ کیے گیے تو وہ صحت کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوئیں جنھیں کھانے سے کینسر اور دوسری بیماریاں لگنے کے خدشات بہت زیادہ تھے۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود کھانے کی کوئی ایسی چیز نہ مل سکی تھی جس میں وہ خاص طرح کا مہلک زہر بھی شامل ہوتا، جس کی وجہ سے لوگ تیزی سے مر رہے تھے۔

میڈیا میں ان اموات کو لے کر ایک نیا ہیجان پیدا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ اسے حکومتی اداروں کی ناکامی کہہ رہے تھے۔ تین دن گزر جانے کے باوجود اب تک زہر کیسے انسانوں کے جسم میں منتقل ہو رہا ہے، کوئی اصل وجہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ ہر شخص ڈرا سہا تھا۔ کوئی بھی چیز کھانے سے پہلے اس میں زہر کے ہونے نہ ہونے کا ٹیسٹ کیا جا رہا تھا مگر زہر کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔

ڈینیل کے پورے کیریر میں ایسا کوئی مرڈر کیس نہیں تھا جو اس نے حل نہ کیا ہو اور یہاں اب تک اٹھائیس ہزار اموات تین دن میں ہو چکی تھیں اور ان سب کو زہر دیا گیا تھا۔ ڈینیل پچھلی تین راتوں سے ٹھیک طرح سے سو نہیں پا رہا تھا۔ اس کے لیے یہ اموات ایک چیلنج بن چکی تھیں۔ اسے کسی بھی حال میں اس کیس کا سراغ لگانا تھا۔ وہ ساری رات مختلف زاویوں سے سوچتا رہا۔ اس کی بیوی کلوزی نے اسے سونے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اگر وہ اپنی نیند پوری نہیں کرے گا تو زیادہ فوکس نہیں کر پائے گا۔

صبح جب ڈینیل ایمبولینس کی آوازوں سے اٹھا تو اس کے ذہن میں ایک نئی حکمتِ عملی تھی۔ اس نے چار ایسے گھروں کو چُنا، جہاں ابتدائی اموات ہوئی تھیں۔ وہ پہلے مسز رانا کے گھر پہنچا جن کے خاوند کی موت تین دن پہلے ہوئی تھی۔ اس نے ان سے کچھ سوالات کیے جو کچھ یوں تھے:

"مسٹر رانا اپنی موت سے ایک رات پہلے کس کس سے ملے؟ کیا کھایا؟"

"جی اس سوال کا جواب میں پرسوں سے کئی بار دے چکی ہوں۔ کچھ خاص نہیں، ہم نے اپنے روزمرہ کا کھانا کھایا اور پھر ہم اپنے اپنے بیڈ روم میں چلے گئے۔ کھانے کا ٹیسٹ بھی کچھ لوگ پرسوں کر کے گئے تھے اور انھوں نے اسے کلیئر کہا تھا۔"

"تو کیا آپ اکٹھے نہیں سوئے تھے؟" ڈینیل نے پوچھا۔

"جی نہیں، وہ اوپر کی منزل میں دوسرے کمرے میں سوتے تھے۔ دیر تک کتب بینی کیا کرتے تھے۔"

"اچھا۔" ڈینیل نے کہا۔

"کیا آپ بتا سکتی ہیں مرنے سے ایک دن پہلے وہ کہاں گئے یا کیا کچھ خریدا؟" ڈینیل نے پوچھا۔

"جی بس وہ عام ضروریات کی چیزیں ہی لائے تھے، کھانے پینے کی۔ ان سب کی تفصیل میں پہلے دے چکی ہوں اور ان کے ٹیسٹ بھی ہو چکے ہیں اور وہی چیزیں میں نے خود بھی استعمال کیں، کھائیں بھی۔"

"کیا وہ چیزیں آپ مجھے پھر بتا سکتی ہیں؟"

"جی، بٹر تھا، بریڈ جام تھا، جوس کا ایک ڈبہ تھا، انڈے تھے۔ بس اسی طرح کی چیزیں تھیں۔"

"اسی طرح کی چیزیں؟" ڈینیل نے زور ڈال کے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"کیا کچھ اور بھی تھا جو آپ بھول رہی ہیں؟"

"ہمممم نہیں۔"

"شاید ٹوائلٹ ٹشو تھے جو اوپر ان کی ٹوائلٹ میں استعمال ہوتے ہیں۔" مسز رانا نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"اچھا۔" ڈینیل نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"کیا وہ اپنی پسند کا کوئی سنیک یا چاکلیٹ وغیرہ اپنے ساتھ اپنے کمرے میں رکھتے تھے، لیٹ نائٹ کھانے کے لیے؟"

"جی نہیں۔ وہ رات گئے کچھ بھی نہیں کھاتے تھے اور سنیک یا ایسی چیزیں بھی بالکل نہیں لیتے تھے۔"

"ٹھیک۔" ڈینیل نے کہا۔

ڈینیل نے مسز رانا سے اجازت مانگی اور باہر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے متاثرہ

شخص کے گھر کے پتے کو نیوی گیشن میں ڈالا اور اس طرف روانہ ہو گیا۔

گاڑی چلاتے ہوئے سارا وقت وہ مسز رانا سے ہوئی بات چیت کو ذہن میں دہراتا رہا کہ ذہن میں کچھ کلک ہو مگر کوئی بھی سراغ اس کے ذہن میں نہ اُبھر سکا۔ مسز رانا کے گھر کی تمام کھانے کی اشیا کا جائزہ لیا جا چکا تھا بلکہ پورے شہر کی تمام کھانے پینے کی اشیا کا جائزہ لیا جا چکا تھا۔ یقیناً کچھ ایسی بات تھی جس کی طرف کسی کا ذہن نہیں جا رہا تھا، وہ کیا ہو سکتا ہے؟ اچانک ڈینیل کو زور کی چھینک آئی۔ وہ ایک ہاتھ سے سٹیرنگ کو تھامے ڈیش بورڈ کے باکس سے ٹشو نکال کر ناک پونچھنے لگا۔

اچانک اس کے ذہن میں مسز رانا کی وہ بات گونجی، 'کچھ خاص نہیں، ٹوائلٹ ٹشو جسے وہ اپنے اوپر کی ٹوائلٹ کے لیے لے گئے تھے۔'

ڈینیل نے تیزی سے گاڑی گھمائی اور برق رفتاری سے مسز رانا کے گھر کی طرف واپس ہو لیا۔

ڈینیل وہاں پہنچا اور دروازے پہ لگی گھنٹی بجائی مگر مسز رانا نے دروازہ نہیں کھولا۔ دروازہ کے ہینڈل کو دیکھا تو وہ کھلا تھا۔ ڈینیل اندر گھسا۔ اندر سے ویکیوم کلینر کی آواز آ رہی تھی۔ شاید مسز رانا اس وجہ سے گھنٹی کی آواز نہ سن سکی تھیں۔

آواز اوپر کی منزل سے آ رہی تھی۔ ڈینیل جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھا اور اوپر پہنچا۔ دروازہ کھولا تو مسز رانا ٹوائلٹ میں داخل ہو رہی تھیں۔ ڈینیل نے جمپ لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ مسز رانا اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئیں۔

ڈینیل نے مسز رانا کو کہا:

"گھبرائیں نہیں۔ کیا میں وہ ٹوائلٹ ٹشو لے سکتا ہوں؟"

ڈینیل نے پھولی سانس کے ساتھ پوچھا۔

"کیا یہ وہی ٹوائلٹ ٹشوز ہیں جو مسز رانا نے ایک دن پہلے لیے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا نیچے بھی ان میں سے کوئی ہے؟"

"نہیں، میں بالکل دوسری طرح کے ٹشوز استعمال کرتی ہوں۔"

"جی بہتر۔ میں انھیں لے جا رہا ہوں لیب ٹیسٹ کے لیے۔"

"جی ضرور۔" مسز رانا نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ڈینیل نے فوراً اپنے ڈیپارٹمنٹ کو کال کی کہ ان خاص کمپنی کے ٹشوز کی فروخت کو فوری طور پر بند کیا جائے تاوقتیکہ ٹیسٹ کا نتیجہ نہ نکل آئے۔

ڈینیل سیدھا لیب پہنچا اور ٹوائلٹ ٹشو کا لیب ٹیسٹ کیا گیا۔ نتیجہ میں پتا لگا کہ اس میں خاص طرح کے زہر کی بھاری مقدار موجود ہے جو جسم کے نازک حصوں پر چھونے سے جسم میں آسانی سے سرایت کر سکتی تھی اور سو فی صد یہ ٹشو پیپر ہی ان تمام اموات کے ذمہ دار تھے۔

ڈینیل نے اس خبر کو صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ اور انٹیلی جنس ایجنسیز کی حد تک رکھا، مقصد یہ تھا کہ اس جنونی قاتل کو پکڑا جا سکے جو ان اموات کا ذمہ دار تھا۔

ابتدائی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ اس خاص کمپنی کے ٹشوز بیرون ملک سے درآمد کیے جاتے ہیں اور جس ملک سے یہ منگوائے جاتے ہیں وہاں کی عوام میں اس ہمسایہ ملک کے لیے کچھ زیادہ اچھا تاثر نہیں تھا۔ بہت زیادہ امکان تھا کہ یہ عمل دہشت گردی کی ایک منظم کوشش کا نتیجہ ہو۔

ڈینیل اپنی ٹیم کے ساتھ غیر سرکاری سیکرٹ مشن پر ہمسایہ ملک پہنچا اور اس فیکٹری میں بھیس بدل کر پہنچا۔ وہاں سے جو ٹشو پیپرز کے نمونے اسے ملے، ان کے ٹیسٹ میں اس قسم کے کسی زہر کا کوئی اثر نہیں تھا۔

اگلے مرحلے میں وہ اس کھیپ تک پہنچا جو ایکسپورٹ کی جانے والی تھی۔ ان کے نمونوں کو چیک کرنے پر علم ہوا کہ ان میں زہر کی مقدار شامل تھی۔

اس کا یہی مطلب تھا کہ یہ ایک بنا بنایا منصوبہ تھا مگر اس کے پیچھے کون تھا، یہ جاننا بے

حد ضروری تھا۔

پانچ دن کی مستقل ریکی کے بعد ڈینیل اس شخص تک پہنچ گیا جس کے دماغ نے یہ گھناؤنا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ شخص اسی فیکٹری میں فورمین کے عہدے پر فائز تھا اور ریڈیکل سوچ رکھنے والا انسان تھا اور خود قوم پرستی کے زہر کا شکار تھا۔ اس پاگل جنونی شخص نے ڈارک ویب کی مدد سے اس مہلک زہر کی بھاری مقدار ذخیرہ کرلی تھی جسے یہ ٹشو پیپر کی پیکنگ کے دوران مکس کر دیتا تھا۔ بظاہر دیکھنے میں ایک جیسے نظر آنے والے ٹوائلٹ ٹشوز مہلک زہر میں ڈوبے ہوئے بن جاتے تھے جو گیلا ہونے کی صورت میں دورانِ طہارت جسم میں اتنی زہر کی مقدار پہنچا دیتے تھے جس سے انسان کی موت کچھ دیر میں واقع ہو سکتی تھی۔

ڈینیل نے کسی طرح فیکٹری میں اپنے نام کے داخلے کا پاس بنا لیا تھا۔ رات کی ڈیوٹی میں جب وہ خبیث فورمین زہر کے ڈرم ایک چھوٹے فوک لفٹر میں فیکٹری میں لایا تو ڈینیل بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔ جونہی وہ ڈرم اس آمیزے میں انڈیلنے لگا جن سے وہ ٹشوز تیار ہونے تھے، ڈینیل نے اس پر پستول تان لی اور ہاتھ اوپر کرنے کو کہا۔ اس نے وہ ڈرم جو انڈیلنے کے لیے پکڑا ہوا تھا، چھوڑ دیا جو سیدھا آمیزے میں جا گرا۔

"تم انسان کہلانے کے لائق نہیں۔" ڈینیل نے اسے گھورتے ہوئے غصے سے کہا۔

اس نے ایک گھٹیا مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "تم یقیناً ہمسایہ ملک کے باسی ہو۔ تمھارے ملک کے لوگوں کو مارنا ہی میرا مشن ہے۔"

"اور میرا مشن تم جیسے درندوں کو ختم کرنا۔"

اچانک اس نے ڈینیل کی طرف ایک رینچ اچھالا جو اس کے جلدی جھکنے کی وجہ سے کان کے پاس سے گزر گیا۔

ڈینیل نے لڑکھڑاتے ہوئے اس کی طرف فائر کیا جو اس کی ٹانگ پر لگا اور وہ سیدھا زہریلے آمیزے میں جا گرا۔

ڈینیل کامیاب آپریشن کے بعد راتوں رات وہاں سے اپنے ملک واپس پہنچا اور سب

حقیقت بیان کی۔ ڈینیل نے سب کو بتایا کہ اس گھناؤنے عمل کے پیچھے ہمسایہ ملک کا کوئی ادارہ نہیں بلکہ وہاں بسنے والا ایک گھٹیا ذہنی معذور درندہ صفت انسان تھا۔

چونکہ اس دوران دونوں ممالک اس سانحے کی وجہ سے جنگ کے دہانے پر پہنچ چکے تھے، اگلے دن ہمسایہ ملک کے سفیر کو دفتر خارجہ طلب کیا گیا اور اس مسئلہ پر سوالات کیے گئے۔ ڈینیل کو اس کی بہترین سراغ رسانی پر قومی اعزاز سے نوازا گیا اور اسے ملکی انٹیلی جنس ایجنسی میں اعلیٰ عہدے پر ترقی بھی دی گئی۔

چمگادڑ اور تتلی!

کل باغ میں ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھی چمگادڑ اور تتلی پر نظر پڑی۔ چمگادڑ تتلی کو رازداری سے کچھ سمجھا رہی تھی۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ وہ تتلی کو کہہ رہی تھی:

"اتنا بن سنور کر ان رنگ دار بدصورت پروں کے ساتھ اڑنا چھوڑ دے ورنہ کسی دن تیرے سارے رنگ ہوا اتار ڈالے گی اور تُو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ میری مان اور میرے ساتھ چل، خاموشی سے اندھیری رات میں اُڑ کے دیکھ ویرانوں میں۔ تو کیا جانے کیا مزہ ہے اجاڑ درختوں پر الٹا لٹک کر آسن کرنے میں۔ ان فضول برے بھرے پیڑوں پھولوں سے میل جول ترک کر دے۔ تُو نہیں جانتی بدصورت پھول بڑے بے وفا ہوتے ہیں اور صرف چند دن کے ہی مہمان ہوتے ہیں۔ ویرانوں میں گھپ اندھیری راتوں میں اڑنے سے تیرے پر بھی مرے جیسے خوبصورت چمکدار بن جائیں گے اور تیری شخصیت میں بھی مجھ جیسا رعب و دبدبہ آ جائے گا۔ ان بدنما بدصورت پھولوں کے بدمزہ رس کو چھوڑ، آ میں تجھے شیریں خون کے جام پلاؤں۔ ایسا امرت جو تُو نے اس سے پہلے نہ چکھا ہو گا۔"

تتلی حیرانی سے چمگادڑ کی سب باتیں سنتی رہی اور پھر کچھ سوچ کے بولی۔

"چمگادڑ بہن تیری سب باتیں تیری اپنی نظر سے ضرور ٹھیک ہوں گی۔ پر تیری دنیا

اور میری دنیا میں بہت فرق ہے۔ میرا ایک لمحہ پرواز تیری پوری زندگی کی اڑان سے بھاری ہے۔ اچھا پہلے یہ بتا؛ کیا تو جانتی ہے کہ تو دیکھ نہیں سکتی؟ جن پیڑوں اور پھولوں کو تو بدصورت اور بدنما کہہ رہی ہے، وہ تیرے بیابانوں ویرانوں سے اچھے ہیں۔ ذرا آنکھ تو کھول کہ تجھے نظر آئے، کیا اچھا ہے اور کیا برا۔"

چمگادڑ غصے سے کانپنے لگی اور بولی:

"چل چل، دو دن کی مہمان تتلی۔"

تتلی بولی:

"جا جا، عقل کے اندھوں کی سلطان چمگادڑ۔"

اور وہ دونوں پھر سے اپنی اپنی دنیا میں اڑ گئیں۔

دوسری شادی کا بخار

مردوں میں پینتالیس سے ساٹھ کی عمر کے بیچ دوسری شادی کا مرض اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ یہ مرض چالیس کی دہائی میں سر اُٹھانا شروع کرتا ہے اور ساٹھ کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اکثر مردوں کا ستیاناس کرتے ہوئے انھیں کہیں کا نہ چھوڑتے ہوئے کسی وبا کی طرح اگلے مرد میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی بھی ایسے ہی ایک مریض مرد کی ہے جو دوسری شادی کے مرض کا شکار ہوا مگر تمام تر کوششوں کے باوجود دوسری شادی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور تنگ آکر ساٹھ سال کی عمر میں اس نے رشتے کروانے کا ایک دفتر کھول لیا۔

آیئے ملتے ہیں جناب 'آغا سبحانی دوسری شادی والے' سے۔ آپ اپنے علاقے کے معززین میں شمار ہوتے ہیں۔ سن مبارک پینسٹھ کے قریب ہے مگر شکل اور حلیے کہیں سے بھی پچاس سے زیادہ کے نہیں دکھتے۔ کوئی ایسا جمعہ نہیں گزرتا جس میں آپ اپنے بالوں پر گہرا کالا خضاب نہ لگاتے ہوں۔ نہار منہ دونوں رخساروں پر الٹا اُسترا چلا کر تمام سفید بالوں کا قلع قمع کیے بغیر آپ کے نئے دن کا آغاز نہیں ہوتا۔ آگے کے دانتوں کے لیے مخصوص بتیسی زیب دہن کیا کرتے ہیں۔ سوائے گہرے رنگ دار کپڑے کے کسی رنگ کا کپڑا آپ پر نہیں جچتا۔ سفید رنگ کے ہر قسم کے کپڑے سے سخت چڑ ہے۔ حتیٰ کہ جانگیہ، جرابیں اور بنیان بھی صرف سرخ یا نارنگی رنگ کی پہنتے ہیں۔

آپ کے ہر نئے دن کا آغاز صبح پونے آٹھ کے قریب ہوتا ہے۔ رات پونے نو آپ خود کو دنیاوی معاملات سے الگ کر کے چترہار دیکھنے میں بتاتے ہیں۔ نوجوان اداکاراؤں کا ناچ، ٹھمکے، فحش فلمائے ہوئے سین دیکھے بغیر آپ کو نیند نہیں آتی۔

جب ہمارا سن پچاس کا ہوا اور ہم پر دوسری شادی کا بھوت بیماری کی طرح سوار ہوا تو تمام ادھیڑ عمر دوسری شادی کے شوقینوں نے ہمیں علاج معالجے کے لیے 'آغا سجانی دوسری شادی والے' سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ جیسے تیسے پوچھتے پچھاتے ہم 'آغا سجانی دوسری شادی والے' کے دفتر جا پہنچے۔ وہاں پہنچے تو ایک دفتر کے باہر قد آدم بورڈ نظر آیا جس پر ایک مرغ اور چار دانہ چگتی مرغیوں کا جہازی سائز کا ایک پوسٹر آویزاں تھا۔ مجبوراً ایک راہ گیر سے پھر پتا پوچھا کہ یہاں 'آغا سجانی' کا دفتر ہوا کرتا تھا، وہ اب کہاں چلا گیا؟

راہ گیر نے ہمیں پہلے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اپنے سر پر پڑے گومڑ پر ٹکور کرتے ہوئے بولا۔ "یہی تو ہے جہاں آپ کھڑے ہیں۔ وہ دیکھیے ایک لال مرغی کے اوپر چھوٹا سا صاف صاف لکھا ہے "شادی خانہ آبادی دفتر" نیچے پروپرائٹر آغا سجانی دوسری شادی والے بھی لکھا ہے۔"

ہم نے غور کیا تو وہ منحنی سی تحریر ہمیں بھی نظر آگئی۔ معلوم ہوا کہ ہم ٹھیک پتے پر پہنچے تھے۔

راہ گیر نے ہمیں پھر چندیا سے پاؤں تک دیکھا اور ایک آنکھ مارتے ہوئے بولا: "ٹھیک جگہ آئے ہیں حضرت۔ ہمارا اپنا عقدِ سوم بھی آغا سجانی کے طفیل ہی ممکن ہو سکا مگر اب تک پِٹ رہے ہیں پہلی بیگم سے۔ یہ دیکھیے تازہ درگت کا ثبوت۔" سر پر سے ٹکور ہٹا کر راہ گیر عجیب کھسیانے انداز میں ہنسنے لگا۔

ہم نے جھینپتے ہوئے پوچھا۔ "خرچہ کتنا ہوا تھا؟"

جواب ملا۔ "خرچ کچھ زیادہ نہیں۔ دوسری تیسری یا چوتھی شادی کروانا آغا سجانی دوسری شادی والے کا شوق ہے، بس۔ بے چاروں کی اپنی تمنا دل میں رہی نا، اس لیے اپنے

گرد و نواح کے دوسری شادی کے مستحق مردوں کی دوسری و تیسری و چوتھی شادی کروا کر انھیں دلی سکون ملتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔۔۔"

راہ گیر نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔

ہم نے بھی جواباً کہا:

"بس؟"

"بس سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب کوئی فیس ویس نہیں لیتے؟"

ہم نے حیرانی سے زور دے کر پوچھا۔

راہ گیر نے جواب دیا:

"جی حضرت فیس ویس یہی ہے کہ شادی کے بعد کے دس دنوں بلکہ راتوں کے تمام واقعات مکمل جزئیات کے ساتھ انھیں سنانے ضروری ہیں۔ خاص طور پر سہاگ رات میں پیش آئے تمام کر خبت و شیریں واقعات جزئیات کے ساتھ انھیں بتانا معاہدے کی شرطِ اوّل ہے۔"

"معاہدہ؟ معاہدہ کس چیز کا؟"

ہم نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"بھئی آغا سبحانی کی خدمات حاصل کرنے کا اور کس چیز کا معاہدہ! زوجۂ ثانی مفت میں تھوڑی ملے گی! ہاہاہا۔۔۔"

یہ بول کر راہ گیر سر سہلاتا ٹکور کرتا آگے بڑھ گیا۔

ہم نے تھوک نگلا اور کچھ وقفے کے بعد شادی دفتر میں داخل ہونے کا سوچا۔ اندر داخل ہوئے تو سامنے کی دیوار پر جیا پرادا کی مختصر لباس میں کتھک ناچ والی قد آدم تصویر پر نظر پڑی۔ سلمیٰ آغا کا فلم 'نکاح' سے سہاگ رات کے منظر کا لمبا چوڑا پوسٹر جیا پرادا کی تصویر کے دائیں جانب نظر آیا اور بائیں جانب ٹینا منیم کا قد آدم پوسٹر ایک پوری دیوار کو گھیرے

ہوئے نظر آیا۔

بظاہر آغا سبحانی دوسری شادی والے کے بارے میں جیسا ہم نے سنا تھا، ان کا دفتر ویسا ہی دِکھ رہا تھا۔ 'کوئی بھی شادی کا خواہش مند اس دفتر میں بار بار آنا چاہے گا۔' ہم نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

اسی اثنا میں ایک ادھیڑ عمر خاتون کہیں پیچھے کے کمرے سے دوپٹہ ٹھیک کرتی داخل ہوئیں اور ہمیں پوسٹرز دیکھنے میں مگن دیکھتے ہوئے اچانک تڑاک سے پوچھا:

"جی۔۔۔ آپ کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟"

"آپ کا نام؟"

ہم نے یک دم خود کو سنبھالا اور بولے:

"جی ہم سہراب ہیں اور ہمیں آغا صاحب سے ملنا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟"

خاتون نے دوپٹہ سر پر درست کرتے ہوئے چبا کر پوچھا۔

"جی ایک نجی معاملہ ہے؟"

"نجی؟"

"دوسری شادی ہے یا تیسری۔۔۔ یا چوتھی کا ارادہ ہے؟ صاف صاف بتائیں۔"

خاتون نے تند و تیز لہجہ میں ٹو دی پوائنٹ پوچھا۔

ہم نے گھبرا کر کہا: "جی وہی۔۔۔ دوسری کا ارادہ ہے۔۔"

"اچھا اچھا! یہ فارم بھریے پہلے، پھر آپ کی ملاقات کرواتی ہوں آغا صاحب سے۔ ابھی ان کی میٹنگ چل رہی ہے۔"

"جی اچھا۔"

ہم نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

فارم کافی لمبا اور تفصیل طلب تھا جس کی تفصیلات کچھ عجب قسم کی تھیں۔

== دوسری سے چوتھی تک شادی کا فارم ==

پہلی بیوی کا وزن؟

پہلی بیوی کا رنگ؟

پہلی بیوی کا قد؟

پہلی بیوی کا ہاتھ یا مکے کا سائز؟

پہلی بیوی کی سب سے بدمزہ ڈش کا نام؟

پہلی بیوی کی والدہ کی عمر؟

پہلی بیوی کی والدہ پر بیس لفظوں میں نوٹ۔

پہلی بیوی کے اخلاق پر سات سے دس لفظی نوٹ۔

پہلی بیوی کا پسندیدہ پوز۔

پہلی بیوی کا ناپسندیدہ پوز۔

پہلی بیوی کی پسندیدہ گالی۔

پہلی بیوی کے سر درد کے اوقات کار۔

پہلی بیوی کا پسندیدہ لباس۔

پہلی بیوی کا ناپسندیدہ لباس۔

پہلی بیوی کے غصے کا دورانیہ۔

پہلی بیوی کے خراٹوں کی تفصیل۔

پہلی بیوی کی درست عمر (صرف ڈی این اے سے تصدیق شدہ)۔

اور آخری سوال تھا؛

آپ کا پورا نام۔

دستخط

ہم نے تمام ضروری تفصیلات درج کر کے سیکرٹری خاتون کو ہانپتے ہوئے تھما دیں۔
آدھ گھنٹے انتظار کے بعد ایک برقعہ پوش خاتون آغا سجانی کے دفتر سے برقعہ کا نقاب دانت میں دبائے بوکھلائی ہوئی باہر نکلیں اور جلدی سے دفتر سے سسکیاں لیتی باہر نکل گئیں۔
سیکرٹری نے عینک کے اوپر سے ہمیں دیکھا اور ترش انداز میں بولیں:
"اندر جائیے! سہراب صاحب اب آپ کی باری ہے۔"
ہم نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور اندر داخل ہوئے۔ اندر اگر بتی اور عطر کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی۔ سامنے ایک فیروزی رنگ کی ٹیبل تھی جس کے پیچھے رام تیری گنگا میلی کا مندا کنی کا بے حجاب پوسٹر لگا تھا۔ مخالف سمت میں کمی کا نکر اپنے اوپری ہونٹوں پر ایک انگلی رکھے دوسری انگلی سے انجان مخاطب کو بلاوے دیتی نظر آئی۔ فیروزی ٹانگوں والی ٹیبل پر میز پوش انجمن کے بھنگڑے کی تصویر کا بچھا تھا۔
سب کچھ ایک ساتھ دیکھ کر جوشِ جوانی سے ہمیں چکر سا آ گیا۔ آغا سجانی نے ہماری گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے ریموٹ سے چترہار کا بٹن دبا دیا اور ہلکی ہلکی امراؤ جان ادا کی موسیقی چلنے لگی۔

"تو آپ کب تک دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں؟"
آغا سجانی نے یک دم ہماری طرف سوال پھینکا۔
"جی آغا صاحب جتنا جلد ممکن ہو۔ بس زندگی بہت پھیکی ہو گئی ہے۔ حالیہ بیگم سے مزاج نہیں ملتا بس۔ اصل میں وہ ہمیں ٹھیک سے سمجھ نہیں پائیں۔"
ہم نے ایک سانس میں سب کہہ دیا۔
"اور آپ تو ظاہر ہے انھیں اچھی طرح سمجھ گئے تبھی تو ہمارے پاس آئے نا، ہاہاہا۔۔"
آغا سجانی نے ہنستے ہوئے ہمارا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔
"جی حضرت کچھ ایسی ہی بات ہے بس۔"
"تو بس آپ بہت اچھی جگہ آ گئے ہیں۔ اب باقی کا کام ہم پر چھوڑ دیجیے۔ ایسا رشتہ

ڈھونڈیں گے، ایسا رشتہ ڈھونڈیں گے کہ آپ ہمیں تمام عمر ڈھونڈیں گے۔"

"جی۔۔۔؟" ہم نے حیرانی سے کہا۔

"جی ہمارا مطلب کہ آپ اور لوگوں کو بھی ہمارے پاس بھیجیں گے جن کی زندگیاں پہلی بیگم کے حسنِ سلوک سے تنگ آکر جہنم بن چکی ہیں۔"

"اوہ اچھا اچھا۔۔۔ ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔" ہم نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتائیں ہماری دوسری بھابھی اگر برقعہ اوڑھتی ہوں تو آپ کے لیے کوئی مسئلہ تو نہیں؟" آغا سبحانی نے ہماری طرف دیکھ کر متجسس انداز میں پوچھا۔

"جی مسئلہ کیسا حضرت۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہوں بس۔ جوان ہوں، خوبرو ہوں، خوش ذائقہ کھانا بنانا جانتی ہوں اور خود کا ہاتھ ذرا ہلکا ہو اور شوہر کو انسان سمجھتی ہوں۔ بس، ہماری زیادہ توقعات نہیں ہیں۔ آپ سمجھ گئے نا حضرت؟"

ہم نے ہانپتے ہوئے آغا سبحانی سے کہا۔

"جی آپ فکر نہ کریں بالکل۔ آپ کی توقعات کے عین مطابق رشتہ ہے ایک خاتون کا۔"

"خاتون۔۔؟"

ہم نے لقمہ دیا۔

"دوشیزہ، حضور دوشیزہ، میرا مطلب۔۔۔ منہ سے خاتون نکل گیا۔"

آغا سبحانی نے پوری آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

ہماری آنکھوں کی چمک بھی فوراً واپس لوٹ آئی۔ اور پوچھا:

"کیا عمر ہو گی اُن کی؟"

ہم نے "اُن" پر زور ڈال کر پوچھا۔

"بس ینگ سمجھیں حضور، ینگ، بالکل جوان بچی ہے جناب۔"

"اچھا!"

ہم نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"گھرانہ کیسا ہے؟"

آغا صاحب بولے:

"گھرانہ۔۔۔؟ انتہائی شریف۔۔! نیک۔۔! پاسدار گھرانہ ہے حضرت۔ اس چیز کی میری گارنٹی ہے۔"

آغا سجانی نے دونوں ہاتھ میز پوش پر خاص جگہ رکھتے ہوئے کہا۔

"بس ان کی ایک ڈیمانڈ ہے۔"

آغا سجانی نے لہجہ بدلتے ہوئے ہماری طرف دیکھا اور کہا۔

"وہ کیا ڈیمانڈ ہے حضور؟"

"انھیں ایک گھر کم سے کم چھ مرلے کا لڑکی کے نام چاہیے اور لڑکا میرا مطلب آپ کو گھر پر وقت دینا ہوگا۔ خاص طور پر جمعہ، ہفتہ، اتوار نئی دلھن کے ساتھ بِتانے ہوں گے۔"

آغا سجانی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"جی بس اتنی سی بات۔۔؟ یہ تو ان کا حق ہے۔ ظاہر ہے شادی کر رہا ہوں کوئی مذاق تھوڑی ہے۔ اتنا وقت تو دینا ہی ہوگا بلکہ آپ انھیں کہیں، پیر کو چھوڑ کر باقی کے چھ دن میں "اُن" کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

ہم نے مخمور آواز میں کہا۔

"ارے آپ کے تو دونوں گال بالکل سرخ ہو گئے۔"

آغا سجانی نے ہماری طرف دیکھ کر کہا اور ٹیبل بجاتے ہوئے گانا گنگنانے لگے:

"وہ چیز کیا ہے آپ میری گاف لیجیے۔۔۔"

"جی۔۔؟"

ہم نے ان کے بول سن کر انھیں ٹوکا اور بولے:

"جی بس عمر اور شوق کا تقاضا ہے، اس لیے گال سرخ ہو گئے ہوں گے۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ ان موقعوں میں ہو جاتا ہے یوں۔"

ہم نے ہمت جمع کر کے پھر پوچھا:

"اچھا آغا صاحب، اگر تصویر وغیرہ مل جاتی تو بہت اچھا ہو جاتا۔"

"تصویر۔۔۔؟"

آغا صاحب نے حیرانی سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ ہم نے عرض کیا ناں، وہ پردہ دار خاتون ہیں۔۔"

"خاتون؟"

ہم نے ٹوکا۔

"اوہ۔۔۔ ہمارا مطلب دوشیزہ۔"

آغا صاحب بولے۔

"تو ہم انھیں کب اور کس طرح دیکھ سکیں گے؟"

ہم نے منہ پر رومال رکھتے ہوئے پھر پوچھا۔

"بھئی دیکھ لیجیے گا، جلدی کیا ہے۔ جب شادی ہو جائے گی تو کیا منھ دکھائی نہیں ہو گی؟ ویسے ہمارے سامنے جوان ہوئی بچی ہے۔ انتہائی معصوم، انتہائی سادہ طبیعت ہے بچی کی۔ غصہ تو بالکل آتا ہی نہیں۔ بس جی کہنا سیکھا ہے۔ جو بات کہو، جی جی جی اور بس جی۔۔۔"

"ماشا اللہ!"

ہم نے دیدے پھاڑ کر کہا۔

"آج کل کے دور میں ایسی بیویاں چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتیں۔"

آغا سبحانی نے ہماری طرف پھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں بات چلاؤں آگے؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔ لیکن حضرت کچھ نین نقش کے بارے میں بھی اگر پتا چل جاتا۔۔۔ میرا مطلب آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

ہم نے مندا کنی کے پوسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے آغا سجانی سے پوچھا۔

"لو کر لو بات۔ حلیہ شکل و صورت۔۔۔ یہ تو میں بھول ہی گیا۔ کیسے بتاؤں، کیسے بتاؤں۔ہاں۔۔۔یاد آیا۔۔۔ آپ کو رنگیلا اداکار یاد ہے؟"

"جی۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

ہم نے اونچی آواز میں حیرانی سے سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی جی، رنگیلا کے ساتھ جو اداکارہ تھیں نا، جن پر "سب توں سوہنیا" گانا فلم بند ہوا تھا، کیانام تھا۔۔۔ کیا تھا۔۔۔ نام ذہن سے نکل گیا۔ہاں ہاں نشو۔۔۔!"

"نشو۔۔۔"

"بس ان کی کاپی سمجھیں، ڈٹو کاپی ہیں ان کی۔"

"اچھا۔۔۔!"

ہم نے اپنی دونوں باچھیں پوری کھلاتے ہوئے پہلے آغا سجانی کی طرف دیکھا اور پھر کمی کا ٹکر کے پوسٹر کو مخمور آنکھوں سے تکنے لگے۔

ہمیں بہت زیادہ پوسٹر دیکھنے میں منہمک پاکر آغا سجانی نے ہمارا کندھا ہلایا اور بولے:
"تو بس بات پکی سمجھیں۔۔۔ آپ کل آیئے گا۔ میں خاتون۔۔۔ اوہ معاف کیجیے گا لڑکی کے گھر والوں سے آج ہی بات کرتا ہوں۔"

ہم واپسی کے لیے اٹھے اور سیدھے بشیر میوزک سینٹر والے کے پاس پہنچے اور اس سے نشو کے پوسٹر کی درخواست کی۔ بشیر نے کہا۔"پرانی اداکاراؤں کے پوسٹرز آج کل ہمارے پاس نہیں ہوتے۔ نئی اداکاراؤں کے پوسٹرز مل سکتے ہیں۔"

ہم نے اصرار کیا:"نہیں، صرف اور صرف نشو، نہیں تو اور کوئی نہیں۔"

بشیر نے بتایا کہ کرینہ اور نشو میں قدرے مماثلت ہے، وہ لے لیں۔ مجبوراً ہم نے کرینہ کا پوسٹر لیا اور گھر میں اپنی الماری میں لٹکے کپڑوں کے بالکل پیچھے جاکر گوند سے لگا دیا۔

اگلے دو گھنٹے میں ہی بیگم دھلے کپڑے رکھنے الماری میں جا پہنچی اور ان کی نظر پوسٹر پر

جا پڑی۔ وہیں سے چلا کر بولیں:

"اس عمر میں یہ کیا نیا شوق چڑھا ہے؟ خواتین سے بات کرتے ہوئے تو پسینہ آجاتا ہے آپ کو اور چھپ چھپ کر یہ بے حیا پوسٹرز تکنے شروع کر دیے ہیں۔ حد ہوتی ہے بے شرمی کی بھی۔"

"آج ہمارے منھ نہ لگو، نہیں تو۔۔۔"

ہم نے کھنک دار لہجے میں کہا۔

"نہیں تو کیا؟"

بیگم بالکل قریب آکر بولیں۔

"نہیں تو ہم۔۔۔ نہیں تو ہم سو جائیں گے۔"

ہم نے بھی مرجھائی آواز میں کہا۔

"اچھا۔ اچھا۔۔ سو ہی جائیں آج تو بس آپ۔"

سونے کی کوشش کی تو بار بار "سب تُوں سوہنیا، ہائے وے من موہنیا" گیت گاتی نشو اپنی جانب بڑھتی نظر آتی۔ انھی سپنوں میں نہ جانے کب صبح ہوئی تو سیدھے شادی خانہ آبادی کے دفتر جا پہنچے۔ ابھی دفتر کھلنے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔

ارد گرد لوگوں سے گپ شپ کی ٹھانی۔ قریب ہی ایک حجام کی دکان میں گھسے اور پوچھا کہ آغا سبحانی صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے ان کا؟

حجام نے اپنے دونوں کان ایک ساتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"خیال نہیں حقیقت کہو میاں حقیقت۔ ایک نمبر کے فراڈیے ہیں موصوف۔ بھولے بھالے لوگوں کو پھنسا کر ان کی دوسری شادیاں کرواتے ہیں اور انھیں جوتے پڑواتے ہیں اور خود گالیاں سنتے ہیں۔ دو سال پہلے مجھے جھانسا دیا۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون سے میرا نکاح پڑھوا دیا۔ اگلے دن منکوحہ کے سات لڑکوں نے میری وہ گت بنائی کہ دو ماہ تک اُسترا بھی ٹھیک سے نہ پکڑ پاتا تھا۔ اب تک کئی لوگوں کی قلمیں کاٹتے کاٹتے کان کاٹ بیٹھا ہوں اور

منکوحہ الگ دردِ سر ہیں۔ دن میں سر درد، رات میں پیٹ درد، زندگی جہنم بنا دی میری اور مجھ جیسے بیسیوں کی۔ بھائی میرے خبردار! ان کی بتائی دوشیزہ کے چکر میں زندگی خراب نہ کرنا۔ ان کی دوشیزہ کا مطلب کم سے کم بھی ساٹھ سے اوپر کی خاتون ہوتی ہے۔"

ذہن میں یک دم گھنٹی کی طرح لفظ "خاتون" بجنے لگا۔

حجام کی بات سن کر ہمیں وہیں غشی کے دورے پڑنے لگے۔ بوکھلاہٹ میں 'نشو، نشو' کی گردان ہانکتے نہ جانے کب بے ہوش ہو گئے۔

حجام نے پانی سے منہ پر چھڑکاؤ کیا تو ذرا اوسان بحال ہوئے۔

ہم وہاں سے کسی طرح اٹھے اور سیدھے آغا سجانی کے دفتر جا پہنچے۔ سیکرٹری نے بتایا، "ابھی آپ یہیں بیٹھیے۔ لڑکی والے اندر ضروری بات چیت کر رہے ہیں۔"

"لڑکی والے؟"

ہم نے حیرانی سے پوچھا۔

دماغ میں کبھی نشو ڈانس کرتی نظر آتی کبھی کوئی بڑھیا لالٹین ہاتھ میں پکڑے اپنے ٹوٹے دانتوں سے ہنستی اپنی جانب چلتی نظر آتی۔

ہم سے رہا نہ گیا۔ بے اختیار ایک چیخ مار کر آغا سجانی کے دفتر میں زبردستی گھس گئے۔ اندر دو برقعہ پوش خواتین پر نظر پڑی۔ آغا سجانی نے ہماری حالت بھانپتے ہوئے فوراً کہا:

"اوہ آپ آ گئے۔۔۔ آپ!۔۔۔ لیجیے دلہا دلہن راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

"قاضی۔۔۔؟ کہاں ہے قاضی؟"

ہم نے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

آغا سجانی بولے:

"مبارک ہو آپ کو سہراب بھائی۔"

"بھائی۔۔۔؟"

"میرا مطلب ہے سہراب صاحب آپ کو مبارک ہو! خاتون۔۔۔ میرا مطلب ہے

لڑکی۔۔۔ مطلب دوشیزہ راضی ہے آپ سے شادی کرنے پر۔ ان سے ملیے، یہ لڑکی کی چھوٹی ہمشیرہ ہیں مہر النساء۔ اور آپ ہیں سردار بیگم، آپ کی ہونے والی شریکِ حیات۔"

"سردار بیگم۔۔۔؟ شریکِ حیات۔۔۔؟"

ہم نے دہراتے ہوئے پوچھا۔

"بس والدین پرانے خیالات کے تھے نا، لیکن آپ 'سرو' کہہ سکتے ہیں شادی کے بعد۔" لڑکی کی ہمشیرہ نے لقمہ دیا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ شادی کے بعد جیسے شوہر چاہے پکارے اپنی شریکِ حیات کو!"

آغا سبحانی نے کھسیانے انداز میں کہا۔

یہ سن کر سردار بیگم کے برقعے میں اِک ارتعاش سا پیدا ہوا جسے صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے چھوٹی بہن سے پوچھا:

"معافی چاہتا ہوں، کیا عمر ہو گی ان کی، میرا مطلب ہے آپ کی بہن کی؟"

مہر النساء فوراً بولیں:

"بس مجھ سے دو ہی سال بڑی ہیں۔"

"ہمم۔۔۔ تو آپ کی کیا عمر ہے؟"

ہم نے جھینپتے ہوئے زبردستی مسکرا کر پھر تقاضا کیا۔

"میری عمر۔۔۔! ہاہاہا۔ میں ان سے دو ہی سال چھوٹی ہوں بس۔"

"اوہ اچھا اچھا۔"

ہم نے مایوس ہو کر آغا سبحانی کی طرف دیکھا جو نظریں جھکائے ٹیبل پر انجمن کی تصویر دیکھنے میں مگن تھے۔ اچانک بولے:

"بھائی عمر کو چھوڑیے۔ نوجوان بچیاں کہاں اپنی عمر کسی کو بتانا پسند کرتی ہیں۔"

"مگر۔۔۔۔"

"لیکن۔۔۔!"

ہماری بات کے درمیان میں ہی مہر النساء بولیں:

"انکل ہم نکلتے ہیں بس اب اجازت دیجیے۔"

"انکل۔۔؟"

آغا سجانی نے سیٹ سے کھڑے ہو کر دہرایا۔

یہ کہہ کر وہ ہڑبڑاہٹ میں اٹھیں تو ان میں سے ایک کے پرس سے شناختی کارڈ نیچے جا گرا جو سیدھا ہمارے پاؤں کے پاس آ پہنچا۔ جھک کر اٹھایا تو اس پر تاریخ پیدائش پاکستان بننے سے پہلے کی لکھی تھی۔

بس پھر کیا تھا، ان کے نکلتے ہی ہم بھی وہاں سے سرپٹ بھاگے۔ سیدھا جا کر بیگم کے لیے سرخ گلاب کا گلدستہ لیا اور گھر پہنچے۔ بیگم سرخ گلاب دیکھ کر حیران پریشان ہو گئیں اور بولیں: "کل واہیات پوسٹر اور آج سرخ گلاب؟ خیریت تو ہے۔۔؟"

ہم نے فوراً جواب دیا: "کچھ نہیں بیگم، بہت دن سے تمھیں "آئی لو یو" بولنے کا من کر رہا تھا، سوچا آج جی کڑا کر کے بول ہی ڈالوں۔

بیگم نے شرما کر اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا اور ہم نے پوری قوتِ گویائی کو بروئے کار لاتے ہوئے با آوازِ بلند "آئی لو یو" بول دیا۔

نیچے سے بچے ڈر کر دوڑتے اوپر آ گئے اور حیرانی سے ہم دونوں کو بہت عرصے بعد ہنستا دیکھ کر خوشی سے ہنسنے لگے۔

گھڑیاں

دمشق کے بازار کے بیچ اس سرائے میں رہتے شالون کو بیس دن گزر چکے تھے۔

شالون کچھ دن کے لیے کام کے سلسلے میں دمشق آیا ہوا تھا مگر اس دوران باغیوں نے شہر کے ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیا تھا جو تاحال جاری تھا۔ اس کی اپنے وطن کب واپسی ہو گی، وہ نہ جانتا تھا۔ وہ ہر روز اپنے سرائے کی دوسری منزل سے بازار میں لوگوں کو خریداری کرتے دیکھتا۔ اس پُر رونق بازار میں ہر طرح کی دوکانیں تھیں جو انواع اقسام کی اشیاء سے بھری رہتی تھیں۔

شالون کا معمول تھا، وہ صبح سویرے اٹھ جاتا، بازار میں موجود قہوہ خانے میں کچھ دیر بیٹھتا، ناشتہ کرتا اور پھر پورے بازار کا چکر لگاتا۔ کس دکان میں کیا بکتا ہے، کس میں خریداروں کا زیادہ جمگھٹا رہتا ہے کس میں کم، اسے چند دن میں اس بازار کا کافی کچھ پتا لگ چکا تھا۔ اس پُر رونق بازار میں مصالحوں، خوشبوؤں سے لے کر سونے چاندی کے زیور، مقامی لباس، گھڑیاں سب ہی مناسب دام میں بکتی تھیں۔ شالون دن بھر مختلف دوکانوں میں لٹکی سجی عجیب و غریب چیزیں دیکھتا، ان کے بھاؤ تاؤ کرتا اور من کرتا تو کبھی کبھار کچھ خرید بھی لیتا۔

کچھ دن بازار میں چہل قدمی کے دوران اس نے غور کیا، صرف ایک نکڑ پر موجود گھڑیوں کی دکان ہی ایسی بچی تھی جو ہر روز یوں تو صبح سب سے پہلے کھلتی، مگر رات گئے جب

سارا بازار سنسان ہو جاتا، تب جا کر بند ہوا کرتی۔ شالون کو خود پر حیرت ہوئی کہ وہ اب تک کیوں نہ کبھی اس ٹوٹی پھوٹی دکان کے اندر گیا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی اپنے سامنے کسی گاہک کو کبھی اندر جاتے یا نکلتے دیکھا تھا، شاید وہ دکان ہی ایسی تھی جو باہر سے کسی کو اپنی جانب متوجہ نہ کرتی تھی۔۔ مگر آج نہ جانے کیوں رات کو سرائے کی کھڑکی سے بازار کا نظارہ کرتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا، کہ کل وہ ایک بار اس دکان میں گھس کر دیکھے گا کہ اندر کس قسم کی گھڑیاں ملتی ہیں۔

اگلے دن علی الصبح جب اس نے سرائے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو ایک ضعیف شخص دکان کا دروازہ اندر کی جانب سے کھول رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ بوڑھا شخص اندر ہی رہتا ہو۔ شالون کا اشتیاق بڑھا، اس نے سوچا کیوں نہ ابھی جا کر دیکھوں۔

شالون نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور منہ ہاتھ دھو کر سیدھا اس دکان کے سامنے پہنچا۔ باہر سے بھی وہ دکان کافی مفلوک الحال دکھائی دیتی تھی۔ ایک ٹوٹا پھوٹا بورڈ لگا تھا جس پر ایک گھڑی کی تصویر تھی۔ یہ دکان جو ایک دو منزلہ خستہ حال مکان کے نیچے بنائی گئی تھی، شاید اس بازار کی سب سے قدیم دکان ہو، شالون نے دل میں سوچا۔

شالون اندر گھسا تو سامنے اسے ایک بہت ہی پرانے زمانے کا لکڑی کا گھڑیال دکھا جس کا پنڈولم دائیں بائیں کی بجائے اوپر نیچے کی طرف حرکت کرتا تھا۔

دکان میں عجیب و غریب اشکال کی گھڑیاں جا بجا بے ہنگم انداز میں بکھری پڑی تھیں مگر حیرت انگیز طور پر کوئی بھی گھڑی ٹھیک وقت نہیں بتا رہی تھی۔ کسی کی سوئیاں الٹی طرف ٹیڑھی ہو کر مڑی تھیں تو کسی کی سوئیاں سرے سے تھیں ہی نہیں۔ ایک گھڑی پر کوئی نمبر اور نہ ہی کوئی سوئی تھی جبکہ ایک گھڑی پر دو ہاتھوں کی دس کی بجائے بارہ انگلیاں دو اضافی انگوٹھوں کے ساتھ گول دائرے میں ہل رہی تھیں۔

شالون نے ایسی گھڑیوں کی دکان اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کوئی بھی گھڑی عام گھڑی جیسی نہیں تھی۔ دیوار پر لگانے والے کلاک ہوں یا ٹیبل کلاک، گھڑیال ہوں یا

کلائی پر باندھنے والی گھڑیاں، سبھی بہت ہی اچھوتی اور عجیب اشکال کی تھیں۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا ارد گرد گھڑیوں کی ایسی اقسام نظر آرہی تھیں جنھیں دیکھ کر اس کا سر گھومنے لگا تھا۔

شالون نے فیصلہ کیا کہ اسے جلد اس کباڑ دکان سے باہر نکل جانا چاہیے جہاں اب تک اسے کوئی دکان دار بھی نظر نہیں آیا تھا نہ ہی کوئی کام کی گھڑی تھی۔

وہ اسی سوچ میں مڑ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کے سامنے وہی بوڑھا شخص کہیں ڈیسک کے پیچھے سے نمودار ہوا جو آج صبح دکان کا دروازہ اندر سے کھول رہا تھا۔

بوڑھے کے چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ ایک عجیب طرح کا اطمینان بھی تھا۔

شالون نے بوڑھے دکاندار سے کہا، "یہ سب خراب، عجیب و غریب گھڑیاں آپ نے بیچنے کے لیے اکٹھی کی ہیں یا ان کا کوئی اور مصرف بھی ہے؟"

بوڑھے دکان دار نے شالون کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ گھڑیاں خراب نہیں ہیں، دوسری بات یہ کہ ان کا مصرف صرف ان کے خریدار کے حساب سے طے ہوتا ہے۔ آپ کو آیندہ زمانے کی گھڑی چاہیے یا پچھلے زمانے کی؟ اگر موجودہ زمانے کی گھڑی چاہیے تو وہ میری دکان میں سے نہیں ملے گی۔"

شالون بوڑھے دکان دار کی عجیب بات سن کر پہلے حیران ہوا اور پھر سوچنے لگا کہ شاید یہ بوڑھا اپنی عمر کے ساتھ اپنا ذہنی توازن بھی کھو بیٹھا ہے۔ مگر پھر بھی شالون کو تجسس ہوا کہ پوچھے کہ یہ آیندہ اور پچھلے زمانے کی گھڑیوں سے بوڑھے کی کیا مراد ہے۔

شالون نے بوڑھے سے کہا۔ "اچھا ان تمام اِدھر اُدھر بکھری گھڑیوں میں سے اگلے زمانے کی گھڑیاں کون کون سی ہیں اور پچھلے زمانے کی گھڑی کی کیا نشانی ہے؟"

بوڑھے نے معنی خیز انداز سے مسکرا کر جواب دیا۔

"تمھیں کون سی گھڑی چاہیے؟"

شالون نے جھنجھلا کر کہا: "مجھے۔۔۔ دونوں چاہئیں۔۔۔"

بوڑھے نے ایک عجیب سی گھڑی اٹھائی جس کی شکل تکون تھی اور سوئیوں کی جگہ پر ایک گلوب گھوم رہا تھا اور اس پر ایک سے بارہ نمبر کی جگہ مختلف سال اور تاریخیں لکھی تھیں۔ وہ عجیب شے جسے بوڑھا گھڑی کہہ رہا تھا وہ کہیں سے بھی عام گھڑیوں سے مماثلت نہیں رکھتی تھی۔

شالون نے دیکھنے میں وہ بھاری گھڑی جب ہاتھ میں پکڑی تو وزن میں بہت ہلکی محسوس ہوئی۔ یہ گھڑی بھی بظاہر وہاں پڑی باقی گھڑیوں کی طرح عجیب شکل کی ہی تھی البتہ اس گھڑی کے پیچھے ایک گھمانے کی چابی ضرور لگی تھی۔

شالون کچھ دیر اس عجیب گھڑی کو جسے وہ بوڑھا دکان دار اگلے زمانے کی گھڑی بول رہا تھا، الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ شالون نے ہنستے ہوئے گھڑی کو الٹ پلٹ کر کان سے لگاتے ہوئے دکان دار سے پوچھا:

"اس کی قیمت کیا ہو گی؟ اور یہ کیا وقت ٹھیک بتاتی بھی ہے یا محض گھڑی کی شکل کا کوئی مینٹل پیس ہے؟ اور یہ جو بارہ ہندسوں کی بجائے مختلف سال لکھے ہیں، ان کے کیا معنی ہیں؟ 2040ء اور اتنی آگے کی تاریخیں پانچ ہزار انیس، دس ہزار اکیس، ان سب تاریخوں کا گھڑی پر لکھنے کا کیا مقصد ہے؟ یہ گھڑی ہے بھی یا نہیں؟"

بوڑھے نے کہا:

"ہاں ہاں سب بتاتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ اس گھڑی کی قیمت درہموں میں نہیں۔ اس کے لیے تمھیں ایک چرخی پر قرعہ ڈالنا ہو گا، اگر تمھارے نام کی قرعہ گھڑی نکل آئی تو یہ گھڑی تمھاری ضرور ہو جائے گی۔"

شالون نے حیرانی سے کہا:

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس قسم کی عجیب گھڑیوں کو ویسے لینا بھی کون چاہے گا؟ اچھا اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو پھر میں اس اگلے زمانے کی گھڑی کے لیے قرعہ ڈالنا چاہوں گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے یہ تو بتائیں کہ اس پر ٹھیک وقت کیسے دیکھا جائے گا؟"

بوڑھے نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے شالون کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے گھڑی لی اور بولا:

"یہ گھڑی نا صرف یہ کہ ٹھیک وقت بتائے گی بلکہ جس ٹھیک وقت پر گلوب کی سمت سیٹ ہو گی ٹھیک اسی وقت حتیٰ کہ اسی تاریخ اور اس زمانے میں لے بھی جائے گی۔"

شالون بوڑھے کی بات سن کر پھر ہنسنے لگا اور بولا:

"ایک منٹ رکیے۔ بہت دیر سے میں اس فضول کباڑ گھڑی کو دیکھ رہا ہوں اور فضول میں بھاؤ تاؤ بھی، اب جبکہ میں نے اس عجیب و غریب گھڑی کو خریدنے میں دلچسپی لینی شروع کی تو جو بے تکی بات آپ اب بتا رہے ہیں اس کے بعد مجھے لگتا ہے مجھے اسے لینا ہی پڑے گا۔"

یہ کہہ کر شالون نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"بے تکی اور جھوٹ نہیں، سچ بات ہے میرے بچے۔ تمھیں بھی جلد میری بات کا یقین آجائے گا۔"

بوڑھے نے پوری آنکھیں کھول کر کہا۔

شالون پھر ہنسنے لگا۔

بوڑھا ڈیسک کے پیچھے سے ایک عجیب سی تکون چرخی نما قرعہ نکالنے کی چیز اٹھا کر لایا اور اسے اٹھا کر ایک تکون تپائی پر رکھا۔ پھر شالون کو کہنے لگا کہ وہ اپنی کلائی والی گھڑی اس چرخی کے پیچھے لگے بکس میں ڈال دے۔

بوڑھے نے بتایا، اس چرخی کو گھمانے سے اس میں سے چھوٹی چھوٹی مختلف تین زمانوں کی گھڑیاں باہر نکلیں گی۔ اگر تین باریوں میں میری گھڑی واپس نکل آئی تو وہ شالون کی کلائی گھڑی اس سے لے گا اور یہ اگلے زمانوں کی گھڑی اس کے بدلے میں اسے دے دے گا۔

شالون نے کچھ سوچا اور بوڑھے کے بتائے ہوئے چرخی بکس میں اپنی گھڑی یہ سوچ کر ڈال دی کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ویسے بھی اس کی کلائی والی گھڑی اوسط درجے کی سستی سی

گھڑی تھی۔

شالون نے بوڑھے کے بتائے ہوئے طریقے سے چرخی گھمائی۔ ایک عجیب و غریب قسم کی کلائی والی گھڑی باہر نکلی جس کی سوئیاں الٹی طرف چل رہی تھیں اور بارہ ہندسوں کی جگہ ماضی کے زمانوں کی تاریخیں اور سال لکھے تھے۔ بوڑھے نے شالون کو بتایا یہ پچھلے زمانوں کا وقت بتانے اور اس گزرے زمانے میں لے جانے والی گھڑی ہے۔

شالون نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، یقیناً ایسے ہی ہوتا ہوگا۔"

اس نے پھر چرخی گھمائی۔ اس بار ایک اور گھڑی نکلی جس پر سرے سے کوئی بھی ہندسہ تھا نہ ہی کوئی سوئی یا اشارہ۔ بوڑھے دوکاندار نے بتایا کہ یہ موت کے بعد کے زمانے کی گھڑی ہے۔ اس کی چابی گھمانے کی صورت میں یہ موت کے بعد کی دنیا میں لے جائے گی۔

شالون کو اب بوڑھے کی بے سروپا کی باتوں سے کوفت ہونے لگی تھی۔ اس نے آخری بار پھر چرخی گھمائی۔ اس بار اس کی اپنی گھڑی بالآخر باہر نکلی جس پر ٹھیک وقت بجا تھا۔ شالون نے شکر کیا اور بوڑھے سے کہا۔

"لائیے اب اگلے زمانے کی وہ گھڑی۔"

بوڑھے نے گھڑی اٹھائی اور اسے ایک کاغذ کے لفافے میں لپیٹنے لگا۔

شالون نے بوڑھے دوکاندار سے کہا:

"شوق میں مَیں نے یہ گھڑی اپنی گھڑی کے عوض لے تو لی ہے، کیا وہ کبھی اسے واپس کر کے کوئی اور دوسری گھڑی میں بدل سکتا ہے یہاں سے؟"

بوڑھے دکان دار نے مسکراتے ہوئے کہا:

"کیوں نہیں، جب تمھارا دل چاہے آجائے۔ تمھیں یہ خریدی گھڑی چرخی میں ڈالنی ہوگی اور اپنی پسند کی پچھلے زمانے والی یا موت کے بعد والی گھڑی لینی ہوگی۔ مگر تمھاری موجودہ زمانے کی گھڑی اب اسے کبھی واپس نہیں ملے گی۔"

بوڑھے نے ہنستے ہوئے کہا: "تم نہیں جانتے میں بحال کی اس گھڑی کو پانے کے لیے کتنی صدیوں سے یہاں خوار ہو رہا تھا۔ تمھاری اس گھڑی سے میں اب زمانوں بعد حال کا لطف اٹھا سکوں گا۔"

شالون بوڑھے کی بے سروپا گفتگو سن کر مسکرانے لگا، اور بولا:

"لگتا ہے آپ کی دکان سے کوئی خریداری نہیں کرتا؟"

بوڑھا بولا:

"اگلے اور پچھلے زمانے کی گھڑی لے کر کوئی کرے گا بھی کیا۔ میں نے صدیوں پہلے پچھلے زمانے کی ایک گھڑی خریدی تھی، تب سے اب تک میں یہاں بھٹک رہا ہوں۔ اب تمھاری گھڑی کی بدولت میں حال سے لطف اٹھا سکوں گا۔" یہ کہہ کر بوڑھا ہنسنے لگا۔

شالون حیرانی سے بوڑھے کو پہلی بار قہقہہ لگاتے دیکھنے لگا۔

بوڑھے نے شالون کی گھڑی فوراً اپنی کلائی پر باندھ لی اور اسے کان سے لگا کر اس کی سوئیوں کی ٹک ٹک سننے میں محو ہو گیا۔ اس کا چہرہ گھڑی پہن کر کھل اٹھا تھا۔

شالون نے جلدی سے وہ گھڑی لی اور بھاگتے ہوئے اپنے سرائے میں واپس آ گیا۔ لفافے سے نکال کر وہ اس گھڑی نما چیز کو بہت دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا مگر نہ جان سکا کہ یہ کیلنڈر نما گھڑی جس پر ایک سے بارہ تک کے ہندسوں کی بجائے صرف مختلف بارہ تاریخیں لکھی تھیں، اس کا حقیقی مصرف کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے اسے دوبارہ لپیٹ کر اپنے سفری صندوق میں رکھ دیا۔

کچھ دن یونہی گزر گئے۔ وہ سرائے کی کھڑکی سے روز دیکھتا، گھڑیوں کی دکان صبح سب سے پہلے کھلتی اور رات گئے بند ہوا کرتی۔

ایک دن شالون نے سوچا کیوں نہ بوڑھے سے پوچھے کہ یہ گھڑی کیسے کام کرتی ہے اور وہ اسے چلانے کا طریقہ بھی بتائے جو اس روز وہ پوچھنا بھول گیا تھا۔

شالون صبح سویرے دکان میں پہنچا اور پھر مختلف گھڑیاں دیکھنے لگا مگر دکان کا نقشہ چند

دنوں میں یکسر بدل چکا تھا۔ سب کچھ صاف ستھرا اور نیا نیا سا دکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا دکان کو نئے سرے سے تیار کیا گیا ہے۔ شالون کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ کیا یہی وہ ٹوٹی پھوٹی دکان ہے جہاں سے اس نے چند دن پہلے ہی یہ کباڑ گھڑی خریدی تھی، جس کا نہ کوئی سر تھا نا پیر۔ مگر آج سب شوکیس چمک رہے تھے۔ رنگ و روغن جیسے تازہ تازہ کیا گیا ہو، گرد کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔

اتنے میں ایک بیس بائیس سال کا، گردن تک لمبے بالوں والا خوبصورت لڑکا کہیں پیچھے سے نمودار ہوا اور اچانک بولا:

"کیا ہوا؟ اگلے زمانے کی سیر کی؟ وہاں دل نہیں لگا؟"

شالون نے حیرت سے کہا:

"سیر، کون سی سیر ___ ؟ کون سا اگلا زمانہ ___ ؟ اور آپ! میرا مطلب آپ کون ہیں؟ وہ ادھیڑ عمر شخص جو یہاں ہوا کرتے تھے وہ کہاں ہیں؟"

نوجوان مسکرایا اور بولا:

"جی بولیے میں سن رہا ہوں۔"

"کیا مطلب!"

شالون نے سنجیدگی سے کہا۔

"جی میں ہی وہ دکان دار ہوں جن سے آپ نے ایک زمانے میں یہ گھڑی خریدی تھی۔" وہ لڑکا بولا۔

"ایک زمانے میں؟"

شالون نے ماتھا کھجایا۔

'لگتا ہے لوگوں کو بے وقوف بنانا ان لوگوں کا خاندانی دھندا ہے۔' شالون نے منہ ہی منہ میں خود سے کہا۔

لڑکا مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، مجھے بتائیں میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ آپ کو گھڑی بدلنی ہے تو میں آپ کو پچھلے زمانے کی گھڑی بھی دے سکتا ہوں اور موت کے بعد والی بھی۔" لڑکا شائستگی سے بولا۔

"مجھے تو اب تک اس کباڑ گھڑی کو چلانا ہی نہیں سمجھ آسکا، چہ جائے کہ میں ایک اور بے کار گھڑی خرید لوں۔"

لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا:

"اچھا اب سمجھا۔ لائیے گھڑی، میں ابھی آپ کی مشکل آسان کیے دیتا ہوں۔ اس گھڑی کو چلانا تو بہت ہی آسان ہے مگر یہاں اسے مت چلایئے گا۔ جب آپ کسی مشکل میں ہوں اور آپ کی جان کو خطرہ وغیرہ ہو، وہاں چلا کر اس سے جان بھی بچائی جا سکتی ہے۔"

شالون نے لڑکے کو کہا:

"تو کیا میں اس بے کار گھڑی کو تمام عمر صرف اس لیے اپنے پاس رکھوں کہ کبھی میری جان کو خطرہ ہو گا اور میں اس فضول گھڑی کی برکات سے اس سے بچ جاؤں گا۔ حد ہوتی ہے حماقت کی بھی۔ وہ جو بزرگ یہاں ہوتے تھے، کہاں ہیں وہ اب؟"

لڑکا بولا: "وہ بزرگ یہیں ہیں اور آپ کی بات کا جواب یہ ہے کہ ہاں، بات تقریباً ایسی ہی ہے جیسی آپ نے کہی کہ اس گھڑی کو آپ تب ہی استعمال کریں جب آپ حال سے مکمل چھٹکارہ پانا چاہ رہے ہوں۔

شالون نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے بے زاری سے کہا:

"اچھا اچھا، مجھے آپ اب اس کا طریقہ بتانا پسند کریں گے؟"

لڑکے نے گھڑی اپنے ہاتھ میں پکڑی اور اس کے پیچھے ایک جگہ پر بنے چھوٹے سے ابھار کو دبایا۔ ایک چھوٹا سا ڈھکنا کھلا جس کے پیچھے دو عجیب وغریب گلہری نما انتہائی چھوٹے زندہ جانور تھے جو بالکل ساکت کھڑے تھے اور گھڑی کے درمیان میں لگے گلوب کو اپنی کمر پر اٹھائے ہوئے صرف دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔ شالون کو پہلے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا

کہ یہ دونوں کیسے اس گھڑی میں زندہ ہیں___ اور ان کا اس گھڑی کے چلنے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟؟

لڑکے نے بتایا جب بھی شالون کو یہ گھڑی چلانی ہو گی پہلے اس کو چابی دینی ہو گی جس سے یہ درمیان میں لگا گلوب گھومے گا۔ اپنی پسند کے زمانے کی تاریخ پر گلوب کو سیٹ کر کے اس ابھار کو دبانا ہے اور ان دونوں گلہریوں کے سر پر ایک دفعہ انگلی سے مس کرنا ہے۔ یہ دونوں حرکت میں آ جائیں گی اور گلوب میں سے ایک شعاع نکلے گی اور اگلے ہی لمحے وہ خود کو اس تاریخ میں موجود پائے گا جو تاریخ اس نے گلوب پر سیٹ کی ہو گی۔

شالون پہلی بار سنجیدگی سے لڑکے کی ہدایات سن رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

شالون نے لڑکے سے پوچھا: "اور مستقبل سے باہر آنے کے لیے اسے کیا کرنا ہو گا؟"

لڑکے نے کہا:

"اس کے لیے پھر گھڑی کو کھول کر دونوں گلہریوں کے صرف پاؤں کو مس کرنا ہو گا۔"

"اور تاریخ کون سی سیٹ کرنی ہو گی؟ گھڑی پر سب بہت آگے کے زمانوں کی تاریخیں نظر آ رہی ہیں۔"

لڑکے نے کہا:

"وہ درست ہے مگر واپسی بالکل حال میں آنا ممکن نہیں ہو گا، سوائے اس کے کہ آپ کو بھی کوئی پچھلے زمانے میں لے جانے والی گھڑی پہنے کوئی مل جائے جو آپ سے اپنی گھڑی بدل لے۔ مگر حال میں مکمل واپسی اب کبھی ممکن نہ ہو سکے گی۔"

شالون لڑکے کی بات سن کر کچھ دیر کے لیے مکمل خاموش ہو گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، یہ سب ایک خواب ہے یا حقیقت۔

شالون نے نوجوان سے اجازت لی اور واپس سرائے لوٹ گیا۔ اگلے دن خوش خبری

ملی کہ ہوائی اڈے سے باغیوں کا قبضہ چھڑا لیا گیا ہے اور کل ہی وہ واپس اپنے وطن لوٹ سکتا ہے۔ اگلے دن وہ ہوائی اڈے پہنچا۔ کچھ دیر بعد جہاز میں سوار ہوا۔ وہ اور سب مسافر بہت ڈرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب جہاز نے اڑان بھری تو اس نے اور باقی سب مسافروں نے سکھ کا سانس لیا۔ شاید زیادہ تر لوگ پچھلے ایک ماہ سے ہوائی اڈے پر قبضہ کی وجہ سے وہاں آکر بری طرح پھنس گئے تھے۔

لیکن تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اچانک جہاز میں بیٹھے دو مسافروں نے بندوقیں نکال کر پھرتی سے پورے جہاز کو ہائی جیک کر لیا۔ یہ دونوں ہائی جیکرز اسی باغی گروہ کے تھے، جنھوں نے پچھلے ایک ماہ سے ہوائی اڈے پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ ان کے ماتھے پر سیاہ پٹیاں بندھی تھیں۔

شالون اور باقی سب مسافر بہت سہمے ہوئے تھے۔ سفاک ہائی جیکرز نے جہاز کے عملے کے ایک ملازم کو ہاتھا پائی میں سب کی آنکھوں کے سامنے سر میں گولی مار کر ختم کر دیا تھا۔

شالون کو اچانک اگلے زمانے میں فرار ہونے والی گھڑی کا خیال آیا مگر وہ اس کے دستی بیگ میں اوپر کمپارٹمنٹ میں پڑی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہائی جیکر سے واش روم جانے کی اجازت مانگی۔ ہائی جیکر نے اس کے بظاہر ڈرے سہمے اور بے ضرر حلیہ کو دیکھ کر اسے اجازت دے دی۔ مگر جونہی اس نے کمپارٹمنٹ کھول کر بیگ نکالنے کی کوشش کی، ایک ہائی جیکر نے اسے بندوق کا دستہ کمر پر مارا اور خود بیگ کو دیکھنے لگا۔ اسے بیگ میں کوئی خاص کام کی چیز نہ نظر آئی۔ گھڑی بھی اسے فضول قسم کی کھلونا کی طرح کی چیز لگی۔ اس نے بیگ شالون کی طرف اچھال دیا اور پوچھا:

"واش روم میں لے جا کر الارم لگانا ہے؟"

دونوں ہائی جیکر بھدے طریقے سے ہنسنے لگے۔

شالون نے جھوٹ موٹ کہا:

"بیگ میں میری دوا ہے مجھے نکالنے دی جائے۔"

اسے ایک ہائی جیکر ہاتھ روم لے گیا اور کہا کہ وہ دروازہ بند نہیں کرے گا۔

شالون نے موقع غنیمت جانا۔ وہ اندر گھسا، گھڑی کی چابی گھمائی اور تاریخ اکیس ہزار اکیس، اکیس جون پر سیٹ کر دی اور پیچھے سے بکس کھولا۔ دونوں گلہریوں کے سر پر باری باری مس کیا۔ دونوں گلہریاں تو جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں، فوراً پھرتی سے گلوب کو کمرے چھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے گھمانے لگیں۔ اچانک گلوب سے ایک شعاع نکلی اور پورا جہاز ہلنے لگا۔

یک دم جہاز راکٹ میں تبدیل ہو گیا اور اُڑنے کی بجائے اوپر کی جانب تیزی سے اُٹھنے لگا۔ شالون کششِ ثقل کی کمی کی وجہ سے جہاز میں ڈانواں ڈول اڑ رہا تھا۔ باقی تمام مسافر بھی اس کے ہمراہ تھے اور وہ دونوں ہائی جیکرز بھی راکٹ کی چھت پر چپک کر دبکے بیٹھے تھے۔

کچھ دیر بعد جب راکٹ رکا تو سب مسافر دھڑام سے نشستوں پر گرے۔ ہائی جیکرز کی بندوقیں گر چکی تھیں۔ شالون نے پھرتی سے دونوں بندوقوں کو اپنے قبضے میں لے لیا اور ہائی جیکرز کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

دونوں ہائی جیکرز کو باندھ دیا گیا۔ اتنے میں جہاز کا دروازہ کھلا اور ایک عجیب و غریب حلیے کا روبوٹ اندر داخل ہوا۔

شالون نے اسے بتایا کہ یہ دونوں ہائی جیکرز اور ہم سب مسافر پرانے زمانے کی فلاں تاریخ سے سفر پر نکلے تھے مگر ہم کسی وجہ سے اکیس ہزار اکیس میں پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں واپس بھیجنے کا کوئی بندوبست کروادیں اور ہو سکے تو ہمیں ایک دن گرد و نواح کی سیر بھی کروادیں تاکہ پتا لگے زمانہ کتنا تبدیل ہوا ہے۔

روبوٹ نے جواب دیا:

"کوئی مسئلہ نہیں، ہمارے پاس اکثر اگلے اور پچھلے زمانے کے مسافر آتے رہتے ہیں۔ اس سے اگلی فلائیٹ میں چار ہزار پندرہ کے زمانے کے کچھ مسافر لینڈ کرنے والے ہیں۔ یہاں پچھلے اور اگلے زمانوں کو دیکھنے والے ٹوورز روز کی بنیاد پر آتے ہیں۔ کبھی کبھار ہم بھی اگلے

زمانے دو تین دن کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ میں پچھلی بار سن دو ہزار بیس کی سیر کو گیا تھا۔ کیا بتاؤں بہت ہی گندا ٹوور تھا، بالکل مزہ نہیں آیا۔ اب سوچ رہا ہوں جولائی انیس سو انہتر کی سیر کو جاؤں۔ ایک ساتھی روبوٹ ہو کے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا خوب مزے کیے اس نے وہاں، اس سال کی سیر میں۔"

سب مسافر اور دونوں ہاتھ پاؤں بندھے ہائی جیکرز، روبوٹ اور شالون کی گفتگو سن کر سخت پریشان اور ہراساں دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد روبوٹ نے سات سات لوگوں کو ایک چھوٹی راکٹ ٹیکسی پر بٹھایا اور وینس سٹون کارخانے کے لیے روانہ کر دیا۔ راستہ کافی دلچسپ تھا۔ باہر رنگ برنگے راکٹ پُھر پُھر اُڑ رہے تھے۔ آسمان کا رنگ کبھی گلابی، کبھی نارنجی، کبھی پیلا اور کبھی ہرا ہو جاتا۔

راکٹ ٹیکسی بھی کافی آرام دہ تھی۔ ان سب کو وینس سٹون فیکٹری اتارا گیا جہاں پہنچتے ہی ہمارے گلے میں بڑے بڑے نیپکن ڈال دیے گئے اور ایک بڑے ہال میں لا کر چھوڑا گیا۔ پھر بتایا گیا کہ شام تین بجے تک انھیں اور وہاں موجود سب مزدوروں کو وہاں پڑے پتھروں کے ڈھیروں میں سے خاص دھات کے چنے نما خول نکالنے ہیں۔ جو شخص ایک خاص تعداد کے چنے ڈھونڈے گا، اسے اس روز اتنی ہی جلدی چھٹی مل جائے گی۔ روبوٹ نے بتایا کہ انھیں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے لیے انسانی مزدور چاہییں جو چنے ڈھونڈنے کا خاص کام کر سکیں۔ یہ کام کافی تکلیف دہ تھا۔ ہر پتھر کو توڑتے ہوئے تکلیف سے ماتھے پر پسینہ آ جاتا تھا۔ پورے کارخانے میں روبوٹس انسانوں کی نگرانی کرتے تھے اور صرف انسان تمام کام کرتے تھے۔

شالون کی مجبوری تھی کہ اسے کسی بھی حال میں یہ کام کرنا تھا بصورت دیگر روبوٹس شالون کو وہاں سے بے یار و مددگار باہر نکال دیتے۔ یہاں اس خرکار کیمپ میں کم از کم اسے دو وقت کا کھانے کو دلیہ تو ملتا تھا۔ شالون نے اس روز صبح سات سے تین کے بیچ اپنے حصے کے بارہ خاص دھات کے چنے ڈھونڈے جبکہ ایک ساتھی نے ستر، دوسرے نے پینتالیس، ایک

نے دو سو اور دو نے سو سو چنے ڈھونڈے۔ اس حساب سے شالون کی کارکردگی کافی مایوس کن تھی۔ جو زیادہ چنے ڈھونڈ تا تھا، اسے اتنے ہی روز کام سے چھٹی مل جاتی تھی۔

شالون کو باقی انسانی مزدوروں کے ساتھ ہر روز یہ عجیب کام کرنا پڑتا۔ وہ وہاں رہ کر یہ عجیب و غریب دھات کے چنے تلاش کرنے کا کام کر کر کے تنگ آ چکا تھا۔ ایک روز شالون نے فیکٹری کے فورمین روبوٹ سے درخواست کی کہ اسے واپس اس کے دور میں جانا ہے۔ روبوٹ نے اسے بتایا کہ وہ اب کبھی اس دور میں واپس نہیں جا سکتا۔ اس کے پاس دو ہی حل ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یہاں آئے کسی ایسے شخص سے ماضی میں لے جانے والی گھڑی تبدیل کر لے جو آج یہاں اپنا ماضی بتا رہا ہے اور وہ اسے اپنی مستقبل کی گھڑی دے دے۔ مگر اسے ایسی گھڑی تلاش کرنے میں شاید کئی صدیاں بیت جائیں جس پر ٹھیک اسی زمانے کی بارہ تاریخوں میں سے ایک تاریخ لکھی ہو۔ وہ اگر واپس گیا بھی تو اپنے دور سے بہت پہلے یا بہت بعد میں ہی جا پائے گا۔ شالون یہ سن کر سخت مایوس ہوا کہ انجانے میں اس نے اپنی حال کی گھڑی اس بوڑھے کو کیوں دے دی۔ اسے اپنے حال پر توجہ دینی چاہیے تھی نہ کہ ماضی اور مستقبل کی گھڑی پر۔

مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہر روز اس جگہ نئے لوگوں سے پوچھتا کہ کیا کوئی اس کی مستقبل کی گھڑی لے کر اسے اپنی ماضی کی گھڑی دے سکتا ہے؟ بہت دن خوار ہونے کے بعد اسے ایک شانیہ نامی خاتون ملی جو مستقبل سے ماضی میں آ چکی تھی اور واپس حال میں جانا چاہتی تھی۔ شالون نے اسے بتایا اگر وہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں تو شاید اس عجیب زمانے اور ذہنی حالت سے انھیں فرار مل جائے، جہاں وہ اور ان جیسے بہت سے لوگ پھنس چکے تھے۔ سب نے اپنے حال کو بیچ کر مستقبل اور ماضی کا گھاٹے کا سودا کر رکھا تھا اور سب ہی پریشان تھے۔ جبکہ کچھ ایسے بھی تھے جو بغیر گھڑی کے کسی مستقبل اور ماضی کی گھڑی والے کے پیچھے لگ کر اپنا حال گنوا بیٹھے تھے۔

شالون نے شانیہ کی گھڑی دیکھی، اس پر ماضی کی بارہ تاریخوں میں سے ایک شالون

کے حال کے قریب ترین تاریخ درج تھی۔ صرف پچاس سال آگے کا فرق تھا مگر وہ بھی شالون کے لیے ان حالات میں غنیمت تھا۔ شالون نے سوچا شاید پچاس سال آگے کے زمانے میں اس کے زیادہ تر عزیز رشتے دار اہل علاقہ ابھی حیات ہوں۔

ملتی جلتی صورت شانیہ کے ساتھ بھی تھی، وہ بھی اپنے حال کے صرف پینتالیس سال قریب کی تاریخ میں واپس جا سکتی تھی۔

اس امید پر دونوں نے گھڑیاں تبدیل کیں اور ان پر مطلوبہ تاریخ سیٹ کی جہاں وہ اپنے زمانے کے قریب قریب واپس پہنچ سکتے تھے۔ واپس پہنچنے پر شالون کے عزیزوں نے کافی لیت و لعل کے بعد اسے آخر پہچان لیا۔ اس نے انھیں بتایا کہ اس نے پلاسٹک سرجری سے خود کو جوان کیا ہے۔ وہ وہاں سب بوڑھوں کے ساتھ جیسے تیسے رہنے لگا، مگر وہ سب اس سے بہت زیادہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ شالون نے کچھ عرصے بعد دوبارہ دمشق کے سفر کی ٹھانی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو دیکھ کر حیران رہ گیا، گھڑیوں کی دکان جوں کی توں موجود تھی اور وہاں اس بار ایک بوڑھی خاتون موجود تھی۔ شالون نے اسے اپنی گھڑی دکھائی کہ یہ گھڑی بدل کر وہ ایک ایسی گھڑی لینا چاہتا ہے جو اسے ٹھیک پچاس سال پہلے کے دور میں لے جائے۔

بڑھیا نے بہت تلاش کے بعد ایک ایسی گھڑی ڈھونڈی جس پر پچاس سال پہلے کی ایک تاریخ تھی۔ شالون بہت خوش تھا کہ وہ اب ٹھیک اس زمانے میں واپس جا سکے گا جہاں سے یہ عجیب مستقبل اور ماضی کی گھڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

اس نے اپنی گھڑی دوبارہ قرعے میں ڈالی اور اس دفعہ پہلی ہی بار میں وہ مطلوبہ گھڑی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے ماضی کی گھڑی پر پچاس سال پہلے کی تاریخ کو سیٹ کیا۔ اگلے ہی لمحہ خود کو جہاز میں ہائی جیکرز کے سامنے دیکھ کر اس کے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ اس کے پاس واحد حل یہی بچا تھا کہ خود کو اس سے بھی پرانے زمانے میں لے جائے۔ اس نے کسی طرح موقع دیکھ کر گھڑی کو تین سال پہلے کی تاریخ پر سیٹ کیا۔ اس بار اس نے اپنے آپ کو گھر میں بستر پر

موجود پایا۔ وہ بستر پر اکیلا بیٹھا تنہائی میں سوچ رہا تھا کہ اس ماحول سے کیسے نجات حاصل کرے اور کسی طرح مستقبل یا ماضی میں ہمیشہ کے لیے چلا جائے۔ اچانک اسے اپنی جیب میں کچھ محسوس ہوا۔ جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں ایک اور گھڑی تھی، جس پر سرے سے کچھ بھی درج نہیں تھا۔ نہ کوئی سوئی نہ کوئی نقطہ، نہ ہندسہ۔ شاید کسی نے اس کی جیب میں اسے بتائے بغیر موت کے بعد کے زمانے کی گھڑی ڈال دی تھی۔ شاید اسی بوڑھی عورت نے۔ شالون دھیرے سے اس گھڑی کو چابی دینے لگا۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے پُر ہو چکی تھیں۔ نہ جانے کب اس نے اس گھڑی کو پہنا اور اگلے ہی لمحے خود کو ایک تابوت میں پایا۔۔۔

Death with Breath

کرہ ارض سے آکسیجن کا خاتمہ ہوئے لگ بھگ سات سو سال گزر چکے تھے۔ کھلی فضا میں آکسیجن کی شدید قلت کے باعث باہر نکلتے وقت آکسیجن پمپ ہر انسان کی زندگی کا لازمی جزو بن چکا تھا۔ ہر گھر ہر عمارت کے باہر آکسیجن کے سلنڈرز موجود تھے جن سے گھروں اور عمارتوں میں آکسیجن کی مستقل فراہمی ہوا کرتی تھی۔

سندس حاملہ تھی۔

آج سندس کی ڈیلوری تھی۔ وہ اور اس کا شوہر اپنے اپنے آکسیجن پمپ چڑھا کر گھر سے ہسپتال کے لیے افراتفری میں باہر نکلے تھے۔

سندس کے پیٹ میں موجود بچہ اپنی طرز کا ایک منفرد بچہ تھا۔

یہ اچھوتا کیس کسی معمے سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹرز بچے کے ماں باپ، دادا دادی، رشتے دار سب حیران تھے۔ ڈاکٹرز نے پیدائش سے پہلے ہی سب کو بتا دیا تھا کہ یہ بچہ اپنی طرز کا عجیب بچہ ہے جو سانس نہیں لیتا مگر زندہ ہے۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ کسی قسم کی پیچیدگی اور آپریشن کے بغیر ہی بچہ نارمل طریقے سے پیدا ہوا۔

سندس کے ہاں یہ پہلی اولاد تھی۔ اس کا شوہر سیین خوش بھی تھا اور پریشان بھی۔

ڈاکٹرز نے ان کو بتایا، بچہ بظاہر بالکل صحت مند دکھائی دیتا ہے مگر پھر بھی سب حیران اور پریشان تھے کہ وہ بچہ غیر معمولی طور پر سانس بالکل نہیں لیتا تھا۔ بغیر سانس لیے وہ ابھی تک کیسے زندہ تھا، ڈاکٹرز سمیت سب کے لیے یہ بہت بڑا سوال تھا۔

ڈاکٹرز نے اس کے مختلف طرح کے ٹیسٹس کیے۔ بچے میں بظاہر کوئی جسمانی نقص نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کے پھیپھڑے نا سانس اندر کھینچ رہے تھے نا ہی کسی قسم کی ہوا باہر خارج کرتے تھے۔

سندس اور سیین نے اپنے طور پر شروع میں گھبرا کر اسے مصنوعی سانس دینے کی کوشش کی۔ اپنے آکسیجن سلنڈرز اسے لگانے کی کوشش بھی کی مگر ان دونوں نے محسوس کیا بچہ بغیر سانس کے زیادہ نارمل اور پر سکون رہتا تھا۔ جونہی اسے سانس دی جاتی وہ گھبرا کر رونے لگتا۔

ماں باپ سے اس کی بے تابی دیکھی نہ جاتی۔ تنگ آکر انھوں نے اسے اپنی سانس اور سلنڈر سے سانس دینے کی کوشش ترک کر دی۔

بچہ بغیر سانس لیے ان کی طرف دیکھ کر کبھی مسکراتا، کبھی بھوک سے بے تاب ہو جاتا اور سندس اسے اپنا دودھ پلانے لگتی۔

دودھ پیتے ہی وہ اور زیادہ پر سکون ہو جاتا اور اپنے ارد گرد کی چیزوں کو دل چسپی سے دیکھنے لگتا۔ اسے دور سے دیکھ کر کوئی نہ کہ سکتا تھا کے یہ بچہ بغیر سانس لیے دو دن سے زندہ ہے۔

ڈاکٹر بریت نے اپنی یونیورسٹی کے ہیڈ پروفیسر سے دو دن پہلے پیدا ہوئے بچے کا ذکر کیا کہ ایک ایسا بچہ پیدا ہوا ہے جو پچھلے دو دن سے بغیر سانس لیے زندہ اور صحت مند ہے۔

پروفیسر نیل نے اسی دن کی فلائیٹ پکڑی اور سیدھے متعلقہ ہسپتال پہنچے۔ انھوں نے تفصیل سے بچے کا معائنہ کیا۔ اس کی حرکات و سکنات کا کچھ دیر بغور مشاہدہ بھی کیا۔ بچہ حیرت انگیز طور پر بغیر سانس لیے بالکل مطمئن دکھائی دیتا تھا۔

پروفیسر نبیل نے سندس اور سیین کو تسلی دی کہ پریشان نہ ہوں، جلد ہی ریسرچ کے بعد ہم ضرور اس راز سے پردہ اٹھالیں گے کہ یہ بچہ بغیر سانس لیے کیسے زندہ ہے۔

پروفیسر کا اپنا اندازہ تھا کہ شاید یہ انسانی ارتقا کی ہی کوئی بدلی ہوئی صورت ہو۔ مگر حتمی طور پر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

سندس اور سیین بچے کو لے کر اپنے گھر واپس آ چکے تھے۔ گھر کے اندر ایئر کنڈیشن کے راستے آکسیجن کی سپلائی ہر وقت ہوتی تھی اور گھر میں کسی بھی قسم کی کھڑکی کا تصور نہیں تھا۔ صدر دروازہ بھی فریج کے دروازے کی طرح سیل بند ہو جاتا تھا۔ بچہ جونہی گھر پہنچا، اس نے رونا شروع کر دیا۔ سندس اور سیین نے بہت کوشش کی مگر بچہ مستقل روتا رہا۔ جونہی اسے باہر کھلی فضا میں لے جاتے وہ خاموش اور مطمئن ہو جاتا۔

سندس کو مجبوراً اپنا پمپ چڑھا کر اس کے لیے باہر رہنا پڑتا۔

سیین نے ایک کمرے میں کھڑکی کا انتظام کروایا اور اس کمرے کے اے سی سے آکسیجن کی سپلائی بند کروائی۔ اب بچے کو گھر کے اس کمرے میں رکھا گیا جہاں آکسیجن کی سپلائی بالکل نہیں آتی تھی۔ بچہ وہاں اکیلا رہتا، سندس اسے دودھ پلانے کے لیے ہر دو گھنٹے بعد اپنا پمپ پہن کر وہاں آ جاتی اور کچھ دیر اس سے کھیلتی، اس کا لباس بدلتی اور واپس اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ سیین نے بچے کے کمرے میں احتیاطاً کیمرہ لگا دیا تھا تاکہ بچہ ہر پل ان کی نظروں میں رہے۔

بچہ کھڑکی سے کھلی فضا کا نظارہ کرتا، کبھی آسمان کو دیکھ دیکھ کر انگوٹھا چوستا اور مسکراتا رہتا۔

اگلے دن پروفیسر نبیل کا فون آیا کہ ان کے شہر سے دور ایک اور شہر کے اسپتال میں بھی اس سے ملتا جلتا ایک کیس ہوا ہے اور وہ آج ہی وہاں جا رہے ہیں۔ وہاں سے وہ کل انھیں پھر کال کریں گے۔

سیین اور سندس دونوں سوچ میں پڑ گئے تھے کہ آخر یہ دنیا میں ہو کیا رہا ہے۔ اچھی

خاصی پر سکون زندگی گزر رہی تھی۔ آکسیجن کی مستقل سپلائی موجود ہے، پر سکون گھر ہے، ہر طرح کی آسائش ہے مگر اولاد ملی بھی تو اس عجیب طرح کے نقص کے ساتھ۔

پھر بھی وہ بہت خوش تھے مگر کبھی کبھی وہ دونوں میاں بیوی کچھ سوچ کر بہت افسردہ ہو جاتے تھے۔ انھیں ڈر رہتا تھا کہ کہیں ان کی اولاد چند دن کی مہمان ہی نہ ہو۔ یہ خوف دونوں کو اندر ہی اندر ستاتا رہتا تھا۔

اگلے دن ٹی وی پر دھواں دار خبر آئی کہ پچھلے تین دن سے شہر میں جتنی بھی ڈلیوریز ہوئیں تقریباً سب کے سب بچے بغیر سانس لینے والی پر اسرار بیماری کے ساتھ پیدا ہوئے لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ تقریباً تمام بچے صحت مند پیدا ہوئے۔ صرف چند بچے ہی ایسے پیدا ہوئے جن کا دل پیدائش کے کچھ گھنٹے بعد دھڑکنا بند ہو گیا۔ مگر حیرت انگیز طور پر جو نہی ان کے دل کی دھڑکن بند ہوتی اور وہ موت کے منہ میں جا رہے ہوتے، ان کی سانس بحال ہوتی جاتی تھی۔ مگر ڈاکٹرز نے بہت سے ٹیسٹس کے بعد ان بچوں کو مردہ قرار دیا، گو ان کی سانس چل رہی ہوتی تھی مگر ان کے جسم کے باقی تمام اعضا کام نہیں کر رہے ہوتے تھے۔

ڈاکٹرز دو دن سے ان عجیب لاشوں کا معائنہ کر رہے تھے جو مردہ ہونے کے باوجود سانس لیتی تھیں۔ ڈاکٹرز بہت دیر لاشوں کا معائنہ کرنے کے بعد اس عجیب نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس پر اسرار بیماری کے شکار بچے جب مرتے ہیں، تب ان کی سانس بحال ہو جاتی ہے۔ جبکہ ان بچوں میں سے کچھ کے والدین بضد رہے کہ ان کے بچے مرے نہیں بلکہ صرف بے ہوش ہیں یا سکتے کی حالت میں ہیں۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ان مردہ بچوں کی صرف سانس بحال ہے، دل اور دماغ مردہ ہیں اور انھیں تا حال نہیں معلوم کس طرح ان مردہ بچوں کی صرف سانس اندر اور باہر آ جا رہی ہے اور زندہ بچے بغیر سانس کھینچے زندہ اور تندرست ہیں۔

اس عجیب و غریب صورت حال نے ہر طرف ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔

سیین اور سندص دونوں اپنے بیٹے کو لے کر بہت پریشان تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا بچہ ابھی کتنے دن زندہ رہے گا۔

آج سے پہلے تک ان کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے کی کسی طرح سانس بحال ہو جائے مگر جب سے ہر طرف سے ایسی خبریں آرہی تھیں کہ اس بیماری کے شکار بچے صرف موت کے بعد سانس لیتے ہیں، انھیں ہر وقت یہ فکر رہنے لگی تھی کہ ان کا بیٹا بھی کہیں یک دم سانس نہ لینے لگے اور ہمیشہ کے لیے مردہ نہ بن جائے۔

سندص بار بار اس کے کمرے میں آکسیجن پمپ پہنے یہ چیک کرنے آتی کہ کہیں نومولود کی سانس تو نہیں بحال ہو گئی۔ سندص نے احتیاطاً سیین کو ایکسٹرا آکسیجن پمپ پہنا کر آج رات اسی کمرے میں سونے کے لیے کہا جہاں ننھا روعا سو رہا تھا۔

روعا ساری رات مزے سے سوتا رہا۔ صبح سویرے جب سیین کی آنکھ کھلی تو اس نے غور کیا، روعا اٹھا ہوا تھا اور حسب عادت پرسکون انداز میں انگوٹھا منہ میں دبائے کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں سندص بھی کمرے میں آگئی۔ اس نے روعا کو دودھ پلایا اور وہ دونوں میاں بیوی روعا سے کچھ دیر کھیل کر اپنے آکسیجن سپلائی والے کمرے میں چلے گئے۔

اتنے میں سیین کے فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوسری طرف ڈاکٹر بریت تھے۔ انھوں نے سیین اور سندص دونوں کو اسپتال آنے کو کہا اور ساتھ روعا کو بھی لانے کو کہا۔ وہ اور ان کی ٹیم کچھ اور ٹیسٹ کرنا چاہ رہے تھے۔

وہ دونوں روعا کو لیے جلد اسپتال پہنچے جہاں اس کے بہت سے ٹیسٹ ہوئے۔ پروفیسر نیل بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت اسپتال میں روعا کی طرح دس اور بچے بھی موجود ہیں اور ان کے بھی ٹیسٹ کیے جا رہے ہیں۔ آج کی تاریخ میں پوری دنیا میں اس نادر معذوری کے شکار بچوں کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہو چکی ہے جن میں سے زیادہ تر صحت مند ہیں اور بہت تھوڑے ہیں جو کسی وجہ سے بیمار ہیں اور بہت کم تعداد میں بچے

پیدا ہی مردہ ہوئے یا پیدا ہونے کے بعد مرے۔ پروفیسر نے بتایا کہ دنیا بھر کے سائنس دان سر جوڑے ان بچوں پر ریسرچ کر رہے ہیں کہ جلد جان سکیں، ان سب بچوں میں ایسا کیا مشترک ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بچہ سانس نہیں لیتا اور جو بھی بچہ پچھلے پانچ دن میں مرا، سب کی موت کے بعد سانس بحال ہونے کے پیچھے کیا وجہ ہے۔ پروفیسر نے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا کہ شاید ان تمام بچوں کے جینز اور ڈی این اے بھی ہم باقی انسانوں سے مختلف ہوں اور اسی اندیشے نے انھیں مجبور کیا کہ وہ آج یہ خاص ٹیسٹ کریں گے جو آج سے پہلے اس طرح کے تمام بچوں کا کبھی نہیں ہوا۔

"اس ٹیسٹ کے نتائج آنے میں چھ سے سات گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"

پروفیسر نیل نے کہا۔

سیین اور سندس دونوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک ٹیسٹ کے نتائج نہیں آ جاتے، وہ دونوں وہی انتظار کریں گے۔

اس دوران وہ باقی بچوں سے ملے اور دیکھ کر حیران رہ گئے کہ واقعی سب بچے بغیر سانس لیے انتہائی پر سکون انداز میں اپنے اپنے پنگھوڑے میں سلیقے سے لیٹے تھے۔

رات گئے جب ٹیسٹ کے نتائج آئے تو انھیں پروفیسر نیل نے بتایا کہ ٹیسٹ کے نتائج نے اس راز سے پردہ اٹھا دیا جو پچھلے کچھ دن سے معمہ بنا ہوا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ ان کا شک ٹھیک نکلا۔ ان بچوں کا ڈی این اے تمام دنیا کے انسانوں سے مختلف ہے۔ یہ تمام بچے ارتقا کی اس سیڑھی کو چڑھ چکے جس پر ان بچوں سے پہلے کا انسان ابھی تک نہیں چڑھ پایا تھا۔

"ان بچوں کے جینز، ان کا اندرونی نظام ہم سے کافی حد تک مختلف ہے۔ مگر تا حال ہم یہ وجہ نہیں جان سکے کہ یہ تمام بچے بغیر سانس کے کیسے زندہ اور صحت مند زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ ہی ہم ان کی اوسط عمر کے بارے میں ابھی کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امید ہے آہستہ آہستہ سائنس ان گتھیوں کو بھی ضرور سلجھا لے گی۔ فی الحال ابتدائی مرحلے میں صرف یہی

جان لینا اہم ہے کہ یہ نسلِ انسانی کی ایک نئی شروعات ہے اور ہم اور باقی تمام انسان جو اِن بچوں کے علاوہ آج زندہ ہیں، اپنی طرز کی آخری نسلِ انسانی ہیں جنھیں زندہ رہنے کے لیے سانس میں آکسیجن کھینچنے کی ضرورت ہے۔ یہ بچے مستقبل کے نئے انسان ہوں گے اور مجھے امید ہے اب جو بھی نیا بچہ پیدا ہو گا، وہ انھی بچوں کی طرح بغیر سانس لیتا انسان ہو گا۔ شاید نسلِ انسانی کی بقا کے لیے یہ ارتقا ضروری تھا۔ آکسیجن کے سلنڈر کمر پر ڈالے اب تک کا انسان پچھلے چھ سو سال سے اپنی زندگی گزار رہا تھا، مستقبل کے انسان ان سلنڈرز کے بغیر اپنی زندگی بغیر سانس کھینچے گزاریں گے۔"

سین اور سندص پروفیسر نیل کی بات بہت غور سے سن رہے تھے اور بار بار حیرت سے اپنے بیٹے روعا کو بھی دیکھ رہے تھے۔ روعا بھی منہ میں انگوٹھا ڈالے مزے سے ساری گفتگو سن رہا تھا۔

اگلے دن حیرت انگیز طور پر روعا نے باتیں شروع کر دیں۔ صرف دو ہفتہ بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گیا۔ روعا ایک فرماں بردار بیٹا تھا۔ ہمیشہ اپنے ماں باپ کی ہر بات کو تابعداری سے سنتا اور اس پر عمل کر تا۔

ماہ و سال یونہی بیتتے گئے۔ روعا سولہ سال کا نوجوان بن چکا تھا اور اس کا باپ سین بوڑھا اور بیمار ہو رہا تھا۔ روعا اپنے باپ کی ہمیشہ تیمارداری کرتا اور اس کا ہر طرح کا خیال رکھتا مگر بظاہر اس کے باپ کی موت کا وقت قریب تھا اور آخر ایک دن وہ پھیپھڑوں کے سرطان سے مر گیا۔ روعا باپ کی موت کے بعد بہت افسردہ رہنے لگا۔ اس کی ماں سندص بھی بوڑھی اور بیمار رہنے لگی تھی۔ ایک دن وہ بھی اسی بیماری کے ہاتھوں موت کی وادی میں چلی گئی۔

روعا دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ اسے اس کی ایک کالج کی دوست نوئی نے اس مشکل وقت میں اس کو سہارا دیا۔

نوئی اور روعا ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ دونوں کی عمریں بالترتیب سترہ اور اٹھارہ برس تھیں۔ دونوں نے ایک ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

کچھ دن سے روعا کے گلے میں تکلیف تھی۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو معلوم ہوا اس کی سانس کی نالی جو ان بچوں میں بند ہوتی ہے، آہستہ آہستہ کھلنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا اگر آپریشن کر کے اس سوراخ کو بند نہ کیا گیا تو وہ یک دم سانس لینے کی وجہ سے فوراً مر بھی سکتا ہے۔ روعا نے ڈاکٹر کی بات کو زیادہ سیریس نہیں لیا اور واپس گھر لوٹ آیا۔ مگر رات گئے اس کی طبیعت زیادہ بگڑنے لگی۔ نوئی نے بہت کوشش کی مگر وہ روعا کو نہ بچا سکی۔ اس کی سانس کی نالی مکمل کھل چکی تھی۔ جونہی اس نے سانس لینا شروع کیا، اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ نوئی نے اس کے منہ پر ہاتھ اور پھر تکیہ رکھا اور بہت کوشش کی کہ اس کا منہ اور ناک بند رہے اور اس کا سانس گھٹا رہے مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اگلے کچھ منٹوں میں روعا منہ کھولے گہری سانس لے رہا تھا۔ اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔

اگلے دن پتا لگا وہ تمام بچے جو روعا کی تاریخ پیدائش میں پیدا ہوئے، سب اچانک سانس لینے کی وجہ سے مر چکے تھے۔

ڈاکٹرز اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اس خاص طرح کے جینز اور ڈی این اے کے حامل بچے بچیوں کی حد عمر اٹھارہ سال ہے۔

اٹھارہ سال بعد ان کی سانس کی نالی کسی خاص وجہ سے کھل جاتی ہے اور یہ بچے سانس لیتے ہی دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔

ان نتائج کی روشنی میں پیدائش کے کچھ سال بعد تمام بچوں کو گلے کا آپریشن کروانا لازمی کر دیا گیا جس کے بعد سانس کی نالی مکمل طور پر بند رہ سکتی تھی۔ ہر سال بچوں کو سانس کی نالی چیک کرنے کا بھی مشورہ دیا گیا تا کہ شرح اموات کو اٹھارہ سے بڑھا کر زیادہ کیا جا سکتا۔

بیل کی زندگی!

ایک بیل بچپن سے ہی صنوبر کے درخت سے بے حد متاثر تھی۔ اسے اس کی عظمت، قد کاٹھ اور شان دیکھ کر ہمیشہ رشک آتا۔

بیل کا بس نہ چلتا تھا، کسی طرح وہ بھی درخت جیسی لمبی اور قد آور بن جائے۔
درخت بھی چھوٹی سی بیل کو دیکھ کر جو ابھی پھلنا شروع ہی ہوئی تھی، اس کی ہمت بندھاتا اور سمجھاتا کہ وہ بھی اگر درخت کی نصیحتوں پر دھیان دے اور صبر سے کام لے تو ایک دن درخت کی طرح لمبی اور خوش و خرم زندگی پا سکتی ہے مگر اس کے لیے اسے اپنی جلد بازی کی عادت چھوڑنی پڑے گی۔

درخت نے بیل کو پہلا سبق یہ یاد کرنے کے لیے دیا کہ ہمیشہ اپنے پاؤں اور جڑوں کو مضبوط رکھ، صرف پھیلنا تیری دائمی بقا کی ضمانت نہیں۔

مگر بیل جلد از جلد درخت کی طرح کسی طرح اونچی لمبی ہونا چاہتی تھی۔ دن بھر اس کی توجہ اپنے پھیلاؤ پر رہتی۔ کبھی درخت کی کسی شاخ پر گھومتی کبھی کسی پر۔ درخت اس کی جلد بازیاں دیکھ دیکھ کر مسکراتا۔

ایک دن بیل نے کسی طرح گھوم گھام کر درخت کے آخری سرے تک رسائی کر لی۔
وہ اپنی اس فتح پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ درخت کو دیکھ کر غرور سے بولی:

"کیوں جناب درخت، اب کیا کہتے ہو؟ اتنی جلدی میں تمھارے سر تک پہنچ گئی۔ تم نے جو قد کاٹھ صدیوں میں نکالا، میں نے دنوں میں حاصل کر لیا۔"

یہ کہ کر وہ بڑی شان اور تمکنت سے ہنسنے لگی۔

"ہاہاہا۔۔۔"

صنوبر کے درخت نے مسکرا کر کہا:

"اس میں شک نہیں بھولی بیل کہ تُو بہت جلد میرے قد کے برابر پہنچ گئی اور ممکن ہے تُو مجھ سے بھی زیادہ لمبی ہو جائے مگر شاید تو میرا سکھایا پہلا سبق بھول گئی کہ پھیلنا بقا کی ضمانت ہرگز نہیں۔ تُو نے نہ ہی اپنے تنے کو مضبوط بنانے پر کوئی توجہ دی اور نہ ہی جڑوں کو۔"

بیل نے ہنس کر جواب دیا:

"اے میرے بوڑھے استاد صنوبر! مجھے اپنے تنے اور جڑوں کی مضبوطی سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ میں دنوں میں تجھ جیسی لمبی بن گئی۔ ویسے بھی تنے اور جڑوں کو کون دیکھتا ہے؟"

درخت نے مسکرا کر کہا:

"اے نادان بیل تُو صرف دو ماہ کی برسات کی زندگی کو پوری زندگی سمجھ بیٹھی۔ تُو شاید بھول گئی اور ابھی موسموں کی اونچ نیچ سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔"

"موسم کی اونچ نیچ! وہ کیا امر ہے؟"

بیل نے حیرت سے کہا۔

"اری میری بھولی بیل، آج کل برسات ہے، تُو نے اس برسات میں اپنی پوری توجہ پھیلنے پر لگا دی۔ تجھے جو جگہ ملی، تُو اس پر آنکھ بند کر کے لپٹ گئی جبکہ میں تجھے کہتا رہا کہ اپنی ساری توانائی تنے کو مضبوط کرنے پر لگا مگر تُو نے اپنی ساری توانائی ارد گرد گنجلک انداز میں پھیلنے پر لگا دی۔ کیا تیرا تیری جڑ سے اب کوئی رشتہ باقی بچا ہے؟"

"کیا تجھے میری طرح زمین کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے؟"

"کیا تُو میری طرح تیز ہوا کے تھپیڑوں کو سہ پائے گی؟"

"کیا تُو آنے والے گرم موسم، تیز جلا دینے والے موسموں کی دھوپ سہار پائے گی جنھیں میں صدیوں سے پچھاڑتا آیا ہوں؟"

بیل نے صنوبر کی باتیں سن کر اپنا منہ پیٹ لیا۔ بولی:

"آہ یہ میں نے کیا کر ڈالا؟"

"کاش میں ابتدا میں تیری نصیحت پر عمل کرتی۔"

بیل نے یہ کہہ کر یہ شعر پڑھا:

میں تو سمجھی تھی کہ بس ایک ہی موسم ہے یہاں
کاش میں ساری رُتوں کے لیے پیدا ہوتی

یہ شعر پڑھ کر بیل نے صنوبر کے درخت کے گرد پھیلایا اپنا سارا جال اور گھیرا چھوڑ دیا۔ اسی دوران اچانک بادل چھٹے اور تیز دھوپ کی کرنوں نے بیل کو کچھ گھنٹوں میں ہی پہلے جلا کر سبز سے پیلا کیا اور پھر تیز ہوا کے تھپیڑوں نے پوری بیل کو دیکھتے ہی دیکھتے خاکستر کر دیا۔

Jumngundal Family Tree

لاجی اور کاجی مندل خاندان کے چشم وچراغ تھے جو باپ کی اچانک موت کے بعد سے بچپن ہی میں تعلیم کی غرض سے ولایت چلے گئے تھے۔ کچھ دن پہلے جب وہ اپنے آبائی گھر واپس آئے تو وہ اکثر اپنے دادا کے ساتھ وقت بتانے لگے۔ دادامانیا کی عمر لگ بھگ ایک سو دو سال کی ہو گی مگر دادامانیا اب بھی کافی حد تک صحت مند تھے۔

دادامانیا نے ایک روز دونوں پوتوں کو اپنے پاس بلایا اور انھیں بتایا کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہ رہیں گے اس لیے وہ ان دونوں کو ان کا کچھ خاندانی پس منظر بتانا ضروری سمجھتے ہیں۔ دادامانیا نے انھیں بتایا کہ وہ دونوں کسی عام خاندان سے نہیں بلکہ ان کی رگوں میں مندل خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس لیے وہ اپنی خاندانی میراث کو کبھی مت بھولیں اور ایک بات یاد رکھیں کہ گندل خاندان جو مندل خاندان کا پرانا دشمن ہے، وہ دونوں جتنا ممکن ہو ان سے دور رہیں اور کبھی ان سے میل جول نہ رکھیں۔

لاجی جو چھوٹا تھا، اس نے پوچھا:

"دادا جی گندل خاندان کیا ہے اور ہماری اور ان کی دشمنی آخر ہے کیوں؟ اور یہ کب اور کیسے شروع ہوئی؟ ذرا تفصیل سے بتائیں!"

دادامانیا نے لاجی اور کاجی کو اپنے اور قریب بلایا اور دونوں کے کندھے پر ہاتھ رکھتے

ہوئے بولے:

"لا.جی، کا.جی!! میرے پیارے پوتو، آج میں تم کو ہمارے دشمن گندل خاندان کے ظلم وستم کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ جسے سن کر یقیناً تم دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ پیارے بیٹو! آج سے ساڑھے چار سو سال پہلے۔۔۔"

لا.جی اور کا.جی دونوں یک زبان ہو کر حیرت سے بولے:

"ساڑھے چار سو سال پہلے؟"

دادا امانیا نے ڈانٹتے ہوئے کہا:

"پہلے بات سنو، ٹوکو نہیں!"

لا.جی اور کا.جی دونوں خاموش ہو گئے۔ دادا امانیا نے لمبی سانس لی اور بولے:

"ہاں میرے شیر دل بیٹو، ساڑھے چار سو سال پہلے۔۔۔ مندل اور گندل خاندان ایک ہی خاندان ہوا کرتا تھا۔ ہمارے لگڑ لگڑ لگڑ جمگندل جو اس خاندان کے سربراہ تھے، ایک بہت ہی امیر زمین دار اور معروف ہستی تھے۔ پورے گاؤں میں سب لوگ ان کے مرید تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ مندل، گندل اور چندل۔ مندل سے ہماری نسل چلی اور ان لعینوں کی گندل سے اور چندل بے اولاد رہے اور جوانی میں ہی وفات پا گئے۔"

"اچھا، پھر کیا ہوا دادا جی؟" لا.جی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

دادا امانیا بولے:

"بیٹے ہونا کیا تھا، گندل شروع سے ہی بری فطرت رکھتا تھا۔ وہ گاؤں میں غریب لوگوں پر ظلم وستم کرتا اور اُن کا استحصال کرتا تھا جبکہ مندل اسے ہمیشہ ٹوکتے کہ یہ ظلم وستم ٹھیک نہیں۔ مندل ہمیشہ غریب لوگوں کی مدد کرتے، اگر کوئی بیمار ہوتا اس کی تیمار داری کرتے اور لوگ ان کی عزت بھی کرتے جبکہ گندل سے صرف ڈرتے۔ ہمارے جدِ امجد جمگندل گندل کو سمجھاتے کہ یہ طریقہ زندگی ٹھیک نہیں۔ غریب غربا کو تنگ نہ کیا کرو مگر وہ ان کی بھی کوئی بات نہ مانتا اور محکوموں پر ظلم وستم سے باز نہ آتا۔

"مندل ماں باپ اور دادا کے لاڈلے تھے۔ گندل کو ان کا ہر ایک کی آنکھ کا تارہ ہونا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اوپر سے سب گاؤں والے انھیں عزت بھی دیتے تھے۔ اسی کشمکش میں دونوں بھائیوں کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد گندل اور تمھارے دادا مندل کے اختلافات اور زیادہ بڑھ گئے۔ ان کے والد نے دونوں بھائیوں میں جائیداد برابر تقسیم کر دی۔ مندل کو اپنی آبائی گدی دے دی اور گندل کے ذمے فصلوں کی دیکھ بھال لگائی۔

"گندل نے فصلوں کی دیکھ بھال کی آڑ میں پورے گاؤں میں دہشت اور بربریت کا بازار گرم کر دیا۔ اس دوران تمھارے لگڑ لگڑ لگڑ دادا جمگندل وفات پا گئے اور کوئی مندل کا ساتھ دینے والا گاؤں میں نہ بچا۔"

دادا مانیا نے روتے ہوئے کہا:

"بیٹا اس کے بعد کے واقعات دل دہلا دینے والے۔ ہیں ایسے کہ اگر زمین سنے تو اس کا سینہ غم سے چاک ہو جائے، آسمان سنے تو وہ پھٹ پڑے۔"

کاجی جو پوری بات بڑی دل جمعی سے سن رہا تھا، اس کی آنکھیں بھی دادا مانیا کی دیکھا دیکھی ڈبڈبا گئیں جبکہ لاجی نے آئس کریم کا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے دادا مانیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"مگر دادا جی اب تو اس بات کو چار پانچ سو سال گزر چکے ہیں نا۔"

دادا مانیا نے لاجی کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا:

"ہاں بیٹا۔ چار سو ستاون سال، آٹھ ماہ اور سات دن۔ لیکن آج بھی یہ زخم اسی طرح ہرے ہیں۔"

"ایسا کیوں دادا جی؟"

لاجی نے حیرت سے پوچھا تو دادا مانیا نے آنسو پوچھتے ہوئے کہا:

"میرے بہادر بیٹو، گندل اور اس کی اولاد نے ہمارے بزرگوں کو گاؤں بدر کر دیا۔ میرے بچو! اُس گاؤں سے، جہاں ہماری سات سو سال پرانی قبریں ہیں۔"

لا جی نے دوبارہ لقمہ دیا:

"دادا جی ویسے وہ گاؤں اب ہے کہاں؟"

دادا جی نے روتے ہوئے کہا:

"بیٹا اب نہ وہ گاؤں ہے نہ وہ قبریں، گندل اور اس کی خبیث اولاد نے ان سب قبروں کو مسمار کر کے وہاں اپنے گھر بنا لیے اور وہ علاقہ یہاں سے ہزاروں میل دور کہیں ہے۔"

"ہیں۔۔۔اتنی دور؟"

لا جی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں مرے شیر جوانو!"

دادا امانیا روہانسی آواز میں بولے۔

"میرے بہادر بچو! جیسا میں نے کہا گندل ایک گرا ہوا انسان تھا۔۔۔"

"تو دادا جی ہمارے لگڑ لگڑ لگڑ دادا کا کیا نام بتایا تھا آپ نے؟ ہاں یاد آیا، مندل! وہ پھر کبھی اس گاؤں واپس نہ آسکے؟"

لا جی نے بھرپور دلچسپی دکھاتے ہوئے دادا امانیا سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، آئے تھے، کیوں نہیں۔ وہ آئے اور بڑی شان سے آئے۔"

"اچھا!" کا جی نے پوری آنکھیں کھول کر کہا۔

"پھر کیا ہوا؟" لا جی نے پوچھا۔

دادا امانیا بولے:

"ہاں بیٹا پھر گاؤں والوں نے گندل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور ہمارے لگڑ لگڑ لگڑ دادا مندل دوبارہ اپنی گدی پر بیٹھ گئے۔ مگر گندل نے ہار نہ مانی اور اپنے بچوں کے دل میں مندل اور اس کی اولاد کے لیے نفرت کا ایسا بیج بو دیا جس کا خمیازہ ان کی اولاد قندل اور ان کے اہل خانہ کو بھگتنا پڑا۔"

"قندل! دادا جی یہ تو آپ کے والد کا نام نہیں ہے، کہیں سنا ہے میں نے۔"

کا.جی نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

"جی میرے شیر دل، قندل ہمارے آباواجداد میں سے ایک تھے جن کا نام ہم بار بار رکھتے ہیں۔ قندل جو بہادری میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔"

"اچھا دادا جی! اتنے بہادر تھے ہمارے لگڑ لگڑ دادا قندل؟" کا.جی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دادا امانیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرے شیر بیٹو، وہ اپنی مثال آپ تھے۔ پورے گاؤں میں کوئی ایک بھی مائی کا لال ایسا نہ تھا جو قندل سے مقابلہ کر سکتا۔"

"ہیں دادا.جی؟" لا.جی نے آئیس کریم کا آخری چمچ لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹے وہ اکیلے دو بیلوں کو اپنے مکے سے روک لیتے تھے۔"

"نہ کریں دادا.جی۔" لا.جی نے بہ مشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

دادا.جی چہرے پر غصہ دکھاتے ہوئے بولے:

"بیٹے وہ بہادروں کے بہادر تھے۔ کوئی ان سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا تھا پورے گاؤں میں۔ یہ کوئی مذاق نہیں حقیقت ہے۔"

"حقیقت ہے؟"

لا.جی نے تھوڑا اٹکا کر کہا۔

کا.جی نے لا.جی کو غصے سے دیکھا اور لا.جی خاموش ہو گیا۔

"بیٹا مگر گندل بہت سازشی اور عیار انسان تھا۔ اس نے ایک کرائے کے قاتل کے ہاتھوں قندل کو جب وہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے جھکے ہوئے تھے، پیچھے سے وار کروا کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پورا گاؤں قندل کے لیے غمگین تھا۔" دادا.جی نے آنکھ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

دادا.جی کی دیکھا دیکھی کا.جی کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

لا.جی نے دادا امانیا کو حوصلہ دیا اور بولا:

"دادا جی آپ کیوں پریشان ہیں، یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ دادا جی وہ دور تو کب کا گزر گیا۔ چار پانچ سو سال پرانی بات پر اب تک کیوں غمگین ہوتے ہیں آپ؟"

دادا جی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"کیا بکتے ہو تم لاجی۔ کیا ہمیں اپنے عظیم آباو اجداد کو بھول جانا چاہیے؟"

"نہیں دادا جی، ضرور یاد رکھیں مگر اتنا افسردہ ہونے کا اب کیا مطلب باقی ہے۔ یہ تو کافی پرانی بات ہے نا، کہ نہیں؟" لاجی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"پرانی بات، پرانا ظلم، کیا ہم بھلا دیں؟ کیسی عجیب بات کر رہے ہو تم لاجی؟"

دادا امانیا غصے سے تھر تھر کانپنے لگے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے:

"گندل اور اس کی اولاد نے نہ صرف بہادر اعظم قندل کو دھوکے سے مارا بلکہ ان کے برخوردار حندل، ان کی تین بیویوں اور ان کے آٹھ بچوں کو بھی گاؤں میں سب کے سامنے قتل کر دیا۔"

کاجی یک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔ لاجی کا منہ بھی کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

"تین بیویاں۔۔۔" لاجی نے حیرانی سے کہا۔

"کیا مطلب دادا جی، کیا ہمارے لکڑ دادا حندل کو بھی دھوکے سے مار دیا گیا تھا؟"

کاجی نے دونوں مٹھیاں زور سے بھینچتے ہوئے، ایک مٹھی دانتوں میں دبائے روتے ہوئے پوچھا۔

دادا امانیا کی رورو کر ہچکی بندھ گئی۔ کچھ دیر بعد بولے:

"ہاں مرے بیٹو، ان کو بھی نہ چھوڑا۔ ظلم کی اخیر کر دی ظالموں نے۔"

لاجی نے افسردہ ماحول بہتر کرنے کے لیے پوچھا:

"دادا جی، تو آپ کے خیال میں ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟"

"کیا کرنا چاہیے؟"

دادا امانیا غصے سے اونچی آواز میں بولے:

"یہی کہ انھیں یاد رکھو اور گندل خاندان سے میل جول نہ بڑھاؤ۔"

"لیکن دادا جی۔۔۔"

لاجی نے کچھ بولنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔"

دادا ما نیا نے غصے سے لاجی کی طرف گھورتے ہوئے کہا:

"تو کیا ہم اپنے آباواجداد جمنگندل، مندل، قندل اور حندل کی قربانیوں کو بھول جائیں؟"

دادا ما نیا نے زور زور سے روتے ہوئے لاجی اور کاجی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کاجی جو خود بھی پھوٹ کر رو رہا تھا، بولا:

"ہر گز نہیں دادا جی، ہر گز نہیں۔ میں کبھی نہیں بھولوں گا اور خاندان گندل کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

کاجی نے دیوار پر غصے سے زور سے مکا مارا اور روتے ہوئے بولا:

"دادا جی میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، میں اپنے آباو اجداد کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

یہ کہہ کر کاجی دادا جی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کاجی کبھی مندل دادا کبھی قندل دادا اور کبھی حندل دادا کو یاد کر کے روتا۔

لاجی نے بہتر سمجھا کہ دونوں کو کچھ دیر اکیلا چھوڑ دے۔

لاجی کو اچانک موبائل پر ایک نوٹی فیکشن آیا۔ کھولا تو ایک فرینڈ ریکوئسٹ آئی ہوئی تھی۔ فیس بک پر کھولا تو نیلی گندل نامی ایک خوبرو لڑکی کی ریکوئسٹ تھی۔ لاجی کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا مگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ریکوئسٹ گندل ذات کی کسی لڑکی کی تھی، اس نے اسے قبول کر لیا۔

پیچھے کمرے میں کاجی اور دادا جی بہت دیر تک پانچ سو سال پرانے قصوں پر روپیٹ رہے تھے۔

Town of Khoor

خور نامی قصبہ اپنے رسم ورواج کی وجہ سے اپنے ارد گرد پھیلے دوسرے قصبوں سے کافی مختلف تھا۔ خور قصبے کے باشندے جو خود کو خوری کہتے تھے، غیر لوگوں سے میل ملاپ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ قصبہ اور اس کی تاریخ کتنی پرانی تھی، جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ خور قصبے کے کچھ باشندوں کے بقول ان کے آباواجداد جنات کی اس نسل سے تھے جن کی شادیاں ہزاروں سال پہلے انسانوں سے ہوئیں اور ان کی اولاد خوری کہلائی۔ خوری اپنے خوری نسل ہونے پر اور اپنی روایات اور رسم ورواج پر بے حد فخر کرتے تھے۔

خوری رسم ورواج میں موت کے بعد مردوں کا گوشت پکا کے کھلانے کی عجیب و غریب رسم رائج تھی۔ خوریوں کے بقول انسان کے مرنے کے بعد اس کا جسم صرف کھانے سے مردے کی روح کو تسکین پہنچ سکتی ہے۔ زمین میں مردے کو گاڑنا یا مردے کو جلانے کو وہ مردے کی توہین سمجھتے تھے۔

خوریوں کے یاں قریب المرگ انسان کے ارد گرد بڑے بڑے چھروں کے ساتھ رقص کیا جاتا اور آگ کا الاؤ جلایا جاتا ہے۔ قریب المرگ لاعلاج مریضوں کے جسم پر مختلف گرم مصالحے، نمک اور سرکہ لگایا جاتا ہے۔ ان کا ماننا تھا اس عمل سے موت کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے اور روح آسانی سے جسم سے نکل جاتی ہے۔

خوری موت کے فوراً بعد عقیدت سے جسم کو کاٹ کر اس سے مختلف طرح کے پکوان بناتے اور تمام مہمان مل کر عقیدت سے یہ پکوان کھاتے۔ آخر میں اجتماعی دعائیں پڑھی جاتیں۔ مردے کا سب سے بڑا بیٹا سب سے پہلے مردہ جسم میں سے دل نکال کر اسے کچا کھاتا۔ خوریوں میں 'دل چبائی' نامی یہ رسم بہت عقیدت و احترام اور انتہائی خوش و خضوع سے ادا کی جاتی تھی۔

خوری اپنے مردوں کی ہڈیاں اپنے پالتو جانوروں کو کھلا کر سات دن میں اس مردہ جسم کو کسی بھی حال میں ختم کرنے کے مذہبی قانون کے پابند ہوتے تھے۔ چونکہ اس رسم کو ادا کرنے کی اجازت انھیں صرف اپنے قصبے میں تھی، اس لیے خوری ہمیشہ کسی بھی حال میں اپنے قصبے میں ہی مرنا پسند کرتے تھے۔

میری خوریوں کے بارے میں معلومات کے پیچھے میرا بچپن کا ایک عزیز دوست تھا، سنجص۔ وہ اسکول کے زمانے سے میرا دوست بنا تھا اور انتہائی اچھے اخلاق کا مالک تھا۔ ہم نے اکٹھے ایک ہی کالج سے تعلیم مکمل کی اور پھر ہم دونوں بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی ایک ساتھ آگئے تھے۔۔۔

آج سنجص نے مجھے اپنی طرف رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ کھانے کے بعد بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا، جو بحث میں بدل گیا۔ ماضی میں بھی ہم دونوں اکثر مختلف موضوعات پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔

سنجص خوری سے آج پھر میری بحث ہو رہی تھی کہ آج کے اس جدید دور میں اتنا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود وہ کیسے اس قسم کی آدم خوری کو ایک متبرک رسم سمجھ سکتا ہے؟

سنجص نے فوراً میری تصحیح کی کہ خوری قوم آدم خور قطعی نہیں ہیں، وہ صرف اپنے مردوں کا گوشت کھا کر ان کی روح کو تسکین پہنچاتے ہیں اور اس میں کوئی ایسی بری بات نہیں۔

"بری بات نہیں؟"

میں نے فوراً کہا۔
میں سنجبص کی تاویل سن کر بالکل حیران رہ گیا اور دل میں سوچا کہ یہ سُوٹڈ بُوٹڈ شخص کس طرح ایسی واہیات خونی رسم کا دفاع کر سکتا ہے۔
میں نے کہا: "سنجبص، اچھا یہ بتاؤ کہ یہ رسم کتنی پرانی ہے؟"
سنجبص نے کہا: "یہ ہزاروں سال سے رائج رسم ہے۔"
میں نے کہا: "تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ تمھارے قصبے کی تاریخ اور محل وقوع پر تمام آرکیالوجسٹ متفق ہیں کہ یہ علاقہ حد دو اڑھائی سو سال پہلے آباد ہوا ہے۔ تم کیسے دعویٰ کر سکتے ہو کہ یہ قصبہ ہزاروں سال پرانا ہے؟"
سنجبص نے جواب دیا:
"میں نے اپنے والدین سے سنا ہے اور انھوں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ یہ علاقہ دنیا کا وہ خاص مقام ہے جہاں انسانوں سے بھی بہت پہلے جنات آباد ہوا کرتے تھے اور ہمارے آباو اجداد جب یہاں آکر آباد ہوئے تو ان کی اور جنات کی اسی قصبے میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں بہت سے جن اور انسان مارے گئے تھے۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ جنگ تین سو ستر سال پانچ ماہ تک جاری رہی۔ اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے ہمارے آباواجداد اور جنات کے مابین ایک تاریخی معاہدہ بھی طے پایا تھا جس کا ثبوت وہ پتھر کی سلیٹ ہے جس پر وہ معاہدہ آج بھی محفوظ پڑا ہے، جو آج بھی خور قصبے میں کاہن کے پاس ایک تبرکات والے صندوق میں موجود ہے۔ ہر ماہ چاند کی نو تاریخ کو اسے نکالا جاتا ہے اور خوری اس کے ارد گرد اپنا مخصوص رقص کرتے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت جنات نے ہماری انسانی لڑکیوں سے شادیاں کرنے کی شرط رکھی تھی اور بدلے میں ہم انسانوں نے جنات کی لڑکیوں سے شادیاں کرنی تھیں۔ اس ادلا بدلی کی شادیوں کے بعد امن قائم ہوا جو آج تک قائم ہے۔ اسی لیے ہم آدھے انسان اور آدھے جن ہیں۔"
میں سنجبص کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ سنجبص جو اَب ایک قابل ڈاکٹر تھا اور پی

ایچ۔ڈی کی تیاری کر رہا تھا، وہ کس قسم کی بچگانہ باتوں پر یقین رکھتا ہے۔ میں یہ سوچ کر ہی پریشان ہو گیا۔ میں نے سنجبس سے کہا:

"سنجبس اگر تم واقعی آدھے جن آدھے انسان ہو تو تمھارا ڈی این اے تو بالکل اچھوتا ہو گا! نہیں؟"

سنجبس نے کہا:

"ہو سکتا ہے، میں نے کبھی چیک نہیں کروایا۔"

"ضرور کرو۔"

میں نے ہولے سے کہا۔

پھر میں نے، بات کو بدلا اور کہا:

"سنجبس، کیا انسانی گوشت مزیدار ہوتا ہے؟ پڑھا تھا کہیں۔۔۔"

سنجبس نے کہا:

"وہ مزے کے لیے نہیں، صرف عقیدت کے لیے اپنے مردوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کے اس عمل سے کسی غیر کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے مردے ہیں، ہم جو چاہے کریں۔ باقی لوگ اپنے مردوں کو آگ میں جلا کر راکھ کر دینے اور مٹی میں گاڑ دینے جیسے ناقابلِ یقین حد تک کریہہ اور خوف ناک عمل کھلے عام کرتے ہیں، تمھیں اس پر حیرت نہیں ہوتی؟ ہم تو عزت و احترام سے اپنے پیاروں کا گوشت کھا کر اسے اپنے جسم کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ کیا تم اتنی بنیادی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟"

سنج نے ناراضگی کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی اس قدر ناراضگی دیکھتے ہوئے کچھ دیر خاموش ہونا بہتر سمجھا۔

کچھ دیر بعد میں نے سلسلۂ کلام یہ کہہ کر شروع کیا:

"سنجبس، تمھارے قصبے میں جرائم کی شرح بہت ہی کم ہے۔ اس کے پیچھے کیا راز ہے یار؟؟"

سنجص نے بتایا کہ ان کے خور قصبے میں چوری چکاری، جھوٹ، مکاری، دغابازی، رہ زنی، قتل، دھوکہ دہی کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور اس کی وجہ ان کے کاہن سردار ہیں۔ مزید اس نے کہا:

"ہمارے کاہن سردار بندص خوری ہر ہفتے تقریر میں ان گناہوں کے انجام پر بات کرتے ہیں۔ ہمارے یاں چوری کی سزا زندہ دفن کرنا ہے اور قتل کی سزا آگ میں زندہ جلانا ہے۔ خوری لوگوں کے لیے زمین میں دفن یا آگ میں جلنے جیسے انجام کا سوچنا بھی ایک ہولناک عذاب سے کم نہیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے بچپن میں ایک خوری لڑکے نے ایک بکری چرائی تھی، جس کا الزام ثابت ہونے کے بعد اسے زمین میں دفن کرنا تھا مگر اس گھناؤنے انجام کا سوچ کر ایک دن پہلے ہی اس کے خاندان نے خود ہی اسے مارے کر اور کھا کر ختم کر دیا اور وہ زمین میں دفن ہونے کے بھیانک انجام سے بال بال بچ گیا۔"

یہ بات سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

میں نے کہا:

"سنجص، فرض کرو تم یہاں مر جاتے ہو تو تمھارے جسم کا کیا کیا جائے گا؟"

سنجص نے کہا"

"ڈاگر نہ کرے کبھی ایسا ہو۔"

میں نے کہا:"ڈاگر؟ یہ کیا ہے؟"

سنجص نے کہا:

"ڈاگر ہمارے سب سے طاقت ور دیوتا کا نام ہے۔"

"ہاں ہاں، یاد آیا، یاد آیا۔ میں نے سنا ہوا ہے یہ نام پہلے تم سے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سنجص بولا:

"اگر مجھے یہاں کچھ ہو جائے تو ڈاگر راہ وعدہ کرو تم میرا جسدِ خاکی میرے وطن خور

پہنچادوگے تاکہ میرے خاندان والے میری آخری رسومات خوری طریقہ کار سے ادا کر سکیں اور میری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پر سکون رہ پائے۔"

سنجبص نے روہانسی آواز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے فوراً اُس کا ہاتھ پکڑا اور اُسے دباتے ہوئے کہا:

"کیسی بات کرتے ہو تم۔ بھلے چنگے ہو، مریں تمھارے دشمن!"

یہ کہہ کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا اور نظروں کے سامنے ننگ دھڑنگ سنجبص دکھائی دیا جس کے جسم پر نمک مرچ مصالحے لگائے جارہے ہیں اور برابر میں چھریاں تیز کی جارہی ہیں۔ یہ سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آگئی۔

اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے سنجبص سے کہا:

"سنجبص یار، میرا ایک مشورہ ہے اگر تم مانو تو۔ اپنا جسم عطیہ کر دو، تمھارے مرنے کے بعد کسی کے کام آجائیں گی ساری چیزیں اور تمھارا موت کے بعد کا خوف بھی جاتا رہے گا۔

سنجبص نے میری بات سنی اور بولا:

"ہاں، مگر مذہبی رسومات کون ادا کرے گا جس سے میری روح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات ملے گی؟"

"اس کی فکر نہ کرو۔"

میں نے فوراً کہا۔

"وہ تو کیا جاسکتا ہے، باقی ماندہ جسم تمھارے خاندان کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ اسے پالتو کتوں کو کھلائیں یا خود کھائیں، ان کی سر دردی ہے۔"

میں نے سنجبص کو قائل کرنے کے لیے اسی کی توضیحات اسی کی زبان میں اسے بتائیں۔

"ہمم م م م۔"

سنجبص کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے سنجص کو مزید قائل کرنے کے لیے کہا:

"سنجص فرض کرو تم مر جاتے ہو، تو تمھارے جسدِ خاکی کو بھیجنے کا اچھا خاصہ خرچہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ مگر جو میں کہہ رہا ہوں، اس صورت میں تم ان اخراجات سے بھی بچ جاؤ گے اور تمھارا جسم بھی محفوظ ہو جائے گا۔ یہاں ایسے کیسز بھی دیکھنے میں آئے ہیں جب ہوائی کرایہ نہ ہونے پر مردے کو یہیں آس پاس جلادیایا پھر دفن کر دیا جاتا ہے۔"

"نہیں نہیں، میں مرتا مر جاؤں گا مگر زمین میں گڑنا قطعی پسند نہیں کروں گا۔ جل کر کوئلہ بننا بھی مجھے منظور نہیں۔ توبہ توبہ، کیا جہالت ہے اس دنیا میں۔" سنجص نے خوف زدہ لہجہ سے کہا۔

"تو تم کون سا بستر مرگ پر ہو جو اتنا گھبرا رہے ہو؟"

میں نے سنجص کا خوف دور کرنے کے لیے فوراً کہا۔

"ہاں وہ تو بات ٹھیک ہے۔۔۔"

سنجص نے قدرے نارمل انداز سے کہا۔

میں نے کہا:

"لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنا جسم ڈونیٹ کر دو۔"

میں نے پھر زور دے کر کہا۔

"ٹھیک ہے، مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

سنجص نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بس ایک چھوٹا سا پراسیس ہے اور اندراج کروانا ہے اور بس۔"

"اچھا! چلو کل کرواتے ہیں دونوں۔"

سنجص نے گہری سانس باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"دونوں؟"

میں نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو کیا، تمھیں ڈر لگتا ہے؟"

سنجص نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے کس بات کا ڈر؟ دبا دو، یا جلا دو۔۔۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"توبہ توبہ، تم کیسے انسان ہو؟ زمین میں دبنا اور کوئلہ بن کر جلنا منظور ہے تمھیں۔ ڈاگر مجھے معاف کرے۔"

سنجص نے جھرجھری لیتے دونوں کانوں پر انگلیاں رکھتے ہوئے کہا۔

میں کھکھلا کر ہنسنے لگا۔ میں نے کہا:

"لیکن کسی کے کام آنا بھی ایک نیکی ہے۔ میں مذاق کر رہا تھا سنجص۔ یقیناً میں بھی جسم عطیہ کرنا چاہوں گا۔ ہم کل ہی چلیں گے۔"

یہ کہہ کر میں سنجص کے گھر سے نکل گیا۔ راستے میں کافی خوش تھا کہ چلو مرنے کے بعد اس عجیب رسم کی وجہ سے سنجص کا گوشت چیر پھاڑ کر کے چبایا تو نہیں جائے گا بلکہ اس کے عطیہ کردہ اعضاء سے کسی دوسرے کی جان بچائے جانے کا موقع ضرور ہو گا۔ میں کافی خوش تھا۔

اگلے ہی دن میں سنجص کو لے کر متعلقہ ادارے میں گیا اور اپنا اور سنجص کا نام رجسٹر کروایا۔ وہاں موجود افسر ہم دونوں کو حیرت سے تکنے لگا۔ شاید بہت ہی کم لوگ اپنا پورا جسم عطیہ کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ اپنے قیمتی اعضاء کسی دوسرے کی جان بچانے کی بجائے مٹی میں ملانے اور آگ میں جلا کر ضائع کرنے کی رسومات کو فوقیت دیتے ہیں۔ اور کچھ خوری طریقے سے خس کم جہان پاک کی مصداق ہڑپ ہی کر جاتے ہیں۔ البتہ میری تبلیغ کی وجہ سے شاید ایک خوری کباب بننے سے بچ جائے۔ میں یہ سوچ کر مسکرانے لگا۔

Waterfall of Wisdom

ان سب کی منزل کہیں، بہت دور تھی۔ وہ سب کے سب اپنے ہاتھوں میں اپنا اپنا نقشہ تھامے گھنے جنگلوں میں سے گزر رہے تھے۔

انھیں ان پُر پیچ راستوں پر چلتے کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔ وہ سب اس عظیم جھرنے کی تلاش میں زمانوں سے سرگرداں تھے جس کا پانی ان کے سروں پر پڑنے سے وہ حکمت و دانائی کی عظیم انمول دولت سے مالامال ہو سکتے تھے۔ وہ سب اس جھرنے کے نیچے نہا کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جانا چاہتے تھے۔

کئی زمانے گزر چکے تھے مگر اب تک ان میں سے کوئی اس جھرنے کا سراغ نہ لگا سکا تھا۔ ان کے نقشے پر جو پتا تھا، وہ اس جگہ نا جانے کتنی ہی بار جا چکے تھے مگر وہ جھرنا انھیں کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

ان سب کے سن بڑھنے لگے تھے۔ ان سب میں اب اور چلنے کی طاقت نہ بچی تھی مگر ان میں ولولہ جوں کا توں تھا۔ ان سب نے اپنے اپنے نقشے جو ایک دوسرے سے ذرا مختلف تھے، ایک دوسرے سے بدلنے کا فیصلہ کیا کہ شاید ان میں سے کوئی ایک نقشے میں چھپے کسی ایسے دوسرے راستے سے ان سب کو حکمت و دانائی کے اس جھرنے تک لے جا سکے جس کے پانی سے ان کے سروں میں حکمت و دانائی کی ایسی روشنی وا ہو سکتی تھی جس سے پوری دنیا منور

ہو جائے۔ مگر کسی کو بھی کچھ سمجھ نہ آتا تھا، وہ کیا کریں، کدھر جائیں اور کیسے اس عظیم انمول جھرنے سے مستفیض ہوں۔

ان میں سے ایک نے اب کی بار ملنے والے نقشے میں کچھ ایسا دیکھا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ تمام لوگ اس کی بات غور سے سننے لگے۔ اس نے سب کو بتایا:

"ساتھیو! زمانے ہوئے ہم حکمت و دانائی کے جھرنے کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں زمانے کی دردر کی ٹھوکریں کھاتے آگے بڑھ رہے ہیں مگر گھوم پھر کر ہم پھر وہیں آ جاتے ہیں جہاں سے ہم اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ دوستو! میں نے ابھی اپنے نقشے میں کچھ ایسے نقطے دیکھے ہیں جو مختلف سمتوں سے آگے بڑھ رہے ہیں نہ کہ ایک ساتھ، صرف ایک ہی سمت میں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم سب ساتھی تنہا ہو جائیں اور اکیلے اپنی منزل کی تلاش کریں، شاید ہم میں سے کوئی ایک تن تنہا حکمت و دانائی کے اس جھرنے تک پہنچ جائے اور وہ حکمت و دانائی سے سیراب ہونے کے بعد ہم سب کو بھی اس کا ٹھیک پتا بتا دے۔"

ان سب نے اس کی بات کو غور سے سنا اور ٹھیک سمجھا اور فیصلہ کیا کہ ہاں، شاید تنہائی ہی ہمیں حکمت و دانائی تک لے جائے۔

ان سب نے منزل دور ہونے کے باوجود اکیلے ہو جانے کا منفرد اور عجیب فیصلہ لیا اور سب کے سب اپنے اپنے نقشے لپیٹے مختلف سمتوں کی طرف تنہا روانہ ہو گئے۔

کچھ ہی صدیاں گزریں کہ ان میں سے ایک کو ایسی علم کی موتیوں کی بارش کا سامنا ہوا کہ وہ نہال ہو گیا۔ وہ خوشی اور جذب و مستی سے ناچنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے بہت سی حکمت کو پا لیا ہے۔ جو کوئی بھی اسے دیکھتا، وہ سب کو بتاتا دیکھو بھائیو، اس نے کسی طرح حکمت کو پا لیا مگر وہ اب بھی اپنے دل میں اس حکمت و دانائی کے جھرنے کی آرزو لیے مسلسل حالتِ سفر میں تھا۔

زمانے گزرتے گئے۔ ان میں سے پھر ایک نے جنگل میں ہی آسن لیا اور وہیں کا ہو گیا۔

اس نے خاموشی سے اپنے من میں ڈوب کر ایسے گیان کو پالیا جس کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ راہ چلتے لوگ اسے دیکھتے تو اس کے چہرے سے حکمت کا نور ٹپکتا دکھائی دیتا۔ اسے دیکھ کر سبھی کہتے، دیکھو یہ ہے وہ جس نے خاموشی سے حکمت کو پالیا مگر وہ من مندر میں اسی جھرنے کی تلاش میں اب بھی آنکھیں موندے محوِ سفر ہے۔

ان میں سے ایک نے جنگل میں بہت سے چوپایوں کو پالا اور ان کے ساتھ جنگل جنگل ٹیلا ٹیلا پھرتا اور آسمان کو تکتا کہ شاید کسی دن کوئی ایسا دَر وا ہو کہ حکمت اس کے سینے میں حلول کر جائے۔ ایک رات اسے ایک پہاڑ کے ٹیلے پر حالتِ خواب میں حکمت نے اپنی ذرا سی جھلک دکھائی۔ وہ خواب سے جاگا تو اسے یوں لگا کہ وہ بدل چکا ہے جو بھی اس سے ملتا وہ اس کی بات چیت سن کر کہتا کہ بے شک تو نے حکمت و دانائی کو پالیا مگر وہ خود ہر رات خواب میں اسی جھرنے کی تلاش میں پھرا کرتا۔

ان میں سے ایک نے پھر زمانوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد ایک غار میں دورانِ خواب حکمت و دانائی کی ذرا سی جھلک دیکھی۔ وہ خواب سے جاگا اور مکمل بدل گیا اور وہ جہاں جاتا لوگ اس کے مداح ہو جاتے۔ وہ لوگوں میں حکیم و دانا مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی نہ سویا، مگر اس کی جھرنے کی تلاش میں کمی نہ آئی۔ وہ جاگتے میں اسی کے خواب دیکھتا۔

زمانوں بعد پھر کسی نے آخر کار اعلان کیا کہ اس نے حکمت و دانائی کے جھرنے کا سراغ پالیا ہے۔ سب نے جب اس کے بتائے پتے پر جا کے اس کے دعوے کی تصدیق کرنا چاہی تو وہاں ایک بہت پیچیدہ سپر کمپیوٹر پڑا دکھائی دیا۔ پیچھے دیوار پر ایک آسمان سے باتیں کرتی آبشار کی بہت بڑی تصویر ٹنگی تھی۔ وہ سب اس تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔ وہ کہیں سے بھی جھرنا نہ دکھتا تھا، بلکہ بہت بڑی آبشار تھی، جس کے نیچے کھڑا ہونا یقیناً ناممکن تھا۔

سب ایک ساتھ یک زبان ہو کر بولے:

"چلو دوستو، شاید یہی وہ حکمت و دانائی کی آبشار ہے جو زمانہ پہلے جھرنا ہوا کرتی تھی۔"

وہ سب اس آبشار کی تلاش میں مختلف سمتوں کی جانب تنہا نکل گئے۔

Sphinx The Architect

فرعون کے دربار میں اجلاس زور و شور سے جاری تھا۔ جالینو گاؤں کا سردار ماتو سب کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی بات کا یقین کیا جائے۔ اس نے اور اس کے گاؤں والوں نے پچھلے دو ہفتوں میں تین بار آسمان میں عجیب و غریب شکل کی ہوائی کشتیاں دیکھی ہیں جو کبھی دریا کے پاس نیچے آتی ہیں اور کبھی اوپر بلند ہو جاتی ہیں۔

دربار میں کوئی بھی ماتو کی بات کو سنجیدہ نہیں لے رہا تھا۔ شہزادے اور وزرا ماتو کے دعوے پر ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

ماتو نے اپنی ہزیمت دیکھتے ہوئے فرعون کی طرف دیکھا اور دو زانو ہو کر آخری درخواست کی اور گویا ہوا:

"اے خدائے عظیم فرعون! آپ ہم سب کے والی و سرپرست ہیں۔ آپ اور آپ کا گھرانہ خدائی کے منصب پر فائز ہے۔ اے بادشاہوں کے بادشاہ، سرزمینِ مصر میں آپ کی اجازت کے بغیر کوئی پرندہ پر نہیں مارتا چہ جائیکہ یہ عجیب و غریب شے آپ کی سلطنت کے آسمانوں میں اڑتی پھر رہی ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں۔"

ماتو کی بات سننے کے بعد پہلی بار دربار میں خاموشی ہوئی۔ فرعون نے ماتو کی طرف دیکھا اور مخاطب ہوا:

"جالینو کے سردار ماتو، اگر تیری بات میں ذرا بھی سچائی ہے تو ثبوت پیش کر وہ کیا شے ہے جو ہماری سلطنت کے آسمانوں میں دکھائی دیتی ہے۔"

ماتو نے عاجزی سے جواب دیا:

"عالی جاہ! میں نے اس کی نقل پتھر پر تراشی ہے تاکہ آپ اور آپ کے دربار کے معززین دیکھ سکیں کہ یہ ہوائی کشتی کیسی دکھائی دیتی ہے۔"

فرعون نے ایک نظر اس پتھر کی سلیٹ پر ڈالی۔ دربار میں سرگوشیاں بڑھنے لگیں۔ ہر ایک نے اس پتھر کی سلیٹ کو باری باری دیکھا۔ ایسی گول اور اونچی کشتی کی ساخت ان میں سے کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

فرعون نے پھر سلسلۂ کلام کا آغاز کیا:

"جالینو گاؤں کے سردار ماتو، کیا یہ شکل تیرے ذہن کی اختراع یا کسی خواب کا نتیجہ تو نہیں؟ کیا تُو نے واقعی ہوش و حواس میں اس شکل کی اُڑن کشتی کو سرزمینِ مصر کے آسمانوں میں اُڑتے دیکھا ہے؟ کیا تیرے ساتھ کوئی اور ہے جو تیری گواہی دے کہ اس نے بھی اس شکل کی اُڑن کشتی کو سرزمینِ مصر میں اُڑتے دیکھا ہے؟"

ماتو نے عاجزی سے جھک کر جواب دیا:

"اے آسمان و زمین کے مالک فرعونِ عظیم، میرے ساتھ میری بیٹی نیلہ اور میرے دو نوکر شام اور فنز ہیں جو گواہ ہیں کہ اس شکل کی پر اسرار آسمانی کشتی ہمارے گاؤں جالینو میں دریا کے اوپر دیکھی گئیں۔"

"اچھا، انھیں پیش کیا جائے!"

فرعون نے حکم دیا۔

نیلہ اور دو نوکر بھیڑ کو چیرتے آگے بڑھے اور فرعون کو سجدہ کیا۔

نیلہ نے حمد فرعون سے ابتدا کی:

"اے مالک کُل فرعونِ عظیم! بے شک تیری ذات ہم لوگوں کے سروں پر رحمت

ہے۔ اے دیوتاؤں کے وارث فرعون، میں نیلہ تیری عظمت کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہاں، میں نے اور میرے باپ ماتو اور میرے دونو کروں شام اور فنر نے دو بار باہوش و حواس اُڑن کشتی کو دیکھا۔"

فرعون نے نشست سے جگہ بدلتے ہوئے اپنی فوج کے سپہ سالار پوتی فر کو حکم دیا:

"اس معاملے کی پوری طرح چھان بین کی جائے اور اس اُڑن کشتی کو آگ کے تیروں سے جلا کر ہوا میں تباہ کر دیا جائے نیز اس میں جو بھی موجود ہو، اسے تین دن میں اس دربار میں پیش کیا جائے۔"

دربار اگلے تین دن کے لیے ملتوی ہو گیا۔

پوتی فر نے اگلے ایک گھنٹے میں ایک بہت عظیم لشکر تیار کیا جس میں 227 نیزہ بردار جوان اور دو سو تین تیر انداز شامل تھے۔ ان سب کو اکٹھا کیا اور بیل گاڑیوں پر جالینو گاؤں کی طرف آندھی کی رفتار سے اپنا سفر شروع کیا۔ صرف دو دن کے مختصر وقت میں پوتی فر نے پورے جالینو گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔

ماتو نے جو دریا کا مقام بتایا تھا، وہاں پوتی فر اپنے تیرہ تیر انداز کمانڈوز کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ تقریباً صبح تین بجے ماتو نے پوتی فر کا کندھا ہلایا کہ وہ دیکھو، پوتی فر نے دیکھا کہ بجلی کی رفتار سے تیز ایک ہوائی کشتی واقعی اوپر نیچے، نیچے اوپر آ جا رہی تھی۔ پوتی فر نے بلند آواز سے بگل بجایا اور سب تیر اندازوں نے اس کی جانب تیر پھینکنے شروع کیے مگر کوئی ایک تیر بھی اس کو نہ لگ سکا۔

اچانک انھوں نے دیکھا کہ وہ کشتی ایک جگہ دریا کے کنارے اتر رہی ہے۔

پوتی فر، ماتو اور سب لشکر اس طرف بھاگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب اس بڑی ہوائی کشتی کے ارد گرد گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے اور چاروں طرف سے آگ کے تیر اس پر چلانے شروع کر دیے جس سے کشتی کی چھت اور ارد گرد آگ لگ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری کشتی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔

وہ سب ابھی یہی دیکھ رہے تھے کہ پیچھے سے ایک عجیب و غریب مخلوق جس کا سر انسان کا اور باقی جسم شیر کی مانند تھا نمودار ہوئی۔ پوتی فر نے سب کو حکم دیا اس دیو ہیکل مخلوق پر نیزوں اور تیروں سے حملہ کرو۔ سب نے اس پر حملہ کی کوشش کی مگر وہ ہر بار پھرتی سے بچ جاتی۔ الٹے تیر سپاہیوں کو ہی لگنے لگتے۔

پوتی فر نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بہت سے ساتھی اس معرکے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اچانک پوتی فر نے دیکھا کہ وہ مخلوق ایک نیم مردہ شخص کے سر پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہے۔ کچھ دیر بعد اس مخلوق نے انسانی آواز میں پوتی فر کو مخاطب کیا:

"پوتی فر میں تمھارا دشمن نہیں ہوں، میں دوسرے سیارے کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام صفنکس ہے۔ ہمارے سیارے کے بادشاہ نے مجھے یہاں کے حالات جاننے کے لیے یہاں بھیجا ہے۔ ہمارے سیارے کے بادشاہ کا نام لاماسو ہے۔ میری اڑن طشتری تو تم لوگوں نے جلا دی، اب شاید مجھے لینے وہاں سے کوئی آئے تو ہی میں واپس جا سکوں۔"

پوتی فر اس مخلوق کو باتیں کرتا دیکھ کر بہت حیران ہوا اور بولا:

"صفنکس جو بھی تمھارا نام ہے، تمھیں ہمارے ساتھ ہمارے فرعونِ عظیم کے دربار میں چلنا ہو گا۔ کیا تم آرام سے چلو گے یا ہم زبردستی لے جائیں؟"

صفنکس مسکرایا:

"زبردستی تو مجھ سے کوئی بھی کچھ نہیں کروا سکتا لیکن کیوں نہیں، مجھے خوشی ہو گی تمھارے بادشاہ سے مل کر۔" صفنکس نے خوش دلی سے کہا۔

پوتی فر بھی اس کی بات سے ذرا مطمئن ہو گیا اور لشکر کا خوف بھی جاتا رہا۔

وہ سب دربار کے لیے نکلنے لگے۔ صفنکس پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد صفنکس نے پوچھا:

"کب آئے گا تمھارا دربار؟"

پوتی فر نے کہا:

"زیادہ دور نہیں، بس دو دن کی قلیل مدت میں پہنچ جائیں گے۔"

"دو دن! اتنی دور؟" صفنکس نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر تم لوگ برا نہ مانو تو میں تم لوگوں کو پلک جھپکنے میں پہنچا سکتا ہوں۔"

"پلک جھپکنے میں؟" پوتی فر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں تم سب لوگ میری کمر پر چڑھ جاؤ۔ آگے میرا کام ہے۔" صفنکس نے خود کو اچانک بہت بڑا بنا لیا اور اس کی کمر پر تمام لشکر آسانی سے چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحہ صفنکس خود ہوا میں اڑنے لگا اور کچھ دیر میں ہی وہ سب محل کے سامنے تھے۔

فرعون کا محل پرانا دِکھتا تھا جو لکڑی کا بنا تھا اور کافی بوسیدہ حالت میں تھا۔ اس کی چھتیں بھی زیادہ اونچی نہ تھیں۔ صفنکس کو محل کے باہر ہی کھڑا کر دیا گیا اور دربار پہلی بار باہر سجایا گیا۔

فرعون نے پوتی فر کو مبارک باد دی کہ اس نے اتنی برق رفتاری سے اگلے ہی دن مجرم کو پکڑ کر اس کے سامنے پیش کر دیا۔

فرعون اور سب درباری اس عجیب الخلقت مخلوق کو دیکھ دیکھ کر حیران دکھائی دیتے تھے۔ ہر طرف سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

فرعون نے صفنکس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا:

"اے انسانی شکل اور درندے کے جسم رکھنے والے تیری اس حالت کے پیچھے کس جادوگر کا ہاتھ ہے؟ اور وہ ہوائی کشتی جسے میری فوج نے تباہ کیا، اس کے ہوا میں اڑنے کا کیا راز ہے؟"

صفنکس نے مسکراتے ہوئے کہا:

"جنابِ والا، میں اس زمین سے بہت دور آپ کی زمین سے دس گنا بڑے ایک چھوٹے سے سیارے کا باسی ہوں۔ میرے والد بزرگوار لاموسو اس سیارے کے بادشاہ ہیں۔ میں زمین پر اس حصے کی طرزِ تعمیر، یہاں کی غذا اور رہن سہن کی تفصیل اکٹھی کرنے

کے واسطے آیا تھا مگر آپ کی فوج نے میرے خلائی جہاز کو آگ سے جلا دیا۔ اب جب تک کوئی مجھے لینے نہیں آتا، میں اسی سرزمین پر رہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

فرعون اور باقی درباری اس کی بات سن کر حیرت میں پڑ گئے اور کھسر پھسر کرنے لگے۔ 'یقیناً یہ بات جو صفنکس نے کی، جھوٹ کا پلندہ ہے کہ ہماری سرزمین سے باہر بھی کوئی دنیا ہو سکتی ہے اور جو ہم سے دس گنا بڑی ہے اور اسے بھی وہ چھوٹی بتا رہا ہے۔ یقیناً یہ کوئی جادو گر ہے جو ہمیں بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔'

فرعون نے کہا:

"اگر ہم تیری اس اوٹ پٹانگ بات کا یقین کر بھی لیں تو بھی تیری وجہ سے جو ہمارے سپاہی مارے گئے اس کی سزا دیے بغیر ہم تجھے کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔"

صفنکس نے جواب دیا:

"حضور والا میں چاہتا تو ان سب کو ایک ہی وار میں ختم کر دیتا مگر مجھے اس وعدے کے ساتھ یہاں بھیجا گیا تھا کہ میں یہاں کے باسیوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچاؤں اور صرف اس سیارے کے بارے میں اپنی تفصیلات اکٹھی کروں۔ جناب والا آپ کے فوجی اپنی کوتاہی کی وجہ سے ایک دوسرے کے تیروں کا نشانہ بنے، ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔"

فرعون نے کہا:

"ٹھیک ہے، اگر ہم تجھے معاف کر بھی دیں تو کیا تو ہماری فوج میں سپاہی بھرتی ہو سکتا ہے؟ یا اور کیا کام کر سکتا ہے؟"

صفنکس نے جواب دیا:

"حضور والا میں اپنے سیارے میں تعمیرات کے شعبہ سے وابستہ تھا اور میرے پاس فن تعمیر کی ڈگری بھی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں یہاں اپنے سیارے کی طرز کی کوئی عمارت کھڑی کر کے آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ میں نے غور کیا ہے کہ آپ کی سرزمین میں عمارتیں بہت ہی کمزور طریقے سے بنائی جاتی ہیں، جن میں پتھر اور لوہے کا استعمال بالکل نہیں ہے۔"

فرعون اور اس کے اکابرین اس بات سے بہت برہم ہوئے۔ فرعون غصے سے بولا:

"کیا بکتے ہو، کیا تمھیں ہمارا لکڑی کا مضبوط محل کمزور دکھائی دیتا ہے؟ اور کیا تم نہیں جانتے کہ لوہا تو صرف تلوار یا دوسرے ہتھیار بنانے کے کام آتا ہے؟ تعمیرات میں لوہے کا کیا کام؟ رہے پتھر تو وہ کون اتنے زیادہ اکٹھے کر سکتا ہے اور پھر انھیں جوڑنا کاٹنا بھی ناممکن کام ہے۔ ہمارے ہاں مٹی اور گارے سے مضبوط دیواریں بنائی جاتی ہیں جن کو کوئی تیر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

صفنکس فرعون کی بات سن کر پھر سے مسکرانے لگا اور بولا:

"حضور جس فنِ تعمیر کو آپ مضبوط کہہ رہے ہیں، معاف کیجیے گا وہ بہت ناقص اور بے کار ہے۔ اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں آپ کو کوئی نمونہ بنا کے دے سکتا ہوں۔"

فرعون صفنکس کے اندازِ بیاں سے بہت زچ ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً کہا:

"ٹھیک ہے، تمھیں ایک سال کا وقت دیا جاتا ہے۔ جاؤ شہر سے دور ہمیں ایک عالی شان مقبرہ بنا کے دکھاؤ۔"

صفنکس بولا:

"ایک سال بہت زیادہ وقت ہے، ایک ماہ بھی کافی ہے حضور۔"

صفنکس نے شہر سے دور پہاڑوں کے بڑے پتھر ایک ہی دن میں اکٹھے کیے، اگلے دن ان پتھروں کو ایک خاص ترتیب میں چوکور اینٹوں کی شکل دے دی۔ صفنکس ہر کام شروع کرنے سے پہلے نقشہ بناتا اور ہر اینٹ ایک خاص پیمائش کے ساتھ سیسے اور چونے کے مکسچر کے ساتھ رکھتا۔ صرف بیس دن میں اس نے بہت ہی اونچی ایک عمارت کھڑی کر دی۔ پوتی فر جو اس کے ساتھ ساتھ اس کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھے تھا، حیرت کی تصویر بنا اسے دن رات کام کرتے تکا کرتا۔

اگلے دن اس نے اپنی شکل کے ایک بلند قامت مجسمے کو بنانا شروع کیا جو صرف دس دن میں مکمل ہو گیا۔

آج فرعون اس کی بنائی ہوئی عمارت اور مجسمے کو دیکھنے آنے والا تھا۔

فرعون کی سواری پہنچنے سے پہلے آسمان میں کہیں سے پھر ایک ہوائی کشتی اچانک نمودار ہوئی جو آہستہ آہستہ زمین پر اتر گئی۔ اندر سے لاموسو، صفنکس کا باپ نمودار ہوا۔ صفنکس اپنے باپ کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

فرعون کی بیل گاڑی کی سواری بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ صفنکس نے اپنے باپ کا تعارف فرعون سے کروایا۔

لاموسو نے فرعون سے اجازت مانگی کہ وہ واپس اپنے بیٹے کو لے جانا چاہتا ہے۔

فرعون نے بلاچوں چرا اں حامی بھر لی۔

جانے سے پہلے فرعون کے کان میں لاموسو نے کہا۔ "یہ کائنات بہت بڑی ہے جہاں بے شمار سیارے موجود ہیں، نا جانے کتنوں میں کتنے ہی بادشاہ خود کو مالک کل سمجھتے ہیں۔ وہ خود بھی اس عظیم کائنات کے ادنیٰ سے سیارے کا چھوٹا سا بادشاہ ہے، اس لیے خود کو خدا کہلوانا ہمیں زیب نہیں دیتا۔"

فرعون نے دونوں کو اجازت دی اور لاموسو اور صفنکس خلائی کشتی میں سوار ہو کر آسمان میں غائب ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی فرعون نے اپنی ہزیمت چھپانے کے لیے اہل مصر کو حکم دیا کہ صفنکس کے مجسمے کو سجدہ کریں اور خود شرمندگی سے ماتھے پر پسینہ لیے مقبرے کا اندرونی جائزہ لینے اندر چلا گیا۔

اہل مصر نے صفنکس کی اس فن تعمیر کو بہت زیادہ پسند کیا۔ اس کے بعد سے پتھر اور لوہے کا تعمیرات میں استعمال بکثرت ہونے لگا جو آج تک جاری ہے۔

Tale of Insi

انسی مچھلیوں میں سب سے جدا تھی۔ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی، تبھی سے اس کے دل میں یہ ننھی خواہش بیدار ہو گئی تھی کہ وہ اس اندھیرے سمندر سے ایک روز باہر نکل کے دیکھے گی۔ اس نے اپنی ماں سے ایک روز پوچھا:

"ماں! کیا کبھی ہم سمندر کے اس تاریک گوشے سے باہر نکلے ہیں؟"

اس کی ماں اور باپ اس کی بات سن کے حیران رہ گئے۔

"انسی تُو نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ کیا تُو نہیں جانتی سمندر کے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے بس اسی سمندر میں ہے اور ہمارے لیے تو یہی علاقہ پر امن ہے جہاں ہم بڑی بڑی مچھلیوں کی خوراک بننے سے بچ سکتی ہیں۔ اور ہاں خبر دار اگر تُو نے کبھی ایسا سوچا بھی کہ یہاں سے باہر نکلا جائے۔" انسی کی ماں نے اسے گھورتے ہوئے سختی سے کہا۔

انسی نے اپنی ماں کی بات سنی ان سنی کر دی اور اپنے خواب کی تکمیل کی ترکیبیں سوچنے لگی۔

پھر ایک روز وہ ان دیکھی منزل کی تلاش میں اوپر کی جانب تیرنے لگی۔

باقی مچھلیوں نے دیکھا کہ وہ ایک تھی جو سب سے الگ اپنی دھن میں اوپر کی جانب تیرتی چلی جاتی تھی۔ سب مچھلیاں اس کی عجیب و غریب نقل و حرکت دیکھ کر حیران تھیں مگر

اسے کسی کی فکر نہ تھی۔ وہ اوپر کی جانب یوں تیر رہی تھی جیسے سمندر سے باہر نکلنا چاہتی ہو۔
باقی مچھلیاں اسے گھیر گھار کر پھر نیچے اندھیرے میں لاتیں مگر وہ پھر سے صرف اور صرف اوپر کی جانب تیرنا شروع کر دیتی۔ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا، کوئی نہ جانتا تھا۔
سب مچھلیاں جانتی تھیں کہ اوپر صرف موت ہے، سمندر ہی ان کی کُل دنیا تھی، سمندر ہی ان کی کل کائنات۔ وہ کبھی اس سے باہر نہ نکل سکتی تھیں مگر یہ سارے خوف انسی نامی مچھلی کو اوپر جانے سے باز نہ رکھ سکے۔ ایک طاقت تھی جو اسے اوپر لے جاتی جا رہی تھی۔
گو وہ اوپر آتے آتے بری طرح تھک چکی تھی مگر اس کی امنگ اسے رکنے نہ دیتی تھی۔ اچانک اس نے زندگی میں پہلی بار سمندر سے سورج کا چمکتا چہرہ دیکھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ 'یہ کیا نظارہ ہے اور یہ چمک دار چیز کیا ہے جس سے کرنوں کے فوارے ابل رہے ہیں!'
اس نے روشنی کی جانب تیرنا شروع کیا۔ دور اسے سمندر سے بلند پہاڑیاں دکھائی دیں۔ وہ ایسی پہاڑیاں سمندر کی گہرائی میں پہلے دیکھ چکی تھی۔ اس نے ان کی جانب تیزی سے تیرنا شروع کیا۔ آخر وہ ایک کنارے کے پاس جا پہنچی۔ اس نے بغیر کچھ سوچے یک دم کنارے پر ایک جست لگائی اور سمندر سے نکل کر ریت پر جا گری۔ چند لمحے اسے لگا اس کا سانس بند ہو جائے گا مگر اس نے خود سے کہا، 'نہیں، میں نہیں مروں گی۔' اچانک اس کی سانس بحال ہو گئی۔ اس نے ساحل کی نمکین ریت کو چاٹا تو وہ اسے بھلی لگی۔ وہ چند گھنٹے وہیں ساکت پڑی رہی۔ اس نے خود سے کہا کہ وہ آج کے بعد زندہ سمندر میں واپس کبھی نہ لوٹے گی اور آگے جا کر ان درختوں کی کھال ضرور چکھے گی۔ اس نے اپنے پورے جسم کی طاقت اپنے تلووں پر لگائی۔ اسے محسوس ہوا شاید اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں نکل رہے ہیں۔ اس نے انھیں پیچھے کی جانب پورے زور سے کھینچا۔ وہ کچھ آگے کی طرف بڑھنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے کی جانب رینگ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی کہ وہ زندہ ہے، سانس لے رہی ہے اور آگے کی جانب بڑھ سکتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ درخت کی چھال کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اگلے دو دن درخت کی چھال کھائی جو اسے بہت بھلی لگی۔ اب اس کے جسم میں

طاقت بڑھ رہی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ اپنے آگے کے پروں کو بازوؤں اور ہاتھوں میں بدل دے۔ اس نے اپنے ذہن کو مجبور کیا کہ ان چپو جیسے پروں کا اب کوئی کام نہیں، انھیں کسی بھی حال میں بازو اور ہاتھوں میں بدلنا ہو گا تاکہ وہ درخت کی چھال کو ذرا اور اوپر سے پکڑ سکے اور زیادہ سیر ہو کر کھا سکے۔ اس نے اپنے پورے جسم کا زور لگایا اور اچانک اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ باہر نکل آئے۔

اب وہ زیادہ تیزی سے رینگ کر ہر طرف آگے بڑھ سکتی تھی۔

مگر اس کا سر اتنا چھوٹا اور جسم اتنا لمبوترا تھا کہ اسے خشکی پر نقل و حرکت میں کافی دقت کا سامنا تھا۔ اس نے سوچا اسے اپنے آگے اور پیچھے کی ٹانگوں کو کسی بھی حال میں لمبا کرنا ہو گا تاکہ وہ زیادہ دور تک دیکھ سکے۔ اس نے چند دن کی ورزش کے بعد اپنی ٹانگوں اور ہاتھوں کو جیسے تیسے لمبا بنا لیا۔ اب وہ رینگتے رینگتے کبھی کبھار دو پاؤں پر کھڑی ہو کر پورے جنگل کا جائزہ لینے کے قابل ہو چکی تھی۔

وہ بہت خوش تھی کہ وہ ٹھیک سمت میں آگے بڑھ رہی تھی۔

وہ اکیلی پورے جنگل میں گھومتی اور خوب موج مستی کرتی۔ اس کے ہاتھ پاؤں آہستہ آہستہ بڑھنے لگے تھے اور جسم قوی ہو رہا تھا اور اب اس کی ریڑھ کی ہڈی، جب وہ سیدھی کھڑی ہوتی تو زیادہ درد نہ کرتی۔ تاہم اب بھی وہ کچھ ٹیڑھی تھی۔ اس نے محسوس کیا اگر وہ سیدھی کھڑی رہے اور آگے بڑھے تو وہ زیادہ دور تک دیکھ سکتی تھی۔ گو کہ اس کی رفتار رینگنے کی نسبت کم ہو جاتی تھی مگر سیدھا کھڑے ہونے میں اسے ایک اچھا احساس ہوتا۔ اب وہ درختوں کی چھال کی بجائے ٹہنیوں پر لٹکے پھل شوق سے کھانے لگی۔ اس کے جسم میں طاقت زیادہ بڑھنے لگی۔ وہ زیادہ پیشاب اور پاخانہ کرتی اور زیادہ پھل کھاتی۔

اس کے جسم کی کھال آہستہ آہستہ بدلنے لگی تھی۔ اس نے دیکھا کچھ روز میں اس کے پورے جسم پر ہر طرف بے تحاشا بال اگنے لگے تھے جنھیں چھو کر اسے ایک عجیب قسم کی لذت کا احساس ہونے لگا۔

اب وہ ٹہنیوں سے لٹک کر سارا دن اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر چھلانگیں لگایا کرتی۔ اس کے جسم کے بال اور زیادہ بڑھنے لگے اور وہ انھیں ہر وقت خارش کرنے پر مجبور ہوتی گئی۔

اس دوران اس کا سر بھی بڑا اور گول ہونے لگا اور وہ ہر کام اوز بہتر طریقے سے کرنے لگی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ نفیس طریقوں پر عمل کرے، اس نے اپنے ذہن سے کہا۔ اس کے جسم کے بال کچھ کم ہوں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے بال تیزی سے جھڑنے لگے تھے اور نیچے سے چمک دار شفاف سیاہ جلد نکلنے لگی تھی۔ اس کا منہ چھوٹا ہونے لگا اور ناک آگے کی جانب باہر کو نکلنے لگی۔ وہ اپنے اس روپ سے بہت خوش تھی۔ اس خوشی کے اظہار کے لیے اس نے اپنے حلق سے ایک آواز، ایک عجیب چیخ کو نکالا جسے سن کر اس نے پہلی بار مسکرانا سیکھا۔ وہ خوشی سے روز چیختی اور خود ہی اپنی آواز سن کر ہنستی۔ وہ بے انتہا خوش تھی، اپنی زندگی سے۔ وہ درختوں کی ٹہنیوں پر جھولتی اور اپنے حلق سے آواز نکالتی جو پہاڑوں سے ٹکرا کر بازگشت بن کر بار بار اسے سنائی دیتی اور وہ کھلکھلا کر ہنستی۔

کچھ دن کے بعد انسی نے ایک دن ساحل پر ایک اپنی ابتدائی حالت جیسی دو مچھلیوں کو پڑے دیکھا۔ وہ انھیں دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ اس نے دیکھا ایک مچھلی اسی کی طرح جدو جہد کر کے آگے بڑھ رہی ہے جبکہ دوسری وہیں پڑی پڑی مر چکی تھی۔ دوسری مچھلی ایک درخت کی چھال کھا رہی تھی۔ اس کی پیچھے کی ٹانگیں نکل چکی تھیں۔

وہ اپنے جیسی جنس دیکھ کر حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

کچھ دن بعد اسے ایک سر سے پاؤں تک بالوں سے ڈھکا ایک ہیولہ دکھائی دیا۔ پہلے وہ اسے دیکھ کر ڈر گئی مگر اس نے غور کیا وہ بالکل اسی جیسا دکھتا تھا مگر اس کی رانوں کے بیچ ایک لمبوترا پھل جیسا کچھ لٹک رہا تھا۔ اس نے ایسا پھل کبھی اس جنگل میں نہ دیکھا تھا۔ وہ بغور اسے ٹکٹکی باندھے تکنے لگی۔ اب اس سے اور صبر نہ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک جست لگائی کہ وہ پھل اس ہیولے سے چھین کر کچا چبا جائے۔ وہ اس ہیولے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور تھی۔ اس نے

ہاتھوں سے پھل کو کھینچا مگر وہ اسے نہ چھین سکی۔ مگر اس چھینا جھپٹی میں وہ پھل اپنی ہیئت مکمل طور پر بدل کر زیادہ سخت اور لمبوترا ہو چکا تھا۔

انسی نے اپنی ہار تسلیم کی اور دوسری طرف ایک ٹہنی کی طرف جھکی۔ اسی دوران ہیولے نے ایک جست لگائی اور اسے پیچھے سے بازوؤں سے کس کر دبوچ لیا۔ انسی اس ہیولے سے بے انتہا طاقت ور ہونے کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلی اور اگلے کچھ گھنٹے وہ دونوں ایک ساتھ چپکے ساکت کھڑے رہے۔ اور کچھ دیر بعد اس نے حلق سے خوشی کی ایک چیخ بلند کی۔ ویسی ہی چیخ ہیولے نے بھی بلند کی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ اب وہ دونوں صبح شام جنگل میں جھولے جھولتے اور خوش مستیاں کرتے اور اکثر چپک کے بیٹھ جاتے۔

کچھ عرصے بعد وہ دونوں پھلوں کے علاوہ کسی اور خوراک کی تلاش میں سمندر پر جا پہنچے۔ انھیں کناروں پر کچھ مردہ مچھلیاں ملیں، وہ انھیں کھانے لگے۔

ان دونوں کے حلق سے اب مختلف آوازیں پیدا ہونے لگی تھیں اور وہ ان آوازوں کی بدولت ایک دوسرے سے بات چیت کے قابل ہو چکے تھے۔ ان دنوں نے اس دوران کئی بچوں کو جنم دیا جو پیدا ہوتے ہی ان کی موجودہ حالتوں جیسے دکھتے تھے اور ذہنی طور پر ان سے زیادہ ہوشیار بھی تھے۔ انھی بچوں میں سے ایک نے دو پتھروں کو رگڑ کر اپنے کنبے کو آگ سے روشناس کروایا جسے دیکھ کر انسی اور ہیولا حیران رہ گئے۔ آگ کے بعد وہ کچھ سخت غذاؤں کو بھی آگ پر پکا کر کھانے کے قابل ہو گئے۔

انھی کی ایک اولاد نے پتوں کو رانوں پر لٹکا کر پھل کے مغالطے میں پیدا ہونے والی لڑائی کا عقلی سدباب بھی کیا اور شرم وحیا کی شروعات کی۔

جبکہ ان کے ایک بچے نے ٹہنیوں سے پہلے محفوظ گھر کی ابتدا بھی کی۔

اب انسی اور اس کا قبیلہ کافی پھیل چکا تھا اور جنگل میں دوسرے کئی جانور بھی پیدا ہو چکے تھے جن سے مقابلہ کرتے وقت کبھی کبھی کچھ قبیلے کے لوگ مارے بھی جاتے تھے۔

حفاظت کے لیے تیز دھار پتھر کے اوزار انسی کی اولاد نے بنائے اور شکار کی ابتدا کی۔

انسی کے کنبے کی زندگی پہلے سے بہت زیادہ سہل اور اطمینان بخش گزر رہی تھی۔ انسی بہت خوش تھی اور کافی بوڑھی ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا لاشہ سمندر میں فلاں جگہ سمندر برد کر دیا جائے۔ کچھ دن بعد جب بخار سے انسی کی موت واقع ہوئی تو اس کی اولاد نے اسے اسی مقام پر سمندر برد کر دیا۔

جب اس کی لاش سمندر کی گہرائی میں پہنچی تو اس کی ماں اس کی خوشبو سونگھتی اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اسے مخصوص سانس دے کر ایک خاص عمل سے گزارا اور پھر سے کسی طرح زندہ کر دیا۔ انسی اپنی ماں کے گلے لگی اور خوب روئی اور اسے سب روداد سنائی۔ اس کی ماں کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ کیا واقعی اس سمندر سے باہر بھی کوئی دنیا ہے جہاں ایک سورج نکلتا ہے اور لہلہاتے پیڑ پودے، خشک زمین اور پہاڑ موجود ہیں۔

وہ یہی سمجھتی تھی کہ جو لوگ بھی بلندی کی جانب اٹھتے ہیں مارے جاتے ہیں۔ اس کی ماں نے وعدہ کیا کہ وہ بھی اس دیس میں جائے گی اور انسی اسے وہاں لے کر چلے۔ انسی نے اپنی ماں اور باپ کو ساتھ لیا اور وہ تینوں بلندی کی جانب اٹھنے لگے۔

گلدستہ!

فلاری کا سن پچاس کے قریب تھا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اور تنہا اپنی زندگی شہر سے باہر بنی ایک نئی بستی کے فلیٹ میں گزار رہا تھا۔ اس کے فلیٹ کی عمارت تین اطراف سے کھیتوں سے گھری تھی اور عمارت کے بغل میں ایک پرانا قبرستان تھا۔ یہ عمارت دور شہر سے آتی سیدھی سڑک سے دکھائی دے جاتی تھی۔ یہ علاقہ شہر کی گہما گہمی سے باہر ایک گاؤں کے قریب تھا اور کافی حد تک پر سکون بھی تھا۔ فلاری کو اس جگہ اپنے فلیٹ میں رہتے لگ بھگ تیرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ اکثر دفتر سے اپنے بس سٹاپ پر اترنے کے بعد گھر جلدی پہنچنے کے لیے قبرستان کا وہ ٹیڑھا میڑھا راستہ پکڑ لیا کرتا تھا جس سے وہ اگلے سات منٹ میں لمبے کھیتوں کو کراس کیے بغیر اپنے فلیٹ کی عمارت کے پاس پہنچ جایا کرتا۔ سیدھے راستے سے کھیتوں سے گزر کر گھر تک آنے میں اسے بیس منٹ اور چلنا پڑتا تھا۔

اس روز بھی وہ جلدی میں تھا، اسے دفتر سے نکلنے میں دیر ہو گئی تھی۔ جب وہ شہر سے باہر اپنے بس سٹاپ پر اترا، اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں اور ہلکی بونداباندی شروع ہو گئی جو فوراً ہی تیز بارش میں بدل گئی۔ اس نے پھر اسی قبرستان والے راستے کو پکڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے فلیٹ کی عمارت کی طرف چلنا شروع کیا۔ ہوا کا جھکڑ یک دم تیز ہو گیا جو اتنا شدید ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں اس کی چھتری ہوا کی شدت سے

مکمل ٹوٹ کر دو ٹکڑوں میں بٹ گئی اور اوپری حصہ دور کھیت میں جا گرا۔ اس نے بارش سے بچنے کے لیے اور تیز بھاگنا شروع کیا تا کہ ان تیز ہوا کے تھپیڑوں سے جلد چھٹکارہ حاصل کر سکے۔ اسی دوران اچانک کہیں سے ایک پھولوں کا گلدستہ ایک قبر سے اڑ کر اس کے چہرے سے آٹکرایا۔ وہ ابھی سنبھلا ہی تھا کہ وہ گلدستہ جس میں کئی طرح کے خوش رنگ پھول تھے، اس کے کوٹ کے بٹن سے اٹک گیا۔ پھولوں کی بھینی خوشبو اس کے ناک میں ہوا کے ساتھ تیزی سے داخل ہونے لگی۔ اس نے گلدستے کو کوٹ کے بٹن سے کسی طرح ایک ہاتھ سے چھڑایا اور گلدستہ ایک ہاتھ سے پکڑ لیا۔ وہ اسے کسی جگہ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اسے سر پر بارش سے بچنے کے لیے ڈھال کے طور پر رکھ لیا اور تیزی سے بھاگتا گلدستے کو پکڑے اپنے فلیٹ کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ اس کے کپڑے اور جسم بارش سے پوری طرح بھیگ چکے تھے۔

اوسان بحال ہوئے تو اس نے پہلی بار گلدستے کو غور سے دیکھا۔ گلدستہ حیران کن حد تک تازہ، خوش رنگ، خوبصورت مہک والے پھولوں سے انتہائی سلیقے سے بنایا گیا تھا مگر اچانک اسے حیرانی ہوئی کہ طوفان نے کسی بھی پھول کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور تمام پھول حیرت انگیز طور پر تر و تازہ اور صحیح سلامت تھے۔ فلاری کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی تیز آندھی اور بارش کے باوجود گلدستے کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان کیوں نہیں پہنچا تھا اور وہ اب تک ہر لحاظ سے تر و تازہ کیسے تھا۔

فلاری نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی گلدستے کو ایک شیشے کے جار میں ڈالا اور جار کو تازہ پانی سے بھر دیا۔ اس نے ایسے دل کش خوبصورت پھول آج سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ ہر پھول اپنی مثال آپ تھا۔ ہر پھول کی اپنی منفرد مہک تھی۔ ہر پھول اپنے اندر اپنے مخصوص رنگ لیے ہوئے تھا۔ ہر پھول خاص طرح کی نازک پتیوں کو خاص انداز سے خود پر لپیٹے ہوئے تھا۔ وہ گلدستے کے ہر پھول کو ہر طرف سے باری باری ٹکٹکی لگائے کچھ دیر بغور دیکھتا رہا۔ فلاری نے غور کیا، کسی بھی پھول کو دیکھنے پر اس میں کچھ دیر پہلے ہوئی بارش یا

طوفان کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ اسے خود پر وہم ہوا، شاید بارش اتنی تیز نہ ہوئی ہو یا یہ گلدستہ اُڑ کر اس کے منہ سے نہ ٹکرایا ہو بلکہ واقعہ کچھ اور ہو، اور اب وہ بھول گیا ہو۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ اس نے فوراً ہی خود کو سمجھاتے ہوئے کہا، 'ضرور اس گلدستے میں کچھ خاص ہے جو اتنے طوفان کے بعد بھی یہ اب تک تر و تازہ ہے۔'

اس رات وہ ٹھیک سے سو نہ سکا اور گلدستے کے بارے میں مستقل سوچتا رہا۔ یہ گلدستہ کیسے اور کیوں اس تک پہنچا؟ اس کے پھول اتنے خوشبودار اور تر و تازہ کیسے ہیں؟ انھی خیالوں میں اسے نیند آ گئی اور خواب میں فلاری نے دیکھا کہ وہ گلدستہ ہاتھ میں لیے بادلوں میں اڑ رہا ہے، تتلیاں اور پرندے تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر گلدستے کو سونگھ کر پھر ہوا میں اُڑانیں بھرتے اِدھر سے اُدھر اٹکھیلیاں کر رہے ہیں۔

اگلی صبح جب فلاری کی آنکھ کھلی تو اس کی پہلی نظر گلدستے پر پڑی۔ گلدستہ اب بھی اسی طرح تازہ تھا اور اس کے قریب جاتے ہی اس کی خوشبو اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔ فلاری نے پھولوں کو ایک ایک کر کے سونگھا اور کافی پی کر اپنے دفتر کے لیے نکل پڑا۔ باہر نکل کر اس نے دیکھا، آج آسمان پر بادل کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ کل رات آئے طوفان کا کوئی اثر تک ارد گرد اور فلک پر موجود نہ تھا۔

فلاری نے دفتر میں موجود اپنے ساتھیوں سے کھانے کے وقفے میں کل ملے گلدستے کے واقعے کا ذکر کیا۔ اس نے ان کو بتایا، کل اسے ایک ایسا گلدستہ تیز ہوا میں اڑتا آن ملا جو بالکل تازہ پھولوں سے بنا تھا مگر تیز ہوا اور طوفان اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے اور اس کے سب پھول اب بھی بالکل تازہ شاخ سے توڑے معلوم ہوتے ہیں۔ فلاری کے سب ساتھیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسنا شروع کر دیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

اس کے ساتھ بیٹھا ایک ساتھی بولا:

"مگر کل تو کوئی بارش یا طوفان آیا ہی نہ تھا۔"

فلاری نے اس کی بات پر کسی حیرت کا اظہار نہ کیا اور گلدستے کے بارے میں سوچتا

وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس شام فلاری جب اپنے فلیٹ پر واپس پہنچا تو سیدھا گلدستے کے پاس گیا اور اسے چاروں طرف سے پھر بغور دیکھنے لگا۔ گلدستہ آج صبح کی نسبت اور تازہ معلوم ہو رہا تھا اور اس کے کچھ پھول اور زیادہ دل کش ہو چکے تھے، خوشبو بھی زیادہ نکل رہی تھی۔ فلاری بہت حیران ہوا۔ کچھ دیر بعد اس نے گلدستے کے پانی کو بدلنے کا سوچا اور جار میں نیا پانی بھر کر گلدستے کو اس نئے پانی میں ڈبو کر اپنے سامنے موجود شیلف پر رکھ دیا۔

رات کا کھانا کھانے کے دوران بھی وہ مستقل گلدستے کو تکتا رہا اور اپنے ذہن میں اس کے سب پھولوں کے نقش بناتا رہا۔ اچانک اسے خیال آیا کیوں نہ وہ گلدستے کی تصویر محفوظ کرے تاکہ وہ اپنے دفتر کے ساتھیوں کو دکھا سکے کہ وہ انھیں صرف سچ بتا رہا ہے اور یہ گلدستہ واقعی کمال کا ہے۔

اگلے دن جب وہ صبح اٹھا تو اسے دفتر سے دیر ہو چکی تھی۔ وہ بغیر گلدستے کو دیکھے جلدی جلدی دفتر کے لیے نکلا۔ اس دن کھانے کے وقفے میں فلاری نے اپنے دوستوں کو گلدستے کی تصویر دکھائی۔ سب نے گلدستے کی تعریف کی مگر کوئی بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ اس گلدستے کی خوبصورتی پر وقت، آندھی، طوفان اور بارش کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوتا اور یہ اصلی پھولوں کے باوجود جوں کا توں ہمیشہ خوبصورت رہنے والا گلدستہ ہے۔

فلاری نے سب کو بہتیرا سمجھایا کہ اس کے پاس واقعی ایک ایسا گلدستہ ہے جو پچھلے تین دن میں اور زیادہ تر و تازہ ہوتا جا رہا ہے۔ سب نے اس کی بات کو اس کا وہم کہا اور بات پھر آئی گئی ہو گئی۔

اس شام جب فلاری اپنے دفتر سے گھر کے لیے بس پر نکلا تو پتا لگا شہر میں ہنگاموں کے باعث وہ روٹ جو وہ ہمیشہ استعمال کرتا تھا، وہ آج بند تھا۔ بس والے نے سب مسافروں کو ان کا کرایہ واپس کر دیا اور انھیں ٹیکسی یا دوسری سواری پر جانے کی صلاح دی۔

فلاری کو کسی بھی حال میں گھر پہنچنا تھا۔ اس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا مگر کچھ ہی دیر

چلنے کے بعد اس کے پاؤں دُکھنے لگے اور وہ ایک جگہ بیٹھ کر ستانے لگا۔ اسی دوران بلوائی اس طرف آ نکلے اور اسے مجبوراُ وہاں سے بھاگنا پڑا۔ وہ راستہ کھوجتا کھوجتا کہیں دور جا نکلا جہاں سے اب اس کی واپسی مشکل تھی۔ اس نے ایک رات اسی علاقے میں کسی سرائے میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور ایک سرائے میں جا پہنچا۔ سرائے کے مالک نے اس سے ایک رات کا کرایہ لیا اور اسے ایک کمرے کی چابی تھما دی۔ فلاری کمرے میں گھس کر تمام بتیاں جلا کر بستر پر اوندھا لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اِدھر اُدھر نگاہ کی تو اسے ایک طرف ایک پھولوں کا گلدستہ پڑا نظر آیا جو کافی حد تک اس گلدستے سے مماثلت رکھتا تھا جو وہ اپنے گھر میں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے پھولوں کی خوشبو سونگھنے کا فیصلہ کیا اور گلدستے کے پاس اپنی ناک لے جا کر ان پھولوں کی خوشبو سونگھنے لگا۔ ایسی ہی خوشبو اس کے گھر میں موجود پڑے گلدستے سے بھی آتی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ نہ جانے کب اسے نیند آئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب اسے دروازے پر لگاتار دستک سنائی دی۔ وہ اٹھا اور آنکھیں ملتا دروازے کو کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ باہر سرائے کا مالک موجود تھا اور اس کے ساتھ ایک باوردی پولیس افسر تھا۔

فلاری نے دونوں کی طرف حیرت سے دیکھا اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے، سب خیریت تو ہے؟

سرائے کے مالک نے سرد مہری سے جواب دیا:

”ایک رات کا کرایہ ادا کر کے پچھلے چار دن سے وہ اس کمرے میں موجود ہے اور پوچھ رہا ہے خیریت ہے؟“

فلاری نے حیرت سے جواب دیا:

”چار دن؟ وہ تو کل رات ہی یہاں آیا تھا۔۔۔“

سرائے کے مالک نے اپنا رجسٹر پولیس کانسٹیبل کے سامنے کیا جس پر چار دن پرانی تاریخ درج تھی۔

پولیس کانسٹیبل کمرے میں داخل ہو کر ارد گرد دیکھنے لگا۔

فلاری نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"یہ فضول مذاق ہے؟ انھیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

سرائے کے مالک نے فلاری کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کانسٹیبل سے کہا:

"دیکھیے اس کے چہرے پر کوئی شیو کا بال نہیں، مطلب یہ پچھلے چار دن سے روز شیو بھی کر رہا ہے۔ وہ دیکھیے، تازہ پھول بھی یہ کہیں سے خرید کر لایا ہے۔"

کانسٹیبل نے سر سے پاؤں تک فلاری کو دیکھا اور پوچھا:

"سچ سچ بتاؤ، پچھلے چار دن سے تم یہاں بند کمرے میں کیا کر رہے ہو اور ہر روز دروازہ پیٹنے پر بھی کیوں نہیں کھول رہے تھے؟ اور یہ تازہ پھول__ یہ تم کہاں سے توڑ کر لائے ہو؟"

کانسٹیبل نے گلدستے کے ایک پھول کو سونگتے ہوئے پوچھا:

فلاری کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اس نے سنجیدہ آواز میں کہا:

"کانسٹیبل، آپ میری بات کا یقین کریں۔ جب کل رات میں یہاں آیا تھا تو یہ گلدستہ یہاں پہلے سے موجود تھا اور۔۔ اور ہاں۔۔ ایسا ہی ایک گلدستہ میرے گھر میں بھی ہے۔۔۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو میں آپ کو جا کر دکھا بھی سکتا ہوں۔۔۔"

کانسٹیبل نے مشکوک نظروں سے فلاری کو دیکھا اور بولا:

"میں تم سے تمھارے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ تمھارے گھر میں کیا ہے کیا نہیں، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔۔۔ تم نشہ تو نہیں کرتے ہو؟"

"نہیں۔۔ نہیں میں کوئی نشہ استعمال نہیں کرتا۔"

فلاری نے مستحکم آواز میں جواب دیا۔

"تو پھر چار دن سے دروازہ نہ کھولنے کے پیچھے کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

کانسٹیبل نے اس بار سختی سے سوال کیا۔

"جی میں سو رہا تھا، میں نے آپ کو بتایا تو ہے۔۔۔ اور ابھی پہلی بار دروازہ کھٹکنے کی آواز میں نے سنی۔"

"اچھا اچھا، ان کا چار دن کا کرایہ ادا کرو اور یہاں سے جتنی جلدی ہو چلتے بنو۔"

کانسٹیبل نے جلدی جلدی تند لہجے میں کہا۔

"اور انھیں کہیں یہ گلدستہ بھی اپنے ساتھ لے جائیں تو بہتر ہو گا۔"

سرائے کے مالک نے کانسٹیبل کی بات کے درمیان میں ہی اضافہ کیا۔

"ہاں، ہاں بالکل۔ اسے بھی یہاں سے اٹھاؤ۔"

کانسٹیبل نے سرائے کے مالک کی تائید کی۔

فلاری نے جلدی جلدی اپنا بریف کیس اور ایک ہاتھ سے گلدستہ پکڑا اور کرایہ دے کر وہاں سے فوراً باہر نکل گیا۔

شام کے سائے منڈلا رہے تھے۔ فلاری کو جلد ہی اپنی منزل تک لے جانے والی بس پکڑنی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے بعد اسے ایک بس سٹاپ دکھائی دیا۔ وہ وہاں بس کے انتظار میں ہاتھ میں گلدستہ پکڑے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑے انتظار کے بعد ایک عجیب و غریب شکل کی بس وہاں آ کر رکی مگر ایسی بس اس نے آج سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ فوراً ہی بغیر کچھ سوچے اس پر سوار ہو گیا اور بوکھلاہٹ میں بس ڈرائیور کو اپنا پتا بتانے لگا۔ ڈرائیور نے اسے بتایا کہ وہ ٹھیک بس میں بیٹھا ہے۔ یہ بس آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد اسے اس بس سٹاپ پر اتار دے گی جہاں وہ جانا چاہتا ہے۔ ڈرائیور فلاری کے لباس کو سر سے پاؤں تک عجیب نظروں سے تکنے لگا۔ فلاری نے اپنے لباس کی طرف دیکھا۔ اس میں اسے کوئی ایسی شے عجیب دکھائی نہ دی، الٹا اسے ڈرائیور کا لباس ان دیکھے ڈیزائین کا لگا۔

البتہ اسے یہ اطمینان ضرور ہوا کہ کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر میں ہو گا۔۔

فلاری اس مسافروں سے خالی بس میں ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ

اپنے علاقے کے بس سٹاپ پر اترا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جہاں کھیت کھلیان ہوا کرتے تھے، وہاں بڑی بڑی عمارتیں بن چکی تھیں۔ قبرستان کی جگہ ایک شاپنگ مال بن چکا تھا۔ فلاری منہ کھولے ارد گرد ہر شے کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس کے فلیٹ کی بلڈنگ ارد گرد بنی عمارتوں میں سے سب سے پرانی دکھائی دیتی تھی مگر اس کا بھی باہر کا رنگ بدل دیا گیا تھا۔ فلاری بوکھلایا ہوا اپنی عمارت میں داخل ہوا اور سیدھا اپنے فلیٹ کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازے کی چابی لگائی تو اسے یوں لگا جیسے سالوں بعد کوئی اس تالے کو کھول رہا ہے۔ اندر پہنچا اور سیدھا اس جگہ لپکا جہاں وہ گلدستہ رکھا تھا، جس کے آنے کے بعد اس کی زندگی مکمل بدل گئی تھی۔ گلدستہ وہیں جوں کا توں موجود تھا، پہلے سے بھی زیادہ تروتازہ اور اس کے پھولوں کی خوشبو پہلے سے بھی زیادہ معطر مہک دے رہی تھی۔ فلاری جو گلدستہ سرائے سے ساتھ لایا تھا، اسے بھی ایک جار میں ڈال کر پانی سے بھر دیا اور اسی گلدستے کے برابر رکھ دیا۔

اس رات اسے بہت اچھی اور پرسکون نیند آئی۔

اگلے دن صبح وہ بہت تازہ دم بستر سے اٹھا لیکن جب وہ دفتر پہنچا تو اس پر حیرت کا ایک اور پہاڑ ٹوٹا۔ اسے معلوم ہوا وہ اب وہاں کلرک کی نوکری نہیں کرتا، وہ اسی ادارے کا سربراہ بن چکا تھا۔

اگلے دن وہ اپنے ساتھ ان دو گلدستوں میں سے ایک گلدستہ اپنے دفتر کی ٹیبل پر رکھنے کے لیے ساتھ لے آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب کو اس عجیب و غریب گلدستے کی کرامت دکھائے گا جو سالہا سال سے تروتازہ ہے۔

مگر اس کی سوچ کے برعکس اگلے ہی دن گلدستے کے سارے پھول مرجھا کر سوکھنے لگے اور فلاری کا چہرہ بھی ایک ہی دن میں مرجھائے پھولوں کی طرح ہر طرف جھریوں سے بھر گیا۔

اداسی کے نشے کا آخری دن!

جب بھی اس کا اداسی کا نشہ ٹوٹنے لگتا، وہ پاگلوں کی طرح ہو جاتا۔ اس کو خوش رہنے سے سخت چڑ تھی۔ مسلسل کھلی باچھوں سے اس کے جبڑوں میں شدید درد رہنے لگا تھا۔

شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرتا جب وہ اپنی اداسی کی لت کا کوئی سامان نہ کر پاتا۔

اس بار بھی ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا، اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ ہر اس جگہ گیا جہاں سے اسے اداسی کا نشہ ملنے کا امکان تھا، مگر جہاں بھی وہ جاتا کوئی اسے کسی بھی قیمت پر ذرا سی اداسی دینے پر بھی آمادہ نہ ہوتا۔ اس نے بڑی کوشش کی، کوئی بھی شخص اسے ایسا ملے جو اسے رتّی بھر اداسی دے دے، جس سے اس کا آج کا نشہ پورا ہو جائے۔ مگر جہاں بھی وہ اداسی کا نشہ مانگنے جاتا، ہر کوئی اس سے خندہ پیشانی سے ملتا۔ اس کی کسی بھی بات کا برا نہ مناتا، مجبوراً اسے زبردستی ہنس کر خود پر جبر کرنا پڑتا۔

اس کا جسم، دل و دماغ، اداسی کے بغیر آہستہ آہستہ ماؤف ہونے لگے تھے۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کوئی اسے کسی بھی طرح ذرا سی اداسی دے دے تا کہ وہ پر سکون ہو کر دنیا و مافیہ کو کچھ دیر بھول کر آنکھیں موندے اداسی کا نشہ کر سکے۔

اس نے ایک راہ گیر کو دیکھا جو کسی سے فون پر بات کرتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ اسے اس کے سفید چمکتے دانت دیکھ کر گھن آنے لگی۔

اس نے اسے یک دم روکا اور چیخ کر کہا:

"تھوڑی اداسی دے سکتے ہو مجھے؟"

اس راہ گیر نے اسے پہلے حیرت سے دیکھا، پھر اس کی ذہنی حالت دیکھتے ہوئے شائستگی سے مسکرا کر اُسے در گزر کر دیا اور دوبارہ فون پر ہنس کر بات کرنے لگا۔

پارک میں ایک ہنستی ہوئی عورت جو اپنے بچے کو ہوا میں اوپر نیچے اچھال رہی تھی، وہ اس کے قریب گیا اور یک دم بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

"ذرا سی اداسی ملے گی؟"

وہ عورت اور اس کا بچہ اس کے عجیب و غریب انداز اور سوال پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ وہ انھیں ہنستا دیکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ عورت اور بچہ اب بھی ہنس رہے تھے۔

اب اس کے پاس کوئی چارہ باقی نہ بچا تھا کہ وہ کسی سے زبردستی جھگڑا کرے تاوقتیکہ اسے اداسی کے نشے کی مناسب مقدار مل جائے۔

مجبوراً وہ گھر واپس آیا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنی بیوی سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اس کی بیوی اسے مسلسل در گزر کرتی رہی۔ وہ اس کی نشے کی لت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس کی ہزار کوشش کے باوجود وہ اسے ذرا سی بھی اداسی کی مقدار دینے پر رضامند نہیں تھی۔ وہ تنگ آ گیا، مگر اداسی کی جتنی مقدار اسے آج کے نشے کے لیے چاہیے تھی، وہ اسے تاحال نہ مل پائی تھی۔

اس نے تنگ آ کر فون گھمایا اور مختلف عزیز و اقارب سے اداسی کا تقاضا کرنے لگا، مگر آج کوئی بھی اسے رتّی بھر اداسی دینے کو تیار نہیں تھا۔ ہر کوئی اسے در گزر کر رہا تھا۔ وہ جھگڑے کی جتنی بھی کوشش کرتا، بدلے میں اسے کوئی ذرا برابر اداسی بھی نہ دے پاتا۔

اس کا دل و دماغ، اس کا جسم اب نشے سے ٹوٹ ٹوٹ کر سُن ہو چکا تھا۔ نہ جانے کب اسے نیند آئی اور وہ سو گیا۔ اگلے تین دن تک وہ بے ہوش سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی، اس

کے تمام اہل خانہ وہاں کمرے میں موجود تھے۔ اس نے دیکھا، وہ سب ہنس رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں کیک ہے۔

زندگی میں پہلی بار اسے ہنستے ہوئے چہرے برے نہ لگے۔

اسے یاد آیا۔

'آج اس کی سالگرہ ہے اور یہ اداسی کے نشے سے مکمل نجات کا پہلا دن بھی ہے۔'

اس دن کے بعد وہ پھر کبھی اداس نہ ہوا۔

Tidal Force

آسمان سے باتیں کرتی یہ لہریں سینکڑوں سال پہلے زمین پر موجود نہ تھیں۔ زمین پر قیمتی مٹی کا وافر ذخیرہ ہوا کرتا تھا۔ جب مجھے یہ علم ہوا میرے اشتیاق میں مزید اضافہ ہوا کہ شاید کبھی میں جان سکوں کہ آخر ماضی میں زمین کیسی ہوا کرتی تھی۔

ماضی میں ہوئی ایٹمی جنگوں اور ان کی وجہ سے آئے شدید زلزلوں کی وجہ سے ماضی کی بہت کم معلومات آج کے انسانوں کے پاس باقی بچی تھیں۔ ایسی معلومات، جن سے یہ جانا جا سکتا کہ زمین پر ماضی میں کس قسم کا ماحول تھا، نہ ہونے کے برابر تھیں۔

مجھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ زمین کی گہرائی میں بنکرز سے نکلے لگ بھگ ایک سال گزر چکا تھا۔ ہم سب انسانوں کے اس گروہ سے تھے جو ایٹمی جنگوں سے ہونے والی تباہی سے پہلے اپنے تحفظ کے لیے زمین کی گہرائی میں کئی سو سال کا اناج لے کر بند ہو گئے تھے۔ ہماری ایک نسل زمین کی گہرائی میں ہی پروان چڑھی تھی اور ہماری نسل کے آباو اجداد بھی انھی بنکرز میں مرے تھے۔

میں اور میرے کچھ ساتھیوں نے کچھ عرصہ پہلے اس گہرائی میں موجود بنکر سے نکلنے کا خطرہ مول لیا۔ ہمارے باقی ساتھیوں نے ہمیں بہت سمجھایا کہ یہاں سے باہر نکلنے کا مطلب موت کو گلے لگانا ہے۔ مگر جتنا اناج اب یہاں باقی بچا تھا، اس کے بل بوتے پر ہم زیادہ عرصہ

زندہ نہیں رہ سکتے تھے اور ویسے بھی اس سے زیادہ اس پاتال میں رہنا بھی ہر گزرتے دن موت کے انتظار جیسا ہی تھا۔

ہم سب کو یہاں سے باہر نکلنے میں لگ بھگ دوماہ کا عرصہ لگا۔ ان بنکرز سے باہر نکلنے کا جو راستہ ہمیں بتایا گیا تھا، وہاں اب سونے اور دوسری دھاتوں کی سخت چٹانیں تھیں، جنھیں کاٹ کر نکلنے کے لیے ہمیں سخت محنت کرنا پڑی۔

جو کچھ کتابیں اور معلومات ہمارے پاس تھیں ان میں زمین کے ماضی کے ماحول پر بہت کم لکھا گیا تھا۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ زمین پر مٹی نامی ذرات موجود تھے اور ان ذرات میں بیج کاشت کرنے سے فصل اگائی جاسکتی تھی۔

بڑے بوڑھوں سے جو عجیب و غریب باتیں سنی تھیں، ان کے مطابق زمین پر کبھی دریا اور سمندر سیدھے بھی بہتے تھے اور مٹی اور پتھر کے بڑے بڑے پہاڑ ہوا کرتے تھے۔ درخت اور پھل پھول لگتے تھے، مگر ارد گرد دیکھ کر بظاہر ان میں سے کوئی ایک بات بھی سچ معلوم نہیں ہوتی تھی۔

ہمارے سامنے زمین پر سب دریا اور سمندر تو تھے مگر وہ سب آسمان کی طرف بہتے تھے اور پہاڑ سونے، چاندی اور دوسری دھاتوں کے تھے۔ مٹی اور نرم پتھر تو مکمل طور پر ناپید ہو چکے تھے۔ پھل پھول، بوٹے اور درخت نام کی کسی چیز کا کوئی نام و نشان اب تک ہمیں نہ نظر آیا تھا۔

چاند، جس کے بارے میں ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ وہ زمین سے دور کبھی آسمان میں چمکتا تھا، وہ زمین کے انتہائی قریب آچکا تھا۔ ہم بہت عرصے سے سونے اور چاندی کے پہاڑوں کو کھود کر یہ جاننے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ کیا واقعی قیمتی مٹی یا کالے مٹی کے پتھر کا کوئی وجود تھا بھی یا یہ صرف غلط مفروضوں پر مبنی معلومات ہیں۔ زمین کی سطح شفاف پلاٹینم اور یورینیم جیسی دھاتوں کی تھی، جس پر کسی پھول بوٹے یا درخت کا اگنا ناممکن تھا۔ مجھے زمین کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ ہمیں بچپن میں جس شکل کا پھول ہمارے بزرگوں

نے بتایا تھا، وہ سوائے ایک فینٹیسی کے اور کچھ نہیں تھا اور موجودہ سخت دھاتی زمین پر اس قسم کی چیز کا اگانا محض خواب ہی ہو سکتا ہے۔ ارد گرد خوراک صرف سمندری حیات تھی اور وہی ہم انسانوں کے کھانے کا واحد ذریعہ بچی تھی جبکہ زیر زمین ہم پسی ہوئی گندم، چاول اور دوسری اجناس بھی کھا چکے تھے۔ اس کا یقیناً یہی مطلب تھا کہ اس قسم کی اجناس زمین پر کبھی اُگائی جاتی رہی تھیں۔ اور انھی اجناس کے بیج بھی میرے پاس محفوظ تھے۔ مگر ہزار کوشش کے باوجود تا حال قیمتی مٹی کا ایک ڈھیلا بھی کسی کھدائی سے ہمارے ہاتھ نہ لگا تھا۔

جگہ جگہ ہم سونے، چاندی یا پلاٹینم جیسی دھاتوں کے پہاڑوں کو کھودتے کہ شاید کہیں سے تھوڑی سی قیمتی مٹی نکل آئے جس میں کسی بیج کو بویا جا سکے۔ مگر ہر بار ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ زمین پر سونے چاندی اور دوسری فضول دھاتوں کے خشک و سخت پہاڑ ضرور تھے جن کی چمک سے رات کو بھی اس خطے میں دن کا سماں رہتا تھا۔ چاند کے زمین سے انتہائی قریب ہونے کی وجہ سے ٹائیڈل فورس جو بہت زیادہ بڑھ چکی تھی، جس کے باعث زمین پر چلتے وقت سمندری یا دریائی پانی کی دیواروں میں سے گزرنا پڑتا تھا، جو کبھی کبھار کافی موٹی ہو جاتی تھیں۔

میرے کچھ ساتھیوں نے موجودہ صورتِ حال دیکھ کر خوف سے زیر زمین سونے کی غاروں میں ہی مستقبل میں رہنے کو ترجیح دینے کی بات کی کیوں کہ جو حالات زمین پر تھے، وہ زندگی کے لیے اس طرح ساز گار نہیں تھے جیسا ہمیں بتایا گیا تھا اور جو سوچ کر ہم باہر نکلے تھے۔

ہمیں کسی بھی حال میں قیمتی مٹی ڈھونڈنی تھی، جس میں جو بیج ہمارے پاس بچے تھے، وہ کاشت کیے جا سکیں۔ مگر چاروں جانب سونے، چاندی، ہیرے اور دوسری دھاتوں کی سخت کرسٹل چٹانیں، پہاڑ اور ٹیلے تھے۔

ان حالات میں جلد از جلد اس علاقے کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے کی طرف رخ کرنے میں ہی عافیت تھی مگر پیدل سفر کرنا اور وہ بھی چٹیل، چمک دار دھاتوں پر اور جا بجا

آسمان سے باتیں کرتے دریاؤں کے ٹکڑے، جن پر چڑھ کر اور گزر کر دوسری طرف اترنے میں بھی کافی وقت ضائع ہوتا تھا۔ اور کوئی چارا بھی نہیں تھا۔ قیمتی کاشت کے قابل مٹی اور قیمتی پتھر ڈھیلوں کی تلاش کیے بغیر ہمارے پاس اور کوئی دوسری تجویز نہیں تھی۔

ہم نے سونے کے کچھ ٹکڑوں کو گھسایا اور جوتوں کو سکیٹنگ جوتے کی طرز کا بنایا جس سے پھسل کر سفر کی رفتار کو بڑھایا جا سکتا تھا۔

پچھلے دس دن سے ہم مسلسل جنوب سے مغرب کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ درمیان میں کئی آسمان سے باتیں کرتے دریا آئے، اوپر کی جانب بہتے سمندر پڑے، ہم ان سب کو سَر کرتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔

دور ایک مقام پر ہمیں حیرت انگیز طور پر کچھ دوسری شکل کی عمارتیں نظر آئیں۔ ہم نے اپنی رفتار کو اور بڑھایا۔ جب قریب پہنچے تو وہاں غیر متوقع طور پر ایک شہر آباد تھا جس کے باہر ایک چوکی تھی۔ ہم وہاں پہنچے اور بتایا کہ ہم جنوب سے سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں اور ہمیں قیمتی کاشت کے قابل مٹی کی تلاش ہے۔

سب نے ہمارا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا۔ شہر اندر سے کافی خوبصورت تھا، سب گھر سونے، چاندی، ہیرے اور کچھ چھوٹے گھر پلاٹینم کے، جو زمین پر زیادہ تھا، بنے ہوئے تھے۔ کھانے میں سمندری حیات ہی کھائی جا رہی تھی، وہی ہمیں بھی دی گئی۔ شہر کے بیچ آسمان سے باتیں کرتی کئی ندیاں، جھیلیں اور نالے تھے جن میں مچھلیاں اور دوسری حیات اوپر اور نیچے کی طرف تیر رہی تھیں۔ مچھیرے بلندی سے جال نیچے کی جانب پھینکتے اور اپنا شکار پکڑتے تھے۔

ہم نے شہر کے کچھ معزز لوگوں کو بیجوں اور ایک پڑیا میں رکھی قیمتی مٹی کی زیارت کروائی کہ ان بیجوں کے لیے انھیں اس قسم کی قیمتی کاشت کے قابل مٹی کی تلاش ہے، جسے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ کچھ لوگوں نے قیمتی مٹی کی خوشبو باری باری سونگھی۔

ان سب میں سے کسی نے اس قسم کی چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور ان میں سے

کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس قسم کے ذرے کبھی کھدائی میں کبھی انھیں یہاں نظر آئے ہیں۔

میں نے سب کو بتایا کہ میرے پاس ایسی اطلاعات ہیں جن کے مطابق اس قسم کی قیمتی مٹی ماضی میں وافر مقدار میں زمین پر موجود تھی اور اسی مٹی میں یہ بیج بوئے جاتے تھے۔ وہاں سب لوگ میری بات منہ کھولے حیرت سے سن رہے تھے۔ کچھ لوگ مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے جیسے میں انھیں بیوقوف بنا کر کچھ لوٹنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔

میں نے سب کو باور کروایا کہ میں اور میرے سب ساتھی ان سے جھوٹ نہیں بول رہے اور ہم یہاں سب کے بہتر مستقبل کے لیے آئے ہیں۔

وہاں موجود معززین نے میری بات کا یقین کیا اور میری اور میرے ساتھیوں کی پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

اگلے دن ہم وہاں موجود سونے کے پہیوں کی ہتھ گاڑیوں پر بیٹھ کر اپنے اگلے مشرق کے سفر کے لیے نکلے۔ ہمارے ساتھ اس شہر کے کچھ کھدائی کے ماہر لوگ بھی ساتھ ہو لیے۔

اگلے کچھ روز ہم آگے بڑھتے رہے، راستے میں مختلف جگہوں پر ہم نے کھدائی کی۔ بہت سی کوششیں کیں مگر ہمارے ہاتھ سونے اور ہیرے جیسی ناکارہ دھات آتی جس کی ہر جگہ بہتات تھی جو ہمارے کسی کام نہ آسکتی تھی۔

اب تک ہمیں کہیں بھی قیمتی مٹی کا ایک ذرہ بھی دکھائی نہ دیا تھا۔

کچھ دن کے سفر کے بعد ہمیں دور مشرق میں ایک شہر کے آثار دکھائی دیے۔ ہم نے اپنی رفتار کو اور تیز کیا اور جلد ہی ہم اس شہر کی فصیل تک پہنچ گئے۔ شہر کے اندر داخل ہونے سے پہلے چوکی پر ہماری تلاشی لی گئی جہاں قیمتی مٹی کی پڑیا ان کے ہاتھ لگی۔ اسے دیکھ کر ہم سب کو فوراً ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ میں نے بہت شور کیا' یہ میری ملکیت ہے، چرائی ہوئی نہیں، مگر ہم سب کو ایک جیل میں ڈال دیا گیا۔ اگلے دن صرف مجھے نکال کر ایک جگہ پیش کیا گیا۔ وہ شخص شاید ان کا سردار تھا، جس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ قیمتی متبرک مٹی مجھ تک کیسے پہنچی؟

میں نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا سب ماجرا اُس کو صاف صاف بتایا کہ ہم جنوب سے نکل کر مغرب سے ہوتے ہوئے یہاں مشرق پہنچے ہیں اور سارا وقت یہ قیمتی مٹی کے ذرے میرے پاس موجود تھے اور یہ چوری کے نہیں۔

اس نے میری بات غور سے سنی اور مسکرا دیا اور میری ہتھکڑی کھولنے کا حکم دیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ یہ شہر کچھ پسماندہ تھا۔ زیادہ تر گھر پلاٹینم اور یورینیم کے ٹیڑھے میڑھے انداز کے بنے تھے اور لوگوں کا لباس بھی عجیب و غریب قسم کا تھا۔

وہ شخص مجھے ایک جگہ لے کر گیا جہاں اونچی جگہ پر ایک بڑا سا سونے کا گملا دھرا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، گملے کے اوپر کچھ ہرے پتے بھی تھے۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور مجھے چھونے کے لیے کہا۔ میں نے جھانک کے دیکھا تو گملا قیمتی کاشت کے قابل مٹی سے بھرا ہوا تھا، جسے بڑی احتیاط سے خاص اونچی جگہ پر رکھا گیا تھا۔ شاید وہ لوگ اس کی عبادت بھی کرتے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا یہاں اس علاقے میں قیمتی مٹی کے ذخائر موجود ہیں؟

اس نے بتایا کہ ان کے علاقے میں دو ایسے کنویں ہیں اور ایک ایسی کان ہے جہاں سے قیمتی مٹی کی بہت ہی کم مقدار نکالی جاتی ہے مگر ان کے پاس کھدائی کی ایسی تکنیک نہیں ہے جن کو استعمال کر کے قیمتی مٹی زیادہ نکالی جا سکے۔

میں نے اسے بتایا کہ میں اور میرے ساتھی اس تکنیک کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ہمیں اجازت دے تو ہم قیمتی مٹی کی زیادہ مقدار کھدائی سے نکال سکتے ہیں۔ اس نے اس شرط پر اجازت دی کہ ہم نکالی ہوئی قیمتی مٹی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکیں گے، جس پر میں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ ہمیں صرف کُل مٹی کا دس فیصد مفت اور باقی مقدار قیمت کے طور پر خوراک ادا کرنے کے بعد ساتھ لے جانے کی اجازت ہو گی۔

اسے میں نے اور میرے باقی ساتھیوں نے بھی منظور کر لیا۔

اگلے ہی دن ہم نے دو نئی کانوں اور تین کنوؤں میں کھدائی کا کام شروع کیا۔ بیس دن بعد ہمیں قیمتی مٹی کے کچھ نمونے ہاتھ لگے۔ ہم نے کھدائی جاری رکھی۔ کچھ دن بعد ہم ایک کان میں قیمتی مٹی کے انمول خزانے تک پہنچ گئے جو ایک عظیم مٹی کے پہاڑ کی صورت میں ایک سونے کے پہاڑ کے اندر موجود تھا۔ ہم سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہم نے بھاری مقدار میں قیمتی مٹی کو بڑے گملوں میں محفوظ کیا۔ جب اہل علاقہ نے زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی مقدار میں قیمتی مٹی دیکھی تو فرطِ جذبات سے سب کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اہل علاقہ قیمتی مٹی کی پرستش بھی کرتے تھے، سب نے قیمتی مٹی کو چھو کر دیکھا اور آنکھوں کو لگایا۔

آج وہاں ایک میلے کا سماں تھا۔ میں نے وہاں کے سردار سے پوچھا کہ اگر وہ اجازت دے تو کیا ہم اس مٹی میں وہ بیج بو دیں جو میں اپنے ساتھ برسوں سے لیے گھوم رہا ہوں اور کوئی بھی میری بات پر یقین نہ کرتا تھا کہ ان بیجوں سے وہ اجناس اگائی جا سکتی ہیں جو ماضی میں زمین پر اگائی جاتی تھیں۔

سردار نے مجھے اجازت دی۔ میں نے وہاں موجود دریا کے ہوا میں معلق پانی کے بالکل برابر اس مٹی میں بیج بو دیے۔ پانی کی مناسب ٹھنڈک سے دس دن میں بیج بارآور ہو گئے اور کونپلیں پھوٹ پڑیں، جو دیکھتے ہی دیکھتے کچھ روز میں لہلہاتی فصل میں تبدیل ہو گئیں۔ میں اور میرے ساتھی ہر روز اس فصل کی دیکھ بھال کرتے اور اس دوران قیمتی مٹی کے نئے ذخائر کی کھوج لگاتے۔ اب تک ہم کئی من قیمتی مٹی نکال چکے تھے اور قیمتی مٹی کے وافر ذخائر تک پہنچ چکے تھے جنھیں اگلے کئی سال تک نکالا جا سکتا تھا۔

ہم نے وہاں بہت سی فصلوں کی کاشت کی جسے کھا کر اہل علاقہ حیران اور خوش ہوئے اور ہم سب کے لیے یہ خوراک بالکل خواب جیسی تھی۔

قیمتی مٹی کے اپنے حصے کے ذخائر لے کر ہم نے اہل علاقہ سے اجازت چاہی اور اپنے وطن جنوب کی طرف یہ کہہ کر لوٹ گئے کہ اب ہم ہر چھ ماہ بعد گرمی کے موسم میں کھدائی کے لیے آیا کریں گے کیوں کہ سردی میں ٹائیڈل فورس کی وجہ سے سمندر اور دریا کی

دیواریں سخت ہو جاتی تھیں، جن میں سے گزرنا اور چڑھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ ہمارے پاس اجناس اور قیمتی مٹی کا وافر ذخیرہ تھا جو اگلی گرمیوں تک کے لیے کافی تھا۔ راستے میں ہم نے مغرب کے باسیوں کو ان کا حصہ دے کر اتارا اور ہم خیریت سے واپس جنوب میں اپنے زیرزمین بنکرز میں پہنچ گئے۔

چھوٹے بڑے پودے

ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی زندہ شے دنیا کو کچھ دے جانے کے لیے برسرِپیکار ہے۔ چھوٹے قد کاٹھ کے پودے ہوں یا بڑے تن آور درخت، سب اپنی پوری لگن کے ساتھ محنت میں جُتے ہیں۔ کسی کی زندگی کا مقصد پھول دے کر فنا ہونا ہے تو کسی کا پھل اور کسی کا چھاؤں دے کر جانا۔

چھوٹے قد کاٹھ کے پودے بھی اپنی طاقت کے حساب سے پھل پھول دے کر جاتے ہیں اور بڑے قد کاٹھ کے اپنے حساب سے اپنا کام کرتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے ذمہ کوئی نہ کوئی ٹاسک باندھ رکھا ہے۔ کسی نے پھول، کسی نے پھل، کسی نے دونوں اور کسی نے چھاؤں، حتیٰ کے خودرو گھاس بھی اپنی ہستی کو بار بار مٹاتی ہے، بار بار نکلتی ہے۔ سب جانتے ہوئے بھی بار بار کٹ جاتی ہے مگر ہار نہیں مانتی۔

کمزور اور ناتواں بیلیں بھی مرنے سے پہلے اپنا ثمر دے جاتی ہیں اور ہنستے ہنستے سورج کی گود میں جل مرتی ہیں مگر جانے سے پہلے اپنا کام خوش اسلوبی سے کر جاتی ہیں۔ کسی پر کدو، کسی پر انگور، کسی پر خربوزے اور کسی پر کریلے نکلتے ہیں۔ ہر ایک بیل اپنا کام دل جمعی سے کرتی اپنی مختصر زندگی میں کچھ اچھا کر کے جاتی ہے۔ تن آور درختوں اور ان کی اوسط زندگی میں صرف چند سالوں کا ہی فرق ہوتا ہے۔ چند ماہ یا چند سال کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک زمانے کی بات ہے جب بیر، بلوبیری اور اسٹرابیری کے پودے صدیاں اپنی کمزوری کا رونا روتے، بغیر کوئی پھل نکالے افسردگی کا شکار رہا کرتے تھے مگر ایک دن ان میں سے ایک پودے نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بساط کے مطابق بھلے جیسا بھی چھوٹا پھل ہو، پیدا ضرور کرے گا اور وہ یہ تہیہ کر کے محنت سے جُت گیا۔ سب نے اسے سمجھایا کہ ہمارے جیسے کمزور بیروں اور کھٹے پھلوں کو کون کھائے گا؟ ہمارا زندگی کا کوئی مقصد نہیں، ہم بغیر کسی وجہ کے ہی دنیا میں موجود ہیں۔ ایک روز بیمار شہتوت کے کمزور پودے نے بلوبیری کو کہا، ''کیا تو نہیں دیکھتی لوگ سیب اور انار کو دیکھ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں، دیکھ سیب کے درخت کو، کتنا خوبصورت اور تن آور ہے؟''

سٹرابیری کا کمزور مرجھایا پودا بولا، ''کہاں ہم کہاں آم کا خوبرو پھل۔ جو دیکھتا ہے اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی خوشبو کوسوں دور سے آجاتی ہے۔ اور ایک ہم ہیں، نہ شکل ہے نہ ذائقہ۔ بس یہی سوچ کر میرا دل نہیں چاہتا کبھی اپنا پھل پیدا کر دوں۔''

پاس ہی ٹماٹر اور ہری مرچ کے پودے بھی بڑی غور سے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ بلوبیری کا وہ پودا جس نے ضد پکڑلی تھی، بھلے کچھ بھی ہو وہ اپنا پھل دے کر ہی دنیا سے جائے گا، بولا:

''دوستو! یہ سب پھل جن کے تم نے نام لیے، پیدا ہوتے ہی ایسے نہیں ہو گئے تھے۔ انھیں بھی پہلے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ یہ سب ہماری طرح جنگلوں بیابانوں میں بغیر محنت، بغیر پھل پھول دیے مرجھا کر مر کھپ جایا کرتے تھے مگر ان میں سے کچھ نے ہمت نہیں ہاری اور پھل دے کر دنیا کو کچھ دے جانے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں بھی بغیر پھل پھول نکالے خود کو یوں فنا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو وہ دن دور نہیں جب ہم بھی سیب، انار، آم، امرود، انناس وغیرہ کی طرح جانے پہچانے جائیں گے۔ ہمیں کیلے، کھجور اور ناریل سے ہی کچھ حکمت سیکھنی چاہیے جنھوں نے ہمت نہ ہاری اور آج اس مقام تک پہنچے۔''

ان سب نے بلوبیری کی حکمت آموز باتیں سن کر فیصلہ کیا کہ ہم ضرور پھل پھول

نکالیں گے، بھلے کچھ بھی ہو۔

آخر کار وہ دن بھی آیا جب ایم اے انگلش اور ایم اے سائنس و ٹیکنالوجی و باٹنی بھی سٹرابیری، بلوبیری، ٹماٹر اور ہری مرچ کے دیوانے ہو گئے اور ان کی مانگ اور احترام سیب اور انار کے برابر ہو گئے۔ کچھ امرودوں نے بہتیرا زور لگایا، رخنے ڈالے، مگر الٹا انھی میں کیڑے پڑ گئے اور انھیں تائب ہونا پڑا۔

کوئی کچھ لے نہ گیا آج تلک دنیا سے
سب ہی کچھ دے کے گئے آج تلک دنیا کو
تو بھی پھل پھول نکال چھوڑ خزاؤں کا ڈر

Biometric Sensors

بایو میٹرک سنسر لگوانے کے باوجود جیری کو کب کینسر ہوا، کب وہ آخری سٹیج پر پہنچا اور کب اس کا انتقال ہوا، یہ کیس اب تک معمہ بنا ہوا تھا۔

جیری کی بیوی نے بایو میٹرک سنسر بنانے والی کمپنی پر کیس فائل کر رکھا تھا اور پچھلے دو سال سے میں اور اس کی بیوی پیشیاں بھگت کر تھک چکے تھے۔

جیری سے میری پرانی شناسائی تھی۔ ہم دونوں دوست تھے۔ مڈل ایج میں ہونے کی وجہ سے صحت کو لے کر دونوں ہی کافی سنجیدہ رہا کرتے تھے۔ خاص طور پر جیری کو کوئی بھی صحت مند رہنے کی کوئی بات بتاتا تو وہ اسے بڑے غور سے سنتا اور ہر ایسی بات کو پلے باندھ لیتا جو حفظانِ صحت کے بارے میں ہوتی۔

کچھ عرصے سے بایو میٹرک سینسر جسم میں لگوانے کی تشہیر ہر جگہ ہو رہی تھی۔ جیری بھی میری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ہم دونوں نے سوچا، کیوں نہ چل کر اس بارے میں معلومات لی جائیں۔ ٹیلی وژن میں تو بار بار مختلف اداروں کے اشتہارات میں یہی بتایا جاتا تھا کہ بایو میٹرک سینسر لگوانے والے کو بروقت ہر قسم کی بیماری کا پیشگی پتا چل جایا کرے گا اور کوئی بھی جسمانی بیماری پہلی سٹیج سے آگے نہ جا پائے گی۔ یہاں تک تو یہ دعویٰ کافی تسلی بخش تھا مگر جزئیات کیا تھیں، کچھ خاص پلے نہ پڑتا تھا۔

جیری اور میں نے فیصلہ کیا کہ مختلف کمپنیز کے دفاتر جا کر آگے کے مراحل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم دونوں اگلے دن ایک متعلقہ دفتر پہنچے تو وہاں بڑے بڑے ڈیڑھ ڈیڑھ سو سال کے بوڑھوں کے ہشاش بشاش مسکراتے قد آدم پوسٹرز دیواروں پر دائیں بائیں آویزاں تھے۔ جیری نے میری طرف مسکرا کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، ٹھیک جگہ پہنچے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک سفید کوٹ پہنے ایک درمیانی عمر کا ڈاکٹر موجود تھا۔ عملے نے میرا اور جیری کا تعارف اس سے کروایا۔

ڈاکٹر جس نے اپنا نام مائنڈو بتایا، کافی دل چسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ دونوں فوراً یہ سنسرز فٹ کروالیں جو ایک آسان آپریشن سے فٹ کیے جاسکتے ہیں مگر اس کے لیے آپ کو چوبیس گھنٹے بھوکا رہنا پڑے گا بس۔

"چوبیس گھنٹے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

مگر جیری نے تو فوراً وہیں حامی بھر لی کہ ٹھیک ہے، البتہ میں اب بھی تھوڑا تذبذب کا شکار تھا۔ ڈاکٹر مائنڈو نے بتایا کہ ان کو لگوانے کے بعد تھوڑی سی ماہانہ فیس بھی ہوگی جس دوران ہم آپ کے جسم کی ماہانہ رپورٹ بذریعہ پوسٹ اور ای میل آپ کو بھیجا کریں گے تاکہ آپ کو ساتھ ساتھ جسم کی اندرونی تازہ ترین صورت حال کا پتا چلتا رہے اور ایمرجنسی یا حادثے کی صورت میں بھی ہماری کمپنی ایمبولنس کا انتظام سب سے پہلے کر کے دے گی اور آپ کو بروقت طبی امداد مہیا کرے گی۔

"یہ تو بہت ہی زبردست بات ہے، کیوں جازن؟" جیری نے میری طرف دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

"تو پھر آپ دونوں کب آرہے ہیں، جیری آپ تو آج ہی تیار دِکھ رہے ہیں؟"
ڈاکٹر مائنڈو نے مسکراتے ہوئے جیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس سے پہلے کہ جیری کچھ بولتا، میں نے لقمہ دیا:

"ڈاکٹر مائنڈ و، ہم ذرا سوچ کر آپ کو بتاتے ہیں۔"

میں نے حیری کو آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا کہ اٹھو۔ جب ہم کمرے سے نکلے تو حیری بولا:

"یہ کیا تھا، اتنی اچھی ڈیل ہو رہی تھی!"

میں نے کہا:

"حیری اور بھی تو کمپنیز ہیں۔ کہ نہیں؟"

"ہاں وہ بات تو ٹھیک ہے تمھاری۔"

حیری نے کچھ سوچ کر کہا۔

کچھ دور جا کر ہم ایک دوسری کمپنی کے دفتر میں گھسے جو چائنہ کے بہت ہی سستے بایو میٹرک سنسرز اور نینو روبوٹ جسم میں فٹ کرنے کا کام انتہائی سستے داموں میں کر رہے تھے۔ ان کے ریٹس دیکھ کر میں اور حیری حیران رہ گئے۔ پوسٹر بورڈ پر بھی ایک سو ستر سال کا ایک چائنیز قمیض اتارے برف باری میں کراٹے کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حیری اور میرا منہ کچھ دیر کے لیے کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

کچھ دیر بعد دو نرسیں ہم دونوں کو ایک ہال میں لے گئیں جہاں ایک لیڈی ڈاکٹر سے ہمارا تعارف کروایا گیا۔ ڈاکٹر چی نے بتایا کہ ہم دونوں خوش قسمت ہیں کہ آج کے دن یہاں آئے، آج ہمارے ادارے کی پہلی سالگرہ ہے اور آج کے دن کنٹریکٹ کرنے والوں کو آدھی قیمت میں بایو میٹرک سینسر لگائے جائیں گے۔

حیری خوشی سے ایک دم سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کا بازو کھینچا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

حیری نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے پوچھا:

"تو کیا آپ کا مطلب ہے جو قیمتیں باہر لگی ہیں، ان کی بھی آدھی قیمت میں دو سو سال تک تندرست رہنے والے سنسر لگائے جائیں گے؟"

"جی ہاں، بالکل۔ آدھی قیمت میں۔"

حیری کی باچھیں یہ سن کر بہت دیر تک کھلی رہیں۔

میں نے ڈاکٹر جی سے پوچھا کہ اور جو ماہانہ رپورٹ اور ایمرجنسی کی صورت میں مدد ہے، اس کا کتنا خرچ ہے؟

ڈاکٹر جی نے مسکرا کر دیکھا اور بولیں:

"لگتا ہے آپ اِدھر اُدھر کے ریٹس سب دیکھ کر یہاں آئے ہیں۔"

حیری اور میں کھسیانی ہنسی ہنس کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ڈاکٹر جی دوبارہ بولیں:

"جگر تھام کر بیٹھیں، جو میں اب آپ کو بتانے والی ہوں۔"

"جی!"

ہم دونوں یک زبان ہو کر بولے۔

ڈاکٹر جی بولیں:

"بعد کی ماہانہ رپورٹس اور ایمرجنسی امداد کے تمام تر اخراجات اور جب تک آپ زندہ رہیں گے، کمپنی آپ کے سنسرز کی مینٹیننس اور خراب ہو جانے کی صورت میں نینو روبوٹس کی تبدیلی کا کام بھی مفت کرے گی۔"

"کیا؟"

حیری کی چیخ گلے میں دب کے رہ گئی۔

میں نے برابر بیٹھے حیری کی مٹھی پر چٹکی کاٹی۔ درد سے حیری کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ڈاکٹر جی نے حیری کی طرف دیکھا اور بولیں:

"یقیناً یہ خوشی کے آنسو ہیں۔"

"جی۔۔۔" میں نے چبا کر کہا۔

ڈاکٹر جی فوراً بولیں:

"میں نے ٹھیک کہا تھا نا، آپ دونوں خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ایک ہیں۔"

"ایک۔۔۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی وہی، وہی میرا مطلب تھا دو۔"

ڈاکٹر چی نے آنکھیں گھما کر کہا:

جیری نے بھی سارے دانت نکالتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

اس دوران ڈاکٹر چی کو کسی نے بلایا اور وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

جیری تو جیسے موقعے کے انتظار میں تھا، فوراً بولا:

"جوزن، اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔ آج تو بس کسی بھی حال میں کنٹریکٹ کر کے اٹھنا ہے یہاں سے۔ تم اگر نہیں بھی مانے میں تو ضرور کروں گا۔"

میں نے اسے کافی سمجھایا، یہ بہت پرانا پھنسانے کا طریقہ ہے جیری کہ آج ہی ڈسکاؤنٹ ملے گا، آج ہی فائدہ ہو گا۔ ایسے تمام لوگ فراڈ ہوتے ہیں دوست، جو سوچنے کا موقع نہ دیں اور جلد بازی میں کسی اہم فیصلے کے لیے منوالیں۔ میرا مشورہ ہے ایک دو دن رک جاؤ۔ جیری میری بات سن کر یک دم بھڑک اٹھا اور بولا:

"تم کتنے احمق ہو، اتنا بہترین موقع چھوڑنے کا کہ رہے ہو۔ میں تو آج ہی کنٹریکٹ کروں گا، بس!"

یہ بول کر جیری غصے سے اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں خاموشی سے مجبوراً اُسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس دفتر سے واپس نکل گیا۔

کچھ دن ہم ایک دوسرے سے ناراض رہے۔ اس دوران میں نے بھی ایک دوسری یورپی کمپنی سے اچھی ڈیل کے ساتھ بایو سنسرز اور نینو روبوٹ فٹ کروا لیے تھے اور مجھے اپنی موجودہ صحت کی پل پل کی رپورٹ میرے موبایل فون پر ملنے لگی۔ کس پل میں خوش ہوں، ڈوپامائن کتنی خارج ہوئی، سٹریس ہارمون کا اتار چڑھاؤ، غصے کی تازہ نوعیت، کولیسٹرول لیول،

بلڈ پریشر، سب کی خبر میسج میں ملتی رہتی۔ ایک دن موبائل پر اپنا کرنٹ خوش موڈ دیکھ کر میں جیری کے ہاں پہنچا۔ جیری بھی بظاہر اچھے موڈ میں نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا:

"معاف کرنا جوزن، بس اس دن دماغ کام نہیں کر رہا تھا اور پھنس گیا تھا۔ کمبخت عجیب کمپنی ہے، کبھی میل بھیجتے ہیں کبھی نہیں۔ الٹا عجیب عجیب قسم کے فون پر میسج بھیج دیتے ہیں۔ کبھی بولتے ہیں ڈانس کرو، کبھی کہتے ہیں چار بجے اٹھ کر ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاؤ، کبھی کہتے ہیں سانس روکنے کی مشق کرو۔"

میں نے اسے بتایا کہ میری کمپنی کا تو سارا ڈیٹا میرے اپنے موبائل پر آتا ہے۔ میں خود ہی دیکھ کر اس کے حساب سے اپنی خوراک اوپر نیچے کر لیتا ہوں یا ضرورت پڑنے پر چھوٹی موٹی دوا لے لیتا ہوں۔

"اچھا! پھر تو مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔ سستے کے چکر میں ناکارہ بایو سنسر فٹ کروا بیٹھا۔" جیری نے افسردہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی ہمت بندھائی اور کہا:

"فکر نہیں کرو، انھیں نکلوا کر اچھی کمپنی کے نینو روبوٹس فٹ کروالیں گے پھر اپنے موبائل پر ہی اپنی تازہ صورت حال دیکھ لیا کرنا۔"

کچھ ماہ یونہی گزر گئے۔ ایک دن فون آیا کہ جیری ہسپتال میں داخل ہے۔ اسے ایمرجنسی میں اس کی بیوی اپنی گاڑی میں ہسپتال لے کر گئی جہاں ڈاکٹرز نے بتایا کہ اس کا کینسر آخری سٹیج پر ہے۔

ایک ہفتے میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر اس کے گھر اور مجھ پر بجلی بن کر گری۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اپنی صحت کو لے کر اتنا پُر جوش انسان بھی پچپن سال کی عمر میں کینسر جیسے مرض کے ہاتھوں موت کے منہ میں چلا جائے گا۔

جب میں اگلے دن اس کمپنی کے دفتر پہنچا جنھوں نے جیری کو بایو سنسرز فٹ کر کے دیے تھے، تو دیکھا وہاں مراقبے کا سکول بن چکا تھا۔

موقا

لڑکا پیدا ہونے کا مطلب تمام عمر استحصال برداشت کرنا ہے۔ جب سے موقا نے ہوش سنبھالا تھا، اپنے ارد گرد صنفی تفریق دیکھ دیکھ کر وہ تھک چکا تھا۔

اس کی تین بہنیں تھیں، تینوں ماں کی لاڈلی تھیں مگر بچپن سے ہی یہ بات اس کی گھٹی میں بٹھا دی گئی تھی کہ وہ لڑکا ہے، اس کی زندگی کا مقصد گھر بار کی دیکھ بھال، کھانا پکانا، صفائی ستھرائی اور جب اس کی کسی وجیہہ لڑکی سے شادی ہو گی، اس کی دیکھ بھال کرنا اور اسے کسی بھی حال میں خوش رکھنا ہے۔ ان کاموں کے علاوہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

موقا کو جلد ہی اسکول سے بھی اٹھا لیا گیا۔ اس کی ماں کے بقول لڑکوں نے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے، آخر کو تو اپنی بیوی کی روٹیاں ہی پکانی ہیں۔ پڑھ لکھ کر وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔

موقا اپنی بہنوں کے چھوٹے چھوٹے کترے بال دیکھ کر دل میں ہمیشہ سوچتا، کاش اس کے بھی بال چھوٹے ہوتے مگر اس کی ماں نے اسے سختی سے منع کر رکھا تھا: "خبردار جو تم نے کبھی بال کٹوائے۔"

اس کی ماں کے بقول لڑکوں کے بال جتنے لمبے ہوں، اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی لڑکیوں جیسے چھوٹے بال کٹوا کر سب اسے ماہی کڑی سمجھیں گے اور پھر چھوٹے بالوں سے اچھی لڑکیوں کے رشتے بھی نہیں آئیں گے۔

موقا دل ہی دل میں کڑھتا رہتا، کہ کاش وہ بھی کبھی اپنی بہنوں کی طرح آزاد زندگی گزار سکتا۔

اس نے اپنی ماں سے سنا تھا کہ وہ اچھے زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ پرانے وقتوں میں لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی زمین میں دفن کرنے کی روایت ہوا کرتی تھی اور جو بچ جاتے تھے، وہ اپنی دلھن کی موت کے بعد اس کے ساتھ مر جایا کرتے تھے۔ اس کی ماں یہ باتیں اسے بتا کر ہمیشہ افسردہ چہرہ بناتی اور کہتی: "لڑکوں کی قسمت ہی ایسی ہوتی ہے، پرانے لوگ بھی کیا کرتے بے چارے۔"

موقا اپنی ماں کی بات سن کر ہمیشہ سہم جاتا۔ موقا کا باپ سوکا' سارا دن موقا کے ساتھ گھر کے کام کرتا۔ رات میں جب سب سو جاتے، تب جا کر موقا اور سوکا دونوں سو پاتے۔ صبح ہوتے ہی ہر طرف سے آوازیں بلند ہو جاتیں۔ موقا ناشتہ لاؤ، سوکا یہ لاؤ، وہ کہاں ہے؟ یہ کہاں ہے؟ موقا کی ماں اکثر موقا کے باپ سے بد زبانی کیا کرتی۔ موقا کا باپ خاموشی سے سب سہہ جاتا اور اکیلے میں اکثر موقا اسے روتے ہوئے دیکھتا۔

موقا اب سولہ سال کا ہو چکا تھا۔ ایک دن اس نے دن میں، جب تینوں بہنیں اور اس کی ماں نوکری پر گئے تھے، اپنے باپ سے پوچھا:

"بابا جان ہم لڑکوں کی قسمت اتنی بری کیوں ہے؟"

موقا کے باپ سوکا نے اسے گلے لگایا اور کہا:

"نہیں بیٹا، ایسا کبھی نہیں سوچنا۔ سب لڑکیاں بری نہیں ہوتیں۔ اس جہان میں اچھی لڑکیاں بھی ہیں۔ مجھے امید ہے تمھیں ضرور کوئی اچھی لڑکی اپنائے گی جو تمھارا بہت خیال رکھے گی، تمھارے ناز اٹھائے گی اور بیٹا تم بھی اپنی دلھن کو خدا کے بعد سب سے زیادہ عزت دینا۔ ہمارا دھرم بھی ہمیں یہی سکھاتا ہے۔ یہ کتاب لو بیٹا، اس میں وہ ساری باتیں لکھی ہیں جو تم نے تمام عمر یاد رکھنی ہیں۔"

"بابا جان یہ کتاب کسی مرد نے لکھی ہے؟"

موقا نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں میرے بیٹے، عقل و دانش کی جتنی بھی باتیں ہوتی ہیں، صرف خواتین ہی لکھ سکتی ہیں۔ ہم مردوں کو مکمل عقل نہیں ملی بیٹے۔"

"وہ کیوں باباجان؟"

موقا نے اپنے باپ سوکا سے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اس لیے بیٹے کہ ہم مرد جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور اور جذباتی ہوتے ہیں جبکہ عورتیں ہر چیز بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہیں اور جسمانی طور پر بھی وہ ہم سے بہت زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔"

موقا نے اپنے اور اپنے باپ کے کمزور جسم کو دیکھتے ہوئے کہا:

"وہ بات تو ٹھیک ہے آپ کی باباجان۔ واقعی عورتیں جسمانی اور ذہنی طور پر ہم سے مضبوط ہوتی ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مضبوط پیٹ اور بڑی بڑی چھاتیوں اور مردوں کی نسبت بہت ہی بڑے بڑے چوتڑوں کی مالک ہوتی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تم نے موقا بیٹے۔"

سوکا نے موقا کے کندھے کو دباتے ہوئے کہا۔

"اچھا بیٹا، تم اب آٹا گوندھو میں تمھاری ماں کے گندے انڈرویر، بنیانیں اور بریزئر دھو کر آتا ہوں۔ باقی بات پھر کریں گے۔"

کچھ دیر بعد جب سوکا اپنے سارے کام نپٹا کر واپس آیا تو موقا نے پوچھا:

"باباجان، یہ بتائیں جب میری شادی ہو جائے گی تو مجھے وہاں بھی یہی سب کام کرنے ہوں گے جو میں یہاں اپنے گھر میں سیکھ رہا ہوں؟"

"ہاں بیٹے، بالکل ایسا ہی ہے۔ لڑکے تو پرایا دھن ہوتے ہیں، آج نہیں تو کل تمھاری بھی شادی ہو گی اور تم اپنی دلھن کے گھر چلے جاؤ گے۔"

سوکا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

"لیکن مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں کہ شادی کے بعد کیا ہوتا ہے۔"

موقا نے شرماتے ہوئے اپنے باپ سوکا سے کہا۔

"ہاں بیٹے، وہ میں تمھیں سب بتادوں گا۔ بس ایک بات اپنے پلے باندھ لو۔ تمھاری بیوی تمھاری ان داتا ہے، وہ جو تمھیں کہے میری طرح جیسے میں تمھاری ماں کی ہر بات بلا چوں چرا سر تسلیم خم کرتا ہوں تم نے بھی کرنا ہے۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔" موقا نے ہکلاتے ہوئے کچھ بولنا چاہا۔

سوکا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں بس خاموشی سے اطاعت کرنی ہے اپنی دُلھن کی اور ہر وقت اس کے رزق کی دعا اور اس کے جان و مال کی حفاظت کرنی ہے۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں نے سنا ہے کہ۔۔۔ بیویاں رات میں اپنے شوہروں کے ساتھ زور زبردستی اور بہت ہی غیر اخلاقی حرکتیں بھی کر جایا کرتی ہیں۔ ان کا کیا؟"

"ان کا کیا۔۔۔ کیا!؟"

سوکا نے غصے سے کہا۔

"میرا مطلب ہے، کیا اپنی بیویوں کو اس قسم کے سلوک کی اجازت دینے کا نام ہی شادی ہے؟"

"ہاں! بالکل، اور کس لیے ہوتی ہے شادی؟ کون تمھیں بیاہ کر اپنے سر پر بٹھائے گا۔"

"ہیں؟؟"

"کیا خناس بھرا ہے تمھارے دماغ میں؟ تم کوئی پرنس ہو؟ کیا ہو تم؟"

سوکا نے غصے سے دھاڑ کر موقا سے کہا۔

موقا سہم کر چپ ہو گیا۔

"مجھے معاف کیجیے گا باباجان، میرا مطلب آپ کا دل دکھانا قطعی نہیں تھا۔"

سوکا نے لہجے کو نرم کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بیٹا، تمھاری ماں کی مثال تمھارے سامنے ہے۔ وہ اکثر مجھ سے ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے، کبھی کبھار اس کا ہاتھ بھی اٹھ جاتا ہے۔ ہاں وقتی طور پر مجھے برا لگتا ہے مگر جب ٹھنڈے دل سے ٹھہر کر سوچتا ہوں تو مجھے اپنا قصور نظر آ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کس پاگل کا دل چاہے گا اپنے مظلوم شوہر پر ہاتھ اٹھائے؟ بیٹے یاد رکھو، عورتیں دل کی بری نہیں ہوتیں۔ اب اپنی بڑی بہن نوکیلی کو دیکھو، ٹھیک ہے اسے نشے کی لت ہے مگر جب اس کا نشہ اترتا ہے، اس سے اچھی بیٹی کوئی نہیں پورے گھر میں۔ تمھاری چھوٹی بہن تند و تیز نے غلط فہمی میں اپنے کالج میں ایک لڑکے کو بری طرح پیٹا۔ اس کے دوستوں نے جب اس کی خاطر جذبات میں بہہ کر اس مغرور لڑکے کا ریپ کیا اور پھر تمھاری بہن کو غلطی کا احساس ہوا، وہ سب سے پہلے اس لڑکے کے گھر گئی اور اسے پھولوں کا گلدستہ پیش کیا۔ بیٹے یہ سب تربیت کا اثر ہے، اس کے پیچھے تمھاری ماں کا سخت رویہ اور میرا صبر ہے۔ ورنہ آج کے زمانے کی لڑکیاں توبہ استغفار۔۔۔"

"ہمم۔۔۔ یہ بات بھی آپ کی ٹھیک ہے باباجان۔"

موقا نے ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر مجبوراً کہا۔

موقا اندر ہی اندر کافی دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے باپ کی اصلاح کرے اور اسے ان ناانصافیوں کی وکالت کرنے سے باز کرے۔

مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

جلدی جلدی اس نے گھر کی صفائی ستھرائی کی اور سٹور میں اپنے بستر پر چلا گیا۔ شام کو جب اس کی بہنیں اور ماں آئیں، اس نے اور اس کے باپ نے سب کو کھانا دیا۔ برتن صاف کیے اور وہ سونے چلا گیا۔

صبح جب موقا کی آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ سارا گھر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ وہ جب نیچے آیا تو اس کی ماں اس کے لیے پراٹھا، انڈا اور دہی لیے بیٹھی تھی اور ہاتھ

سے کھلانا چاہ رہی تھی اور اس کی تینوں بہنوں میں سے ایک دور کھڑی برتن مانج رہی تھی، ایک ٹیبل صاف کر رہی تھی اور تیسری اس کے باپ کے جوتے پالش کر رہی تھی۔

اتنے میں اس کے باپ کی گرج دار آواز سنائی دی:

"کہاں مر گئی؟ اتنی دیر سے باتھ روم میں بکواس کر رہا ہوں کہ تولیہ دے دو، تولیہ دے دو۔"

موقا ٹیبل سے اٹھا اور پاس پڑی گندی جرابوں کا جوڑا اٹھایا اور باتھ روم سے ہاتھ باہر نکالے اپنے باپ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ایک زور دار چیخ باتھ روم سے سنائی دی اور سب نے کانوں میں انگلیاں دبالیں۔

بیوپاری

وہ چاروں چار ماہ بعد آج اکٹھے ہوئے تھے۔ وحشی جو ان تینوں کا ہیڈ تھا آج بہت سہا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے باقی تینوں کو خبر دار کرنے کے انداز میں کہا:

"آج کل حالات کافی خراب ہیں اور سختی بھی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہمیں اس بار بہت احتیاط سے اپنا کام کرنا ہو گا۔ آج جب میں اس ہوٹل میں تم لوگوں سے ملنے آرہا تھا تو میں نے دیکھا ایک شخص میرا پیچھا کر رہا تھا حالانکہ چار ماہ پہلے ہم نے جو جگہ اور وقت آج کی میٹنگ کے لیے طے کیے تھے، وہ ہم چاروں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کیا گزرے چار ماہ کے دوران تم تینوں نے کسی اور سے ہمارے اس کام کا تذکرہ کیا تھا؟"

وحشی نے سفاک اور باقی دو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"سفاک؟"

"نہیں باس، سوائے اس کے کہ پچھلے ماہ جب میں کینیا میں گینڈے کے سینگ اکٹھے کرنے کے اپنے مشن پر تھا، وہاں کی سیکرٹ پولیس میرے پیچھے پڑی رہی لیکن میں نے کچھ دے دلا کر پلان کے مطابق اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر کے بحفاظت چین نکل گیا تھا۔"

"اور تمھارا مشن کیسا رہا جلاد؟"

وحشی نے جلاد سے پوچھا۔

"میں انڈیا میں اپنا مشن مکمل کر کے آیا ہوں باس۔ میں نے وہاں سے شیروں کی بارہ اور چیتوں کی سات کھالیں اکٹھی کیں۔ وہاں کی پولیس کو میں نے سات لاکھ رشوت دی اور سب کام مکمل کر کے آسانی سے فرانس نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"اور تم بے حس؟"

وحشی نے بے حس سے پوچھا۔

بے حس تھوڑا ڈرا ہوا تھا، بولا:

"باس، میں نیروبی میں اپنے انتہائی مشکل مشن پر تھا جو آپ نے مجھے سونپا تھا۔ وہاں مجھے ہاتھی دانت اکٹھے کرنے کا ٹاسک مکمل کرنا تھا۔ میں اپنا کام کامیابی سے کر رہا تھا مگر کام تب خراب ہوا جب آپ نے مجھے کسی کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ آپ کو کسی برانڈڈ لیدر پرس بنانے کی کمپنی نے ایک بہت ہی زبردست آرڈر دیا ہے، جس کو مکمل کرنے کے بعد ہمارے وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ آپ نے مجھے دانتوں کے ساتھ ساتھ ہاتھی کی کھال اکٹھی کرنے کا انتہائی مشکل کام بھی سونپ دیا۔ آپ خود سوچیں، ہاتھی دانت کو تو کسی طرح میں فرنیچر اور کھانے پینے کے سامان میں چھپا کر سمگل کرنے کا کام برسوں سے کامیابی سے کر ہی رہا ہوں، مگر ہاتھی کی کھال کو سمگل کرنا میرے جیسے ماہر کے لیے بھی مشکل ترین ٹاسک تھا۔ تاہم میں نے کسی طرح وہاں مقامی نشے کے عادی پانچ لوگ تلاش کیے اور ہم ہاتھیوں کے علاقے میں فوریسٹ گارڈ کو رشوت دے کر ہمیشہ کی طرح پہنچ گئے۔ وہاں میں پہلے ہی پچھلے ماہ تین ہاتھی مار کر ان کے دانت نکال چکا تھا مگر ان کی کھالیں اس قابل نہیں تھیں اور ویسے بھی ہاتھیوں نے ان مردہ ہاتھیوں کو دبا دیا تھا۔ اس بار مجھے وہاں ایک صحت مند، خوبصورت، چمک دار جلد والا نر ہاتھی نظر آیا۔ اسے ہم نے کسی طرح گھیرا اور اس پر ہمیشہ کی طرح کلوروفام کی بوتلوں سے حملہ شروع کیا۔ باقی جانور ڈر کر دور بھاگ گئے مگر کلوروفام کے حملے کے بعد یہ ایک ہاتھی ہمارے سامنے مکمل طور پر بے بس ہو چکا تھا۔ ہم نے اسے گرایا اور سب سے پہلے الیکٹرک کٹر سے اس کے دانت اور کان انتہائی نفاست سے کاٹ ڈالے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ نے

تاکید کی تھی کہ ان کا چمڑا مہنگے برانڈ کے پرسوں میں استعمال ہو گا اور اس کی قیمت زیادہ ہو گی اور اسے دھیان سے کاٹنا ہے۔ اس کے بعد ہم نے مل کر بڑی جانفشانی سے ہاتھی کی پوری کھال کسی طرح کھینچی اور اُسے وہیں جنگل میں سکھایا اور اگلے دن تڑکے وہاں سے نکلنے لگے مگر جب ہم نکلنے لگے تو وہاں باقی جانور آہستہ آہستہ ہاتھی کی کھال اتری لاش کے پاس اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ کیا بتاؤں باس، سب جانور جس طرح بین کر رہے تھے، ہمارے کان دُکھنے لگے۔ میں نے ایک ہوائی فائر کیا۔ ہم سب جلدی جلدی جیپ پر بیٹھے اور وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔"

"شاباش میرے شیر دل ساتھیو۔"

وحشی نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"مجھے تم تینوں پر فخر ہے۔ میں خود بھی پاکستان کے مارخور، ریچھ، سانپ اور دوسرے جنگلی جانوروں کی کھالوں کی بھاری کھیپ اکٹھی کرنے میں کامیاب ہوا ہوں۔ اب مجھے جو نیا آرڈر ملا ہے، وہ نایاب زندہ پرندوں اور نایاب کچھوؤں اور چھچھوندروں کا ہے۔ میں تمھیں سب تفصیلات بتاتا ہوں۔ ہماری اگلی میٹنگ چائنہ 'ووہان' میں ہو گی۔ ہم وہاں آج سے ٹھیک چار ماہ بعد ہوٹل چی چواں میں ملیں گے۔ اس دوران ہر کام راز داری اور احتیاط سے کرنا ہو گا۔ شاباش!"

ہر طرف سوگ ہے بیاباں میں
ایک ہاتھی مرا ہے جنگل میں
سب درندے ہیں سوگ میں نڈھال
ایک ہاتھی کی لاش کے چوگرد
شیر نے دھاڑ کر سوال کیا
کس نے ہاتھی کا ایسا حال کیا
جسدِ خاکی کو کس کمینے نے

اس شقاوت سے پائمال کیا
کھال اس کی اتار کر کس نے
جنگلوں سے اسے نکال کیا
کون ظالم ہے کس درندے نے
دوست میرے کا ایسا حال کیا
سب درندے خموش گم سم تھے
سب تھے حیراں کہ کون ان میں سے
ایسی وحشت سے قتل کرتا ہے
کھال پوری بدن سے نچوا کر
جسدِ خاکی کو تنگ کرتا ہے
بھیڑیے نے کہا، حضور نہیں
ایسی حرکت میں کر نہیں سکتا
ہوں درندہ پہ کر نہیں سکتا
بولا چیتا، حضور جانتے ہیں
قتل ہاتھی میری بساط نہیں
اس کی حالت میں میرا ہاتھ نہیں
ایک چیونٹی وہاں چلی آئی
بولی؛ حضرت یہ کام ان کا نہیں
یہ درندوں کا نام ان کا نہیں
میں بتاتی ہوں سارا قصہ سنیں
کیسے انساں نے مارا قصہ سنیں
آدمی تین کل یہاں پر تھے

ان کے ہاتھوں میں نیزے بھالے تھے
دیکھنے میں وہ بھولے بھالے تھے
دیکھ کر ہاتھیوں کے کنبے کو
نیزے بھالوں سے ایک وار کیا
آپ کے دوست کا شکار کیا
مار کر اس کی کھال کو کھینچا
چاقوؤں سے یوں پایمال کیا
جسم سے گوشت کو نکال لیا
سن کے چیونٹی کی گفتگو ساری
سب درندوں پہ سکتہ طاری تھا
ظلم کا واقعہ یہ بھاری تھا
شیر اور بھیڑیے لگے رونے
ایک چیتے کی بندھ گئی ہچکی
سانپ اور اژدھا نے لی سسکی
سب نے ہاتھی کی لاش دفنائی
ایک خلقت وہاں چلی آئی
بیوی ہاتھی کی غم سے تھی نڈھال
سونڈ کو اس نے یوں بلند کیا
ایک نعرہ جنوں بلند کیا
آدمی آدمی کا قاتل ہے
آدمی ہر کسی کا قاتل ہے
آدمی ہر خوشی کا قاتل ہے

اس کی وحشت سے سب پریشاں ہیں
سب چرند و پرند اور درند
اس کی دہشت سے سب ہی حیراں ہیں
آدمی آدمی کا قاتل ہے
آدمی ہر کسی کا قاتل ہے
آدمی ہر خوشی کا قاتل ہے!

گلاشم نائنہ!

اس چھوٹی سی سلطنت شیشہ پور میں اب اکادکا لوگ ہی ایسے زندہ بچے تھے جو آئنے کے بارے میں جانتے تھے۔ نئی پود سب کی سب ہی بغیر آئنہ دیکھے اور جانے بڑی ہوئی تھی۔

آئنہ کے بغیر زندگی اب شیشہ پور سٹیٹ میں ایک معمول بن چکی تھی۔ سب لوگ بغیر آئنہ دیکھے اپنی زندگی کے کئی ماہ و سال گزار چکے تھے۔ حتیٰ کہ کسی کو اس بات سے بھی لینا دینا نہ رہا تھا کہ وہ کیسا دکھتا ہے۔

دو نسلوں پہلے اس چھوٹی سی سلطنت شیشہ پور میں آئنوں کو لے کر ایسا خوف بیٹھا کہ سب نے اپنے آئنے ہمیشہ کے لیے توڑ دیے اور زمین کی گہرائی میں ہر ایسی چیز دفن کر دی جس پر ان کا عکس ذرا سا بھی دکھائی دیتا تھا۔

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے نائنہ نامی ایک شہزادی تھی جو اس سلطنت کے بادشاہ شیشل کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کا باپ ایک سخت اور ظالم حاکم تھا۔ نائنہ بلا کی حسین تھی۔ اتنی حسین اور خوبصورت کہ سب سلطنت والے اس کے حسن کو نظر بھر کر نہ دیکھ سکتے تھے۔ جو نوجوان بھی اس کی ایک جھلک دیکھتا، اس کے حسن کا دیوانہ ہو کر اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتا۔ دور دور کی سلطنتوں میں بھی نوجوان اسے دیکھے بغیر ہی فقط اس کے قصے سن کر اس کے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے مگر شیشل بادشاہ کے خوف سے کوئی مرد اس کے قریب بھی نہیں

پھٹک سکتا تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو وہ بھی اپنے باپ کا اندازِ حکومت دیکھ کر اسی کی طرح خود سر اور مغرور شہزادی بن گئی تھی۔

جوں جوں وہ جوان ہو رہی تھی، نائنہ کے اپنے دل میں بھی اپنے حسین ہونے کا غرور اور بڑھنے لگا تھا۔ وہ ہر وقت آئنے کے سامنے بیٹھا کرتی اور گھنٹوں اکیلی بناؤ سنگھار کیا کرتی۔

اس کے ماں باپ بھی اس کے حسین اور خوبصورت ہونے پر دل ہی دل میں نازاں ہوا کرتے۔ انھیں امید تھی ایک دن ان کی ہمسائی امیر سٹیٹ چمک پور کا شہزادہ اس کا ہاتھ مانگنے کے لیے ضرور آئے گا۔ نائنہ کے باپ بادشاہ شیشل نے اپنی اکلوتی شہزادی کی خوشی کے لیے محل میں ہر جگہ آئنے لگوا رکھے تھے۔ وہ جہاں سے گزرتی اپنا عکس، اپنا روپ دیکھتی اور من ہی من میں خوش ہوا کرتی اور سوچتی کہ پوری سلطنت میں بلکہ پوری دنیا میں اس جیسا حسین کوئی اور نہ ہوگا۔

جب وہ چھوٹی تھی تبھی سے گھر میں اس کے ملازمین کو اسے دیکھنے یا بات کرنے کی قطعی اجازت نہ تھی۔ جب وہ اپنی خواب گاہ میں سونے کے لیے جاتی، سب ملازمین اس کے محل کے پسندیدہ شیش کمرے کی صفائی کیا کرتے جہاں وہ اپنے دن کا زیادہ تر حصہ رقص اور بناؤ سنگھار میں مشغول رہ کر بتایا کرتی تھی۔ ملازمین میں سے کچھ اس کمرے کے سب آئنوں کو مَل مَل کر صاف کیا کرتے اور دن میں اس کی خواب گاہ کی صفائی ستھرائی کا کام کیا کرتے۔ اگلے دن نائنہ اپنے شیش کمرے میں لگے آئنوں کا معائنہ کرتی۔ اگر ان میں ذرہ برابر بھی گرد یا نشان دِکھتا تو وہ اس سے برداشت نہ ہوتا۔ اور وہ اپنے باپ کو کہہ کر ان ملازمین کی کمر پر کوڑے برسوایا کرتی جنھوں نے ان شیشوں کو ٹھیک سے نہیں چمکایا تھا۔

اس کا باپ اس کے سب ناز نخرے اٹھاتا۔ وہ اسے ہمیشہ ایک چھوٹی سی بچی ہی سمجھا کرتا۔ اسے طرح طرح کے دور دیشوں کے لکڑی، موتیوں اور ہیروں کے کھلونے منگوا دیتا، مگر نائنہ کا دل صرف آئنوں میں ہی لگتا تھا۔ اسے اپنا آپ دیکھنا، اپنے حسن کو آئنے کے سامنے کھڑے ہو کر گھنٹوں تکنے میں ایک عجیب سا نشہ محسوس ہونے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ اس

کی نرگسیت کا نشہ اتنا بڑھ گیا کہ وہ اپنا شیش کمرا بند کر کے خود کو برہنہ کر کے مدہوشی میں رقص بھی کیا کرتی۔

کچھ دن پہلے اس کے محل کے ملازمین میں ایک گلاشم نامی لڑکا آیا تھا۔ نائنہ کے حسن کے چرچے گلاشم نے بھی سن رکھے تھے۔ نائنہ جس شیش کمرے میں دن بتاتی اور رقص کرتی تھی، اس کمرے کے شیشوں کی صفائی کی ذمہ داری کچھ دن کے لیے گلاشم کو سونپی گئی تھی۔ وہ ساری رات ان آئنوں کو پہلے چومتا، جہاں جابجا نائنہ کے بوسوں، انگلیوں اور جسم کے نشان ہوا کرتے۔ بعد میں وہ سب شیشوں کی دل وجان سے صفائی کرتا اور اتنا چمکاتا کہ نائنہ اگلے دن ان کی چمک دمک دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ گلاشم اس شیش کمرے کے گلدان میں روزانہ تازہ گلاب لگاتا۔ ایک دن نائنہ سے رہا نہ گیا اور اس نے اپنی ماں سے پوچھا:

”ماں، آج کل مرے شیش کمرے کی صفائی کون کرتا ہے؟ کیا کوئی نیا ملازم آیا ہے؟“

اس کی ماں نے اسے بتایا کہ ہاں، ہم نے گلاشم نامی نیا لڑکا رکھا ہے۔

نائنہ کو گلاشم نام بہت عجیب اور اچھوتا لگا۔ کچھ دیر وہ گلاشم گلاشم دہرا کر ہنستی رہی:

”کیسا عجیب نام ہے ناماں؟“

”نام سب ہی منفرد اور عجیب ہوتے ہیں میری خوبصورت شہزادی بیٹی۔“

نائنہ کی ماں ملکہ عکساں نے کہا۔

نائنہ اپنے شیش کمرے میں چلی گئی اور پھر ہمیشہ کی طرح اپنے بناؤ سنگھار میں مشغول ہو گئی۔

شام کو جب وہ اپنی خواب گاہ میں سونے گئی تو وہ کمرہ بھی آج پہلے کی نسبت خوب چمک رہا تھا اور وہاں بھی تازہ گلاب گلدان میں سجے تھے۔ کچھ دن یونہی گزر گئے، ہر روز وہ تازہ سرخ گلابوں کو دیکھتی اور ذہن میں گلاشم کا چہرہ گھڑنا شروع کر دیتی۔ کچھ راتوں سے وہ بے طرح بے چین رہنے لگی تھی۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ گلاب اور ہونٹوں کے مدھم نشان، جو گلاشم ہر روز آئنے پر چھوڑ جاتا تھا، گھومتے رہتے۔

ایک چاندنی رات میں وہ بہت دیر بستر پر کروٹیں لیتی رہی مگر نیند جیسے آج اس سے کوسوں دور تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ چھپ کر دیکھے، نیا ملازم گلاشم کیسا دکھتا ہے اور وہ کیسے اکیلے اتنی مہارت اور نفاست سے اس کے شیش کمرے اور خواب گاہ کی صفائی کرلیتا ہے۔ وہ چھپ کر گلاشم کو اس کے شیش کمرے میں گلاب سجاتے دیکھے اور یہ بھی جان سکے کہ ہونٹوں کے نشان کیا اس کا وہم ہے یا حقیقت میں کوئی ہر رات ایک مخصوص جگہ پر ہونٹوں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔

وہ اسی سوچ میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے انگڑائی لی اور اپنے اسی کے نیم برہنہ لباسِ شب میں بغیر جوتا پہنے چپکے سے باہر نکل گئی۔ سارا محل اس وقت نیند میں ڈوبا ہوا تھا، سوائے اس کے شیش کمرے کے، جہاں ہلکی آواز سے کسی حرکت کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

نائنہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی بالکل شیش کمرے کے باہر پہنچ گئی اور ایک دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ اندر اسے گندمی رنگت اور چھریرے بدن کا، کمر سے برہنہ نوجوان، حیرت انگیز طور پر ایک آئنے کے ساتھ منہ لگائے، ساکت، مجسمے کی طرح کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہونٹ آئنے کی سطح سے چپکے ہوئے تھے۔ آئنے کی دونوں اطراف پر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح چپکائے ہوئے تھے جیسے صلیب پر ٹنگی کوئی لاش ہو۔ نائنہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ لمبے بالوں کا خوبصورت جسم والا جوان برہنہ حالت میں اس انداز میں کیا کر رہا ہے۔ نائنہ جو خود بھی رات کا نیم برہنہ لباس پہنے کھڑی تھی، اس نے آج سے پہلے کسی مرد کو برہنہ نہیں دیکھا تھا۔ نوجوان کی برہنہ پشت دیکھ کر نائنہ کے جسم میں ایک عجیب سی مستی اور سرور سر اٹھانے لگا۔ آج سے پہلے کبھی اس کے جسم کے خاص حصے یوں متحرک نہ ہوئے تھے۔ جس کیفیت سے وہ اب اچانک پہلی بار گزر رہی تھی، وہ اس کے لیے بالکل نئی تھی۔ نائنہ کا جسم لمحوں میں پسینے سے شرابور ہوگیا۔ وہ یک دم وہاں سے بھاگنے کے لیے نکلی کہ اچانک اس کا بازو ایک گلدان سے ٹکرایا۔ گلدان کی آواز جونہی گلاشم نے سنی، وہ

بھی چوکنا ہو کر فوراً اپنا لباس تبدیل کرنے لگا۔ جب وہ باہر آیا تو اسے دور تک جاتے کوریڈور میں ایک ہیولہ سرپٹ بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ گلاشم سمجھ گیا ضرور کسی نے اسے برہنہ حالت میں دیکھ لیا ہے۔ گلاشم مسکرانے لگا۔

ادھر نائنہ پھولی سانس کے ساتھ جب اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو اسے کچھ نہ سوجھا اور وہ بے اختیار ہنسنے لگی اور بے خودی میں اپنے جسم کو مَس کرنے لگی۔ ناجانے کب اس کے منہ سے بے اختیار گلاشم کا نام نکلا اور پھر بہت دیر وہ بار بار گلاشم گلاشم نام دہرانے لگی۔

یہی نام دہراتی وہ اپنے بستر پر الٹی لیٹ گئی اور اپنے تکیے کو بوسے دینے لگی۔

اگلے دن صبح اس نے اپنے شیش کمرے میں اس جگہ جا کر دیکھا جہاں کل رات سونے کی طرح چمک دار کسرتی بدن والا برہنہ گلاشم آئنے کو بوسے دے رہا تھا۔ آج وہ جگہ بالکل شفاف اور صاف تھی، سوائے ایک جگہ ہونٹوں کے بوسہ کے مدہم نشان بنے ہوئے تھے۔ نائنہ نے اسی جگہ پر اپنے دونوں سرخ ہونٹ پیوست کر دیے جہاں اس نے تازہ سرخ غازہ لگایا تھا۔ کچھ دیر وہ ساکت دونوں ہونٹ آئنہ پر لگائے مدہوش کھڑی رہی۔ اس کے ذہن میں گلاشم کا سونے جیسا خوبصورت کسرتی جسم، اس کی کمر، اس کے خوبصورت بال سما چکے تھے۔ گو اس نے کل رات گلاشم کا چہرہ ٹھیک سے نہ دیکھا تھا مگر اس کی برہنہ پشت، اس کے آئنہ کی طرف لگا منہ، اس کے دل و دماغ پر مکمل طور پر چھا گیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں گلاشم کے چہرے کی بہت سی تصویریں گھڑ لیں۔

وہ اب روزانہ انتظار کرنے لگی کہ کب رات ہو اور وہ پھر گلاشم کے سونے جیسے چمک دار چھریرے بدن کو ایک بار پھر دیکھ سکے۔ کچھ راتیں وہ خاموشی سے چھپ کر گلاشم کو اسی انداز میں کھڑا دیکھتی اور مخمور طبیعت کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں آ جاتی۔ گلاشم کے بال ہمیشہ اس کے چہرے کو چھپائے رکھتے۔

اس رات وہ پھر نکلی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنے شیش کمرے کے باہر پہنچ گئی اور اندر جھانکنے لگی۔ کل جہاں نائنہ نے ہونٹوں کے نشان آئنے پر چھوڑے تھے، گلاشم وہاں

اپنے ہونٹ لگائے اسی صلیبی انداز میں برہنہ کھڑا تھا۔ کمرے کی روشنی مدہم تھی۔ گلاشم کا چہرہ بالکل نظر نہ آتا تھا مگر اس کے گندمی، سونے جیسے جسم پر کھڑکی سے چاندنی چھن چھن کر پڑ رہی تھی، جس سے اس کی پشت، اس کے گول کولھوں کے ابھار چمک رہے تھے۔ نائنہ کے سینے کے ابھار سخت ہو کر اس کے لباس کو مَس کرنے لگے تھے۔ نائنہ خود کو اور نہ روک سکی۔ اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دانت سے دبایا اور ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے شیش کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ آہستہ سے گلاشم کے بالکل پیچھے پہنچ گئی اور بے خودی میں پیچھے سے گلاشم کے جسم کو دبوچ لیا اور آنکھیں بند کیے اس کی کمر پر بوسے دینے لگی۔ گلاشم حیرانی سے مڑا، اس کا چہرا اُس کے گھنگریالے لمبے بالوں سے چھپا ہوا تھا۔ گلاشم نے بھی نائنہ کے جسم پر بوسوں کی برسات شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں نائنہ بے خودی میں آنکھیں موندے گلاشم کے بوسوں کے آگے نڈھال ہو کر بے بس موم کا جسم بنتی گئی۔ بالکل ایسی چکنی مٹی کی طرح جسے گلاشم جدھر موڑتا، وہ مڑ جاتی۔ گلاشم نے اس کے جسم کے ہر گوشے کو بوسوں سے تر کر دیا۔ نائنہ کے سینے کے ابھار نیزوں کی نوک کی طرح سخت ہو چکے تھے۔ گلاشم نے اپنے لعاب سے انھیں ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش کی مگر وہ جتنی کوشش کرتا، اس کا لعاب بخارات بن کر فوراً ہوا میں اُڑ جاتا اور نائنہ کے سینے کے ابھار اور گرم اور نوک دار ہو جاتے۔

گلاشم نے مجبوراً اس کے جسم کو اپنے جسم کے ساتھ اتنا بھینچ لیا کہ دونوں جسموں کا درجہ حرارت اوپر نیچے حرکت کرنے سے ایک ہو گیا۔

کچھ دیر بعد جب نائنہ کا جسم ذرا سرد ہوا اور زور زور سے سانس لینے کے دوران اس نے اپنی دونوں آنکھیں کھولیں تو گلاشم کے چہرہ پر اس کے سارے بال پردے کی طرح اب بھی گرے ہوئے تھے اور وہ برہنہ صلیب کے انداز میں زمین پر لیٹا آہستگی سے ناک سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نائنہ نے اس کے چہرے سے آہستہ آہستہ بال ہٹائے تو اس کی چیخ اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ اس کے سامنے ایک خوفناک چہرہ برآمد ہوا جو جگہ جگہ شیشے کے پرانے زخموں سے کٹا پھٹا تھا۔ نائنہ پھٹی آنکھوں کے ساتھ یک دم

خوف سے پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں!۔۔۔"

اس نے زور سے چیخنا چاہا مگر اس کی آواز گلے سے باہر نہ نکل سکی۔

گلاشم کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

نائنہ وہاں سے فوراً اپنا لباس پکڑے سرپٹ بھاگی اور اپنی خوابگاہ میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر زار وقطار رونے لگی۔

ساری رات جب جب وہ آنکھ بند کرتی، اس کی آنکھوں میں گلاشم کا زخموں سے چور، جگہ جگہ سے کٹا اُدھڑا چہرہ دکھائی دیتا اور خوف سے اس کی آنکھ کھل جاتی۔

اگلے دن وہ سخت غصے میں اپنے باپ کے پاس گئی اور بولی کہ اس کے شیش کمرے کی صفائی والے لڑکے نے اس کے کمرے میں بہت برا کام کیا ہے۔ شیشے پر کسی کے ہونٹوں کے نشان موجود ہیں اور کوئی سرخ گلاب بھی وہاں رکھتا ہے، جو بھی ہے اسے اس کی گستاخی کی سزا دی جانی چاہیے۔ اس کا باپ گلاشم کی حرکت کا سن کر غصے سے کانپنے لگا اور بولا:

"حیرت ہے، اتنے سالوں میں بھی اس نیچ ذات کو کام کرنا نہیں آیا۔ میں اسے ابھی مزہ چکھاتا ہوں۔"

"اتنے سالوں میں؟ مگر میں نے تو سنا یہ نیا ملازم ہے۔"

نائنہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، تم شاید بھول گئی۔ کچھ سال پہلے جب تم ابھی چھوٹی تھی اور میں نے تمھیں تمھاری چودھویں سالگرہ پر گول موتیوں سے مزین آئنہ تمھاری فرمائش پر تمھیں تحفۃً دیا تھا مگر اس خبیث نے تمھارا پسندیدہ آئنہ صفائی کرتے ہوئے توڑ دیا تھا اور میں نے اسی آئنے کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیوں کو اس بدذات کے منہ اور دانتوں سے اکٹھے کرنے کو کہا تھا، جس سے اس کا پورا چہرہ جگہ جگہ سے چھل گیا تھا اور اسے تمھارے سامنے کوڑے بھی مروائے تھے تاکہ یہ عمر بھر یاد رکھے کہ میری پری شہزادی بیٹی کے آئنہ کو توڑنے کا کیا انجام ہوتا

ہے۔"

یہ بتا کر شیشل بادشاہ ہنسنے لگا۔

اس کے بعد چار سال تک یہ احمق ہمارے اصطبل میں کام کرتا رہا مگر ضد کرتا تھا کہ پھر اسے محل کی صفائی کا ایک موقع دیا جائے اور اب کی بار یہ ٹھیک کام کیا کرے گا۔ کل ہی تمھاری ماں بتا رہی تھی تم اس کے کام، اس کی صفائی ستھرائی کی تعریف کر رہی تھی مگر ایک دن میں یک دم کیا ایسا ہوا کہ۔۔۔"

نائنہ نے باپ کی بات سننے کے دوران ہی یک دم رونا شروع کر دیا۔

نائنہ کا باپ بھی پریشان ہو گیا اور بولا:

"میری پری شہزادی بیٹی، تم پریشان نہ ہو۔ میں ابھی اسے تمھارے سامنے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ پورا گاؤں یاد رکھے گا۔ اس کی اتنی ہمت کہ میری حور بیٹی کا دل دکھائے۔ دیکھو میں اب کیا کرتا ہوں اس کم ذات کے ساتھ۔"

بادشاہ شیشل نے حکم دیا، ابھی گلاشم کو فوری حاضر کیا جائے۔

ملازمین نے بتایا، وہ آج صبح ہی سلطنت چھوڑ کر جا چکا ہے۔

بادشاہ شیشل نے شہزادی نائنہ کی طرف دیکھا اور کہا:

"دیکھا، بھاگ گیا کم ذات۔"

مگر نائنہ یہ سن کر اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بادشاہ شیشل کو سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ اس نے کہا:

"تم فکر نہ کرو میری جان بیٹی، میں اسے بھاگنے نہیں دوں گا!" اور اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ جیسے بھی ہو گلاشم کو پکڑ کر لاؤ۔

کچھ دن یونہی گزر گئے، نائنہ کو اس دوران آئنوں سے نفرت سی ہو گئی۔ وہ ہر روز اپنے ماں باپ کو کہہ کر باقی ملازمین کو کوڑے مارنے کے بہانے بلاتی مگر کوئی بھی کمر، کوئی بھی جسم گلاشم جیسا اسے نظر نہ آتا۔ ہر رات گلاشم اسے خواب میں دکھائی دیتا، ہر رات وہ بے

چینی سے اکیلے شیش کمرے کے چکر لگاتی۔ ایک ماہ گزر چکا تھا، گلاشم کا دور دور تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔

کچھ دن بعد نائنہ کو زوروں کا تاپ چڑھا۔ نہ وہ بناؤ سنگھار کرتی تھی نہ ہنستی اور نہ کسی سے بات کرتی۔ سوئے ہوئے بھی گلاشم گلاشم دہراتی۔ اس کی ماں سخت پریشان تھی۔ طبیب کو بلایا گیا تو معلوم ہوا وہ ماں بننے والی ہے۔ پورے محل میں طوفان آگیا۔ اس کے ماں باپ آخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ ان کی بیٹی کی زندگی تباہ کرنے کے پیچھے ہو نہ ہو، یہ گلاشم کا ہی ہاتھ ہے۔

اس دوران کہیں سے گلاشم کا پتا مل گیا۔ وہ اس سلطنت سے دو سو کوس دور ایک گاؤں میں باغات میں مزدوری کر رہا ہے۔

بادشاہ شیشل نے پلٹن بھیجی اور گلاشم کو آخر کار گرفتار کر لیا۔

گلاشم کو گلے میں طوق اور بیڑیاں پہنا کر صلیب کے انداز میں محل کے پاس جلاد گھاٹ میں لایا گیا تو پوری رعایا وہاں جوق در جوق امڈ آئی۔ شر سب اس پر تھو تھو کر رہے تھے۔ کچھ لوگ اس پر شیشے کی کرچیاں پھینک رہے تھے جس سے اس کا پورا جسم لہولہان ہو چکا تھا۔ اس کی کمر پر شیشے کی کرچیوں سے تیار کیا گیا چابک بھی گاہے گاہے مارا جا رہا تھا جس سے اس کا جسم تار تار ہو رہا تھا۔

محل میں جب یہ خبر نائنہ تک پہنچی تو وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ ''گلاشم آگیا، میرا گلاشم آگیا!'' کہہ کر بستر سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اس جلاد گھاٹ کی طرف بھاگی جہاں گلاشم کو سزا کے لیے باندھا گیا تھا۔

اس کی ماں ملکہ عکساں بھی اس کے پیچھے بھاگی مگر وہ پھرتی سے سیدھی اس عرشے پر پہنچ گئی جہاں گلاشم بندھا تھا اور اس کے پورے جسم سے خون رس رہا تھا۔

مجمع نے شہزادی نائنہ کو یک دم سامنے دیکھ کر خوشی سے نعرے بازی شروع کر دی مگر خلاف توقع نائنہ نے گلاشم کو یک دم سینے سے لگا لیا اور اس کے زخم اپنے دوپٹے سے صاف

کرنے لگی۔

بادشاہ شیشل اور ملکہ عمّساں کے لیے یہ منظر خلاف توقع تھا۔ انھیں فوری طور پر لگا کہ شاید ان کی بیٹی صدمے میں ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔

بادشاہ شیشل نے جلاد کو اشارہ کیا۔

ملازمین نے زبردستی نائنہ کو الگ کیا تو نائنہ چیخنے چلانے لگی:

"چھوڑ دو میرے گلاشم کو۔۔۔

میرے گلاشم کو مت مارو۔۔۔

گلاشم۔۔۔!

گلاشم۔۔۔!

او میرے پیارے گلاشم

مجھے معاف کر دو

گلاشم!!

مجھے معاف کر دو

میں صرف تمھاری ہوں گلاشم!

شیشل بادشاہ کا چہرہ غصے سے لال ہو چکا تھا۔ نائنہ کی ماں کے آنکھ سے آنسو رواں تھے۔ وہ دونوں نائنہ کی اس تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ نائنہ کی ماں اسے اس کے کمرے میں لے گئی اور سمجھانے بجھانے لگ پڑی۔

ادھر مجمعے نے بھی شہزادی نائنہ کی گلاشم کے لیے ہمدردی دیکھ کر یک زبان رحم رحم کی صدا بلند کرنی شروع کر دی مگر بادشاہ شیشل غصے سے آگ بگولہ ہو چکا تھا۔

بادشاہ نے جلاد کو اشارہ کیا کہ گلاشم کا کام تمام کر دیا جائے۔

جلاد نے بادشاہ کا اشارہ ملتے ہی ایک ہی وار میں گلاشم کی پیٹ میں دو دھاری تلوار گھونپ دی۔

گلاشم کی موت دیکھ کر شیشل بادشاہ کے چہرے پر خوف زدہ مسکراہٹ صاف دکھائی دینے لگی۔

جونہی گلاشم کی لاش کو صلیب پر لٹکا کر بلند کیا، وہ نائنہ کی خواب گاہ کی کھڑکی کے بالکل نیچے آگئی۔ شہزادی نائنہ نے اپنے کمرے میں پڑے ایک ہیروں جڑے آئنے کو ہاتھ میں پکڑا اور محل کی کھڑکی سے نیچے اس لکڑی کے مینار پر چھلانگ لگادی جس پر گلاشم کی لاش کو صلیب کی صورت میں عبرت کا نشان بنایا گیا تھا۔

گلاشم اور نائنہ اب ایک ہی لکڑی پر جھول رہے تھے۔

اس ہولناک انجام کے بعد سب لوگوں نے اپنے گھروں کے آئنے گلاشم اور نائنہ کی لاشوں کے پاس لاکر ایک ایک کر کے توڑنے شروع کر دیے اور ان کے ساتھ پوری سلطنت کے سب آئنے بھی ہمیشہ کے لیے دفن کر دیے گئے۔ صرف گلاشم اور نائنہ کے مقبرے کے اندر وہ تمام کرچیاں گنبد کے اندر لگادی گئیں جو مقبرہ میں داخل ہوتے ہی اندھیری راتوں میں ستاروں کی طرح جگ مگ کرتی ہیں اور چاندنی رات کا منظر پیش کرتی ہیں۔

صدیاں گزر گئیں، اب بھی چاندنی راتوں میں کچھ لوگوں کو اس مقبرے کے آس پاس گلاشم اور نائنہ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اکثر محبت میں شرابور نظر آتے ہیں۔

سچل

آج عدالت میں قتل کے ایک مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔

ملزمہ مجو نامی ایک عورت تھی جس پر قتل جیسے سنگین جرم کا الزام تھا۔ الزام کی تفصیل یہ تھی کہ اس نے ایک شریف انسان کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر ہلاک کیا اور آلۂ قتل سمیت وہاں سے بھاگ گئی۔ جس عمارت کے فلیٹ میں اس اندوہناک قتل کی واردات ہوئی، دو عورتوں نے اپنی کھڑکی سے ملزمہ سے ملتے جلتے حلیے کی عورت کو فلیٹ کی سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ لاش کے پوسٹ مارٹم سے موت کا وقت اور ملزمہ کا فلیٹ کی سیڑھیوں میں دیکھے جانے کا وقت سب میچ ہو رہا تھا۔ تمام ثبوت یہی بتا رہے تھے کہ ملزمہ ہی نے مقتول جابر کے دروازے پر بیل دی، جونہی مقتول نے دروازہ کھولا، ملزمہ نے تیز دھار چاقو جابر کے پیٹ میں گھونپ دیا اور موقعے سے فرار ہو گئی۔ جابر کی لاش فلیٹ کے دروازے کے درمیان پھنسی ہوئی تھی اور جب جابر کی بیوی بچوں کو اسکول سے لے کر گھر واپس آئی، جابر مر چکا تھا۔

گواہوں کے بیانات اسی جانب اشارہ دے رہے تھے کہ ملزمہ مجو ہی کے ہاتھوں بے گناہ جابر کا قتل ہوا۔

ملزمہ مجو پیشے سے گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کرنے والی خاتون تھی۔ اس کی ایک پانچ چھے سال کی بیٹی تھی اور خاوند چوری اور رہ زنی کے جرم میں سات سال کی سزا کاٹ رہا

تھا۔ اہل علاقہ کی عمومی رائے میں ملزمہ بظاہر شریف عورت تھی اور گھروں میں کام کر کے اپنی روزی روٹی چلاتی تھی۔

مقتول جابر کے گھر بھی تین ماہ پہلے ملزمہ صفائی ستھرائی کا کام کر چکی تھی مگر پھر اپنی کسی نجی وجہ سے ملزمہ نے کام چھوڑ دیا اور دوسرے علاقے کے گھروں میں کام کرنے لگی تھی۔

پولیس کے ملزمہ تک پہنچنے کے پیچھے بھی یہی اہم وجہ تھی کہ فلیٹ کے لوگوں نے ملزمہ مجو کو تین ماہ قبل اس علاقے میں دیکھ رکھا تھا۔

یہ کیس پچھلے سات ماہ سے اٹکا ہوا تھا، استغاثہ کے پاس صرف دو گواہ تھے جنھیں خود بھی سو فیصد یقین نہیں تھا کہ ملزمہ ہی وہ عورت ہے جسے انھوں نے قتل کے قریب ترین وقت فلیٹس کی سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔ ملزمہ کا وکیل دفاع اس شک کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہ رہا تھا۔

کیس کا فیصلہ اب تک نہ ہونے کے پیچھے جو اہم وجہ تھی وہ یہی شک تھا جس کا فائدہ ملزمہ کو مل رہا تھا۔

ملزمہ مجو کی اپنی ذہنی حالت کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ ایک حرف بھی اپنے دفاع میں نہیں بول پا رہی تھی اور مکمل خاموشی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جیوری کے کچھ ممبران ملزمہ کی خاموشی کو اس کے اس گھناؤنے جرم میں ملوث ہونے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ایک سائیکاٹرسٹ کے بقول اس قسم کے مجرم اس طرح کے شدید نوعیت کے جرائم کے بعد عموماً اسی قسم کے شاک میں چلے جاتے ہیں۔ جیوری کے دس میں سے سات ممبران اور عوامی رائے سب ملزمہ کے خلاف جا رہی تھیں۔

کیس میں ایک عجیب موڑ آج اس وقت آیا جب ایک بچل نامی شخص اچانک عدالت میں آیا اور وکیل دفاع سے کچھ بات کرنے لگا۔ وکیل نے بچل کا اندراج گواہان کی فہرست میں کروایا۔ بچل جو خود کو اسی محلے کا رہائشی بتا رہا تھا جہاں ملزمہ آخری بار کام کاج کیا کرتی تھی

اور ملزمہ اس کے گھر بھی صفائی ستھرائی کا کام کیا کرتی تھی۔ سچل ایک معزز شہری تھا جو تدریس کے پیشے سے وابستہ تھا۔ وکیل دفاع نے پروفیسر سچل کو کٹہرے میں گواہی کے لیے بلایا اور سوالات شروع کیے۔

پروفیسر سچل نے بتایا کہ مجوان کے گھر کے کام کاج کے لیے ہر روز اڑھائی تین بجے آیا کرتی تھی اور جس روز اس قتل کی واردات ہوئی، اس روز بھی ملزمہ مجوان کے گھر میں دوپہر سے شام پانچ تک موجود تھی۔

پوری عدالت میں اس تہلکہ خیز بیان کے بعد ایک شور اٹھا۔ جج نے سب کو خاموش رہنے کے لیے سختی سے آرڈر کہا۔

اب باری تھی استغاثہ کے وکیل کی، اس نے پروفیسر سچل سے کراس سوالات پوچھنا شروع کیے:

"کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ملزمہ جس کو دو خواتین نے موقع واردات سے فرار ہوتے دیکھا ہے، اس وقت آپ کے گھر میں بھی موجود تھی اور موقع واردات پر ایک بے گناہ شخص کو قتل بھی کر رہی تھی؟"

عدالت میں ایک شور اور قہقہہ بلند ہوا۔

وکیل دفاع نے اوبجیکشن کہہ کر اپنا اعتراض نوٹ کروایا۔

"مائی لارڈ استغاثہ کے وکیل شک کو عینی شہادت اور یقینی گواہی سے ملا رہے ہیں جبکہ گواہان کے بیانات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انھوں نے ملزمہ سے ملتے جلتے حلیے کی عورت کو شام تین بج کر پانچ منٹ کے قریب سیڑھیاں اترتے دیکھا ہے۔"

ویسے بھی موقع واردات اور پروفیسر سچل کے گھر کے بیچ لگ بھگ گاڑی پر بھی پون گھنٹے کی مسافت درکار تھی اور بظاہر ملزمہ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں جگہ موجود ہو۔"

جج نے 'اوور رولڈ' کہا:

"گواہ کے گھر کے پتے کا ثبوت پیش کیا جائے۔"

جج نے وکیلِ صفائی کو حکم دیا۔

وکیل استغاثہ نے اگلا سوال پوچھا کہ پروفیسر سچل آپ کو چھ ماہ بعد اچانک آج کیسے خیال آیا کہ آپ ملزمہ کی بے گناہی کی گواہی دیں؟

پروفیسر سچل نے جواباً واضح کیا کہ ان کے علم میں یہ بات کچھ روز پہلے ہی آئی ہے کہ مجو قتل کے شبے میں جیل میں ہے اور یہ مقدمہ چھ ماہ سے چل رہا ہے۔ اور حال ہی میں انھوں نے ملزمہ کی تصویر اخبار میں دیکھی تو اس طرف توجہ کی۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ملزمہ کسی ذاتی مجبوری کے باعث کام چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی ہو گی، جیسا کہ اکثر ملازمین کرتے ہیں۔

وکیلِ استغاثہ نے پوچھا:

"چھے ماہ بعد آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ملزمہ جون اکیس ٹھیک تین بجے آپ کے گھر میں بھی موجود تھی؟"

وکیل صفائی نے کہا:

"استغاثہ کے وکیل ہر بات کے ساتھ "بھی" لگا کر معزز جج اور معزز جیوری ممبران کو الجھانا چاہ رہے ہیں۔"

جج: "اوور رولڈ!"

جج: "پروفیسر سچل جواب دیجیے۔"

پروفیسر سچل نے جواب میں کہا:

"جی، کیونکہ اس دن میرا یوم پیدائش تھا اور میری بیوی کے مرنے کے ایک سال بعد یہ میری پہلی سالگرہ تھی جس میں میری بیوی میرے پاس نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے مجو اور اس کی پانچ سالہ بیٹی قسمت میرے گھر میں اس وقت موجود تھیں اور یہ تین سے پانچ کے بیچ کا ہی وقت تھا۔"

عدالت میں بیٹھے لوگوں میں پھر ایک شور ابھرا۔

اس دوران استغاثہ کے وکیل کا ایک ساتھی بھاگ کر کمرۂ عدالت میں داخل ہوا اور وکیل کے کان میں کچھ کہنے لگا۔

استغاثہ کے وکیل نے پروفیسر چل سے پوچھا:

"کیا آپ دو دن پہلے ملزمہ سے ملنے جیل گئے تھے؟ آپ کا نام ملاقاتیوں کی فہرست میں لکھا ہے۔"

وکیل دفاع حیرانی سے ملزمہ اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔

پروفیسر چل:

"جی ہاں، جب مجھے اس واقعے کا پتا لگا، میں اپنی تسلی کے لیے ملزمہ جو سے ملنے گیا تھا۔"

وکیل:

"یہ ملاقات کتنی دیر تک رہی؟"

پروفیسر:

"شاید پندرہ منٹ۔"

وکیل:

"جہاں تک ہماری معلومات ہے ملزمہ کسی سے کوئی بات نہیں کرتی۔ کیا آپ بتائیں گے آپ نے ملزمہ سے اور ملزمہ نے آپ سے کیا ایسی بات کی جو آپ گواہی دینے پر آمادہ ہوئے؟"

وکیل صفائی:

"اوبجیکشن مائی لارڈ۔ استغاثہ کو کوئی قانونی حق حاصل نہیں کہ وہ ملاقاتی اور ملزمہ کے درمیان ہوئی بات چیت کی تفصیل بھی دریافت کرے۔"

جج:

"سسٹینڈ۔"

پروفیسر نچل نے کہا:

"مائی لارڈ، میں انسانی ہمدردی کے لیے ملزمہ کو دیکھنے گیا تھا اور صرف یہ جاننے کے لیے کہیں ملزمہ سے ملتی جلتی شکل کی کوئی اور عورت تو نہیں، مگر ملزمہ کو دیکھنے اور بات کے بعد میں سو فیصد یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ عورت جس کا نام مجو ہے اور جس کی چھ سال کی بیٹی قسمت ہے، یہ اکیس جون کو تین سے پانچ بجے سہ پہر میرے گھر پر سو فیصد موجود تھی۔"

عدالت میں پھر ایک شور اٹھا۔

جج نے سب کو آرڈر میں رہنے کا حکم دیا۔

پروفیسر نچل کے بیان نے پورے کیس کا رخ بدل دیا تھا۔

گو آلۂ قتل اور ملزمہ کا قتل کا اعتراف نہ کرنا بھی ملزمہ کو اب تک بڑی سزا سے بچائے ہوئے تھا مگر موجودہ صورت حال میں تو ملزمہ کی باعزت رہائی کے امکانات بہت حد تک یقینی ہو چکے تھے، جو آج سے پہلے تک جیوری سمیت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

جج اور جیوری ممبران نے پروفیسر نچل کی گواہی کے بعد ملزمہ کو باعزت بری کرنے کا حکم صادر کیا۔

ملزمہ مجو اب رہا ہو چکی تھی۔ اگلے دن وہ تین بجے اپنی پھول سی بیٹی قسمت کو لے کر پروفیسر کے گھر آئی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

ننھی قسمت ایک چھوٹی سی گڑیا سے کھیلنے لگی۔ مجو نے برتنوں کے شوکیس میں برتن رکھنے شروع کیے۔ وہیں ایک بڑی ڈش کے پیچھے اس نے ایک چھری کو نکالا جس پر خون جم چکا تھا۔ مجو نے اسے اچھی طرح دھویا اور صاف چھریوں کے ساتھ لگا دیا۔

مقتول جابر کی بیوی بھی غم سے نکلنے کی کوشش میں تھی۔ اس نے اپنے مرحوم خاوند کی الماری صاف کرنی شروع کی۔ اس کے پرانے کپڑے کسی غریب کو دینے کی نیت سے علیحدہ کرنے لگی کہ ایک موٹی سی فائل اچانک زمین پر آ گری۔ فائل میں سے کچھ تصویریں ادھر ادھر گر کر بکھر گئیں۔ یہ تصاویر چھوٹے چھوٹے معصوم برہنہ بچے اور بچیوں کی تھیں۔

جابر کی بیوی یک دم ٹھٹھک کر بیٹھ گئی۔

اس کی آواز گلے میں دھنس گئی۔

"یہ

یہ

یہ یہ سب کون ہیں؟"

اچانک اسے ان میں سے ایک بچی کہیں دیکھی دیکھی لگی۔

"یہ یہ یہ

یہ۔۔۔

یہ تو قسمت ہے۔۔۔۔

مجو کی بیٹی قسمت!!!"

اچانک ایک اور تصویر پر اس کی نظر رکی۔

ایک برہنہ شخص۔۔۔

بالوں سے بھرے جسم کی پشت ایک تصویر پر نظر آ رہی تھی۔ اس کی نظر اس نشان پر رک گئی، اس برہنہ شخص کی کمر پر ہو بہو وہی نشان تھا جو جابر کے تھا۔

ایک زوردار چیخ نے سارے فلیٹس کو کچھ دیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

جھوٹ اور سچ کی ملاقات

سچ بہت دن سے جھوٹ سے ملنے کا خواہاں تھا۔ ہر بار جھوٹ کو خط اور پیغام بھیجتا کہ وقت نکال کر اس سے ملے مگر جھوٹ ہر بار ٹال مٹول سے کام لیتا اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ہمیشہ ملنے سے معذرت کر لیتا۔

ایک روز سچ نے جھوٹ کو پھر پیغام بھیجا اور امید کے ہاتھ بجھوایا۔ لکھا کہ اس بار اگر جھوٹ اس سے نہ ملا تو وہ جھوٹ کا بھانڈہ ایسا پھوڑے گا کہ جھوٹ پھر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔

جھوٹ اس پیغام کو دیکھ کر خوب ہنسا اور سچ کو جواب لکھا کہ میں جھوٹ تمھاری کسی دھمکی سے ڈرنے والا نہیں۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنے آئے اور کتنے گئے، کئی ایک نے کتنی ہی بار میرا بھانڈا پھوڑا مگر میں آج بھی پہلے سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ لیکن پھر بھی میں تم سے ضرور ملوں گا تا کہ تمھارے گلے شکوے دور کر سکوں۔ بتاؤ، کہاں، کب اور کتنے بجے آؤں؟

سچ کو جب امید نے جھوٹ کا خط لا کر دیا تو سچ مسکرایا اور امید کی طرف دیکھ کر بولا:

"ایک اور جھوٹ! میں جانتا ہوں جھوٹ کبھی میرا سامنا نہیں کرے گا۔ وہ ایک لمحہ بھی میرے سامنے اپنی اصل شکل کے ساتھ نہیں آئے گا۔ وہ ضرور کسی اور کو بھیج دے گا۔ خیر حجت تمام کرنے کے لیے ایسا کرو امید، لکھو کہ کل ٹھیک پونے ایک بجے سکھ چین کی

گھڑی کے پاس آرام کے دروازے کے پاس سکون کے مکان میں آجائے۔"

امید سچ کا خط لے کر جھوٹ کے پاس پہنچی۔ جھوٹ اس وقت لالچ اور حسد کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔

امید کو دیکھ کر لالچ اور حسد کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

امید نے سچ کا خط جھوٹ کو تھما دیا۔

جھوٹ خط پڑھ کر ہنسنے لگا اور امید کو واپس جانے کا کہا۔

جھوٹ نے لالچ کو راضی کیا کہ وہ اس کی جگہ سچ سے ملے اور جانے کہ سچ کیوں اس سے ملنے کے لیے اس قدر بے تاب ہے۔

لالچ نے جھوٹ کے ریاکاری کے خاص کپڑے زیب تن کیے اور اگلے دن ٹھیک اس جگہ پہنچا جہاں سچ نے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

لالچ نے بالکل جھوٹ کے انداز میں بولتے ہوئے سچ سے پوچھا کہ مجھ سے ملنے کا کیا سبب ہے؟

اور بولا:

"سچ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے؟ کچھ مالی مدد چاہیے تو میں حاضر ہوں!"

سچ نے لالچ پر ایک نظر ڈالتے ہی مسکرا کر کہا:

"اچھا تو یہ تم ہو، لالچ! تم کیا مجھے احمق سمجھتے ہو کہ میں یقین کرلوں گا کہ تم جھوٹ ہو۔ میں جھوٹ کو سات پردوں میں سے بھی پہچان سکتا ہوں۔ کیا تم بھول گئے، میرا نام سچ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم جھوٹ، کینہ، حسد اور طمع وغیرہ کی ساری ٹیم، سب ایک ہی کھیت کی مولیاں ہو۔

البتہ میری خواہش تھی کہ جھوٹ سے ملاقات ہوتی اور میں جانتا کہ آخر جھوٹ کب تک مجھ سے بھاگتا رہے گا۔ جاؤ، جھوٹ کو کہو کہ ہمت ہے تو میرے مقابل آئے۔"

لالچ نے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت جانی۔ جونہی وہ جھوٹ کے پاس پہنچا، اس کا

سانس پھولا ہوا تھا۔ بولا:

"جھوٹ، تم نے تو مجھے مروا ہی دیا تھا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ کر آیا ہوں۔ سب مجھ پر ہنس رہے تھے۔ امید، ایثار، قربانی، ہمدردی اور محبت مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔"

"اچھا، تو یہ بات ہے۔"

جھوٹ نے غصہ جو ابھی تازہ ہی کہیں سے وہاں پہنچا تھا، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"میں بھی قسم کھاتا ہوں، اگر سچ کے منہ سے جھوٹ نہ نکلوایا تو میرا نام بھی جھوٹ نہیں۔"

جھوٹ نے سب احباب کو قریب بلایا۔ ہوس، لالچ، کینہ، غصہ، قیاس، وہم، بے صبری، بے شرمی اور ظلم سب اس کے بالکل پاس آ گئے۔ سب نے ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے اور دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ سب نے عہد لیا کہ سچ کو ناکوں چنے چبوائے بغیر چین سے نہ بیٹھیں گے۔

اگلے دن سب نے اپنے منصوبے کے حساب سے کام شروع کر دیا۔

ایک ایسے مظلوم شخص کو انھوں نے چنا جو حالات کا مارہ ہوا تھا۔ اس بے چارے کو ایسی الجھنوں میں ڈالا کہ وہ غریب ان کے جال میں پھنس گیا اور انجانے میں ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھا جو اس کی طبیعت سے بالکل الٹ تھا۔ وہ خود بھی بہت زیادہ پشیمان تھا کہ اس نے بدحواسی میں یہ کیا کر ڈالا کہ اس کی زندگی مزید تباہ ہو گئی۔

سچ جو اس بے چارے کی پوری حالت کو اچھی طرح جانتا تھا اور سمجھ سکتا تھا کہ اس شریف، سادہ لوح انسان کو منصوبے سے ایک جال میں پھنسا کر یہ جرم سرزد کروا دیا گیا جبکہ حقیقت میں یہ شخص کبھی ہوش و حواس میں یہ جرم کبھی نہ کر پاتا۔

سچ نے انصاف، عدل اور ہمدردی کے کہنے پر اس شخص کے سچ کو جان بوجھ کر آشکار

نہ کیا اور اسے تختۂ دار سے بچالیا۔

محبت، قربانی، ایثار اور دُور رسی بھی سچ کے اس مشکل فیصلہ میں اس کے ساتھ تھے۔

جھوٹ اور اس کے ساتھی اسی موقعے کے انتظار میں تھے۔ فوراً سب باہر نکلے اور سچ پر سب کے سامنے تھو تھو کرنے لگے اور یک زبان ہو کر بولے:

"سچ! تجھے مبارک ہو، جھوٹ کیمپ میں آج سے تیری شمولیت بھی ہو گئی۔ ہاہاہاہا!"

انصاف نے ایک بھاری ہتھوڑا جھوٹ پر برسایا اور بھاری آواز میں بولا:

"خبر دار جھوٹ! اگر ایک لفظ بھی سچ کے خلاف تو نے اور بولا۔ تیری یہ اوقات کہاں کہ تو سچ کے اصل معنی سمجھ سکے۔ تجھے نہ محبت سے واسطہ نہ حق و سچائی سے، نہ ایثار و قربانی سے نہ جذبۂ ہمدردی سے تیرا کوئی علاقہ ہے۔ جا دور ہو جا اس بستی سے جہاں تجھ جیسوں کا کوئی نام لیوا نہیں۔"

جھوٹ اور اس کے ساتھی گردن جھکائے بے شرمی کی سواری پر بیٹھ کر وہاں سے کھسک لیے۔

غم اور خوشی!

زمانوں سے غم اور خوشی کی گہری دوستی تھی۔ دونوں یک جان دو قالب دوستوں کی طرح تھے۔ دونوں ایک ہی علاقے میں ساتھ ساتھ مگر ذرا سے فاصلے سے رہا کرتے تھے۔

ایک روز دونوں زندگی نامی انمول خزانے کی تلاش میں ایک ساتھ سفر پر نکلے۔ ان دونوں کی منزل دور تھی۔ غم نے سفر کے لیے درد نامی اونٹ کی سواری کا انتخاب کیا اور خوشی نے جھوم نام کی اونٹنی کی سواری کو چنا۔ دونوں دوست زندگی کے خزانے کی تلاش میں گھروں سے نکلے تھے اور نکلتے ہوئے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ دونوں دوست ہمیشہ ساتھ ساتھ سفر کریں گے مگر ذرا فاصلہ رکھ کر کہ کہیں زیادہ ساتھ ساتھ چلنے سے دونوں کی سواریوں اور ان پر لدے سامان کو نقصان نہ پہنچے۔

غم نے اپنے ساتھ زاد راہ کے طور پر بہت سا اندوہ، ڈھیر سا کرب، کچھ آہیں، کچھ تکالیف اور تھوڑی سی پریشانی رکھی تھی۔ یہی چیزیں غم کی خوراک تھیں اور خوشی بھی اپنے ساتھ غذا کا مناسب ذخیرہ لادے چل رہی تھی۔ خوشی نے جو بہت سا سامان اپنے اوپر لاد رکھا تھا، اس میں تھوڑی ہنسی، بہت سے قہقہے، تھوڑی سی شادمانی اور مسرت اور کچھ مسکراہٹ کی خوراک تھی۔

دونوں دوستوں کا سامان اتنا زیادہ تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی خوشی کی اونٹنی قہقہے

کے بوجھ کی وجہ سے غم کی سواری کی طرف جھک جاتی اور کبھی غم پر لدا بہت سا کرب اور جنون خوشی کی اونٹنی کی طرف پھسل جاتا۔ اس مڈبھیر اور دھکم پیل میں دونوں سواریاں نہ چاہتے ہوئے بھی آپس میں ٹکرا جاتیں۔ اس ٹکراؤ میں کبھی غم کی درد کی سواری پر لدا کچھ سامان خوشی کی سواری پر جا گرتا اور کبھی غم کا سامان خوشی پر گر جاتا۔ جب بھی دونوں اونٹ ٹکراتے، بہت دیر تک غم اور خوشی ہچکولے کھاتے رہتے۔

دونوں ہمیشہ اس حادثے کے بعد ایک دوسرے سے ایک ہی بات کہتے:

"دیکھا دوست، بولا تھا نا۔۔۔ ساتھ ساتھ چلنا ہے مگر ٹکرانا نہیں۔"

دونوں زندگی کے خزانے کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ایک روز راستے میں ان کی ملاقات عقل و دانش سے ہو گئی۔ وہ پیدل ہی بغیر کسی زادِ راہ کے اپنی دھن میں کہیں چلے جا رہی تھی۔

غم اور خوشی نے دانش سے پوچھا:

"دانش، تم بغیر کسی زادِ راہ اور سامان کے کہاں اکیلے جا رہی ہو؟"

دانش بولی:

"میرا سارا سامان میرے سر پر لدا ہے، کیا تمھیں دکھائی نہیں دیا؟"

خوشی بولی:

"ہاں، جو کچھ بھی ہے مگر ہمیں نظر نہیں آ رہا۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ ہم دونوں دوستوں کی سواریاں بار بار ٹکرا جاتی ہیں۔ اس کا کوئی حل ہے تمھارے پاس؟"

دانش بولی:

"حل تو ہے مگر تم دونوں شاید مانو نہیں۔"

"نہیں نہیں، کیوں نہیں مانیں گے۔"

غم نے غمگین لہجے میں کہا۔

دانش بولی:

"اچھا تو ایسا کرو غم، تم سب سے پہلے اس درد کی سواری سے اتر جاؤ اور اونٹ پر لدا آدھا اندوہ اور آدھی تکلیف دریابرد کر دو۔ کچھ تکلیف خوشی کو تحفہ میں دے دو، تھوڑا درد تھوڑی تکلیف بھی باندھ کے مختلف پوٹلیوں میں مختلف مقامات پر رکھ چھوڑو، شاید کسی خوش حال بھوکے مسافر کی بھوک مٹانے کے کام آ جائے۔ اور خود صبح، دوپہر، شام آہوں کے ساتھ ہنسی ملا کر کھاؤ۔ تم دیکھو گی اس کے بعد سفر اچھے سے کٹے گا۔

"اور تم خوشی، اپنے آدھے قہقہے عطیہ کر دو، کچھ دریابرد کر دو، تھوڑے غم کو باندھ کے دے دو، شادمانی میں سے آدھی عطیہ کر دو، ہنسی میں سے کچھ پھینک دو، کچھ راہ چلتے لوگوں کے لیے باندھ کر مختلف مقامات پر رکھ چھوڑو، شاید کسی غمگین مسافر کے کام آ جائے۔ اور صرف مسکراہٹ صبح، دوپہر، شام اندوہ کے ساتھ ملا کر تناول کرو۔ اور ہاں، ہر کھانے کے بعد تھوڑا سا درد اور تھوڑی سی تکلیف سوغات سمجھ کر کھاؤ۔ پھر دیکھو، تمھارا سفر بھی اچھا کٹے گا اور تم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ ٹکراؤ گے بھی نہیں اور بغیر ہچکولوں کے بہت جلد زندگی کے خزانے کو پالو گے۔"

خوشی اور غم کو دانش کی باتیں بہت معقول لگیں۔ دونوں اپنی اپنی سواریوں سے اترے اور جیسے جیسے دانش نے انھیں سمجھایا تھا، ٹھیک ویسے ہی کیا۔

دونوں پیدل چل پڑے۔ دانش بھی ان کے ساتھ خراماں خراماں درمیان میں چلنے لگی۔ خوشی اور غم کو ایک نیا دوست مل گیا تھا جس کے ساتھ وہ بہت جلد ہی زندگی کے خزانے تک پہنچ گئے۔

بری، اچھی، گھناؤنی، عجیب، بھیانک اور ہولناک عادتیں!

کچھ عادتیں بڑی عجیب و غریب ہوتی ہیں، جیسے میرے ایک دوست کو عادت تھی کہ جب بھی وہ کار کو پیچھے کر رہا ہوتا تو گاڑی کی نشست سے پیچھے کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی پوری زبان ایک گال میں نیزے کی طرح گھسا لیتا تھا۔ اس دوران اس کی شکل مکمل تبدیل ہو جاتی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی مہذب شخص ہے جو کچھ دیر پہلے بالکل معمول کی حالت میں تھا۔ جونہی گاڑی مکمل پیچھے ہو جاتی، وہ اپنی زبان کو دوبارہ اپنے منہ میں ٹھیک اس جگہ پارک کر دیتا، جہاں وہ پہلے تھی۔

اسی طرح ایک اور جاننے والے عزیز کی بری عادت تھی کہ وہ جب بھی قیلولہ کرتے یا فارغ دکھائی دیتے، ان کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر شلوار یا پتلون میں گھس جاتا اور وہ اردگرد سے بے خبر اپنے فوطوں کو مسلتے رہتے تاوقتیکہ ان کی بریک ختم ہو جاتی۔ حیرت انگیز طور پر وہ اس پریکٹس کے دوران مطالعہ بھی کرتے اور بسا اوقات فون پر گفتگو بھی۔ اور کچھ ہی دیر میں بالکل نارمل انسان بن جاتے۔

ایک قریبی رشتے دار جو بظاہر بالکل مہذب انسان تھے، ان کو بے تحاشا کھانے کی لت تھی۔ کھانا سامنے آتے ہی ان کی آنکھوں کی پتلی پھیل جاتی تھی، چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا، چاہے کھانا ان سے ختم ہو یا نہ ہو، وہ اپنی پلیٹ پوری طرح بھر کر اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

دوران طعام کوئی انھیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس دوران وہ نہ کسی سے بات کرتے تھے نہ کسی اور طرف دیکھتے تھے۔

ایک اور عزیز جن کو کھانے کے فوری بعد ٹوتھ پک چبانے کی لت تھی، وہ ٹوتھ پک کے بغیر بن پانی کی مچھلی کی طرح برتاؤ کرتے۔ قریب کوئی بھی چیز جسے نوک دار بنایا جا سکتا، چاہے وہ کرنسی نوٹ ہی کیوں نہ ہو، اسے دانتوں میں دبا کر چبانا شروع کر دیتے تھے۔

ایسے ہی ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے دوست کو نہ صرف سگریٹ پھونکنے کی لت تھی بلکہ مقابل لوگوں کے منہ پر دھواں چھوڑنے کی بری عادت بھی تھی۔ وہ بالکل بے خبر ہوتا تھا کہ اس کی اس عادت کی وجہ سے مقابل سخت کوفت کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ کھلے عام اس پریکٹس کو جاری رکھتا تھا۔

ایک صرف حلیے سے دیندار دوست تھے، جنھیں مشت زنی کی لت تھی اور جس کا وہ قریبی دوستوں میں کھلے عام اظہار بھی کرتے۔ وہ جہاں اکیلے ہوتے، اپنے شوق کی تسکین کے لیے کوئی موقع نہ گنواتے۔ جب انھیں اس لت سے چھٹکارے کے طریقے بتائے جاتے تو وہ وقت کا زیاں کہہ کر بات ٹال جاتے۔

ایک اور بظاہر شائستہ طبیعت کے صاحب تھے جنھیں اندر کھاتے غصے کی بری لت تھی، جو ہر گزرتے دن بیماری میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ ان حضرت کو اگر کبھی غصہ آتا تو ان کی مکمل ہیئت تبدیل ہو جاتی۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگتی، مقابل کو گالم گلوچ کے پے در پے نشتر سے منٹوں میں پچھاڑنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے۔ غصہ اترتے ہی بالکل معقول و شائستہ انسان کا لبادہ اوڑھ لیتے۔ دیکھنے سننے والے تمام انسانوں کو اپنا دیکھا سنا ایک خواب محسوس ہونے لگتا۔

ایک اور لمبی داڑھی والے حاجی صاحب جنھیں معصوم بچوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی بھیانک لت تھی، ان کا شیوہ تھا جہاں کوئی معصوم بچہ اکیلا نظر آتا، اس کے چہرے کا بوسہ ضرور لیتے اور چھیڑ خانی الگ کرتے۔ حتیٰ کہ اگر بچے اپنے والدین کے ساتھ بھی ہوتے تو بھی

وہ باز نہ آتے۔ پاس کھڑے والدین بھی نیک انسان ہونے کے ناطے ان کے احترام میں سب دیکھتے رہتے۔ بچوں کو جھولی میں بٹھانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

ایک عزیزہ خاتون جنھیں جھوٹ بولنے کی بری لت تھی، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بولنے سے باز نہ آتیں۔ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، ان کا وطیرہ تھا کہ جھوٹ ضرور بولنا ہے، چاہے اس کی صفائی میں کتنے ہی اور جھوٹ کیوں نہ بولنے پڑیں۔

ایک محلے دار تھے جو شاید گھریلو ناچاقیوں سے تنگ آ کر نشے کی بری لت کا شکار ہو چکے تھے، دن بھر اہل محلہ سے پیسوں کا تقاضا کرتے تھے اور ان سے ہیروئین کی پڑیاں خریدتے اور ان کا نشہ کر کے گلی محلے کی نکڑوں پر بے سدھ پڑے دکھائی دیتے۔

ایک اور جاننے والے سیٹھ صاحب کو طوائفوں کی صحبت کی لت تھی۔ وہ بلا ناغہ ہر چھٹی پر کوٹھوں پر حاضری دینا ضروری سمجھتے تھے۔

ایک اور دکاندار تھے جن کا اچھا خاصا چلتا دھندہ تھا مگر برے دوستوں کے طفیل جوئے کی لت کا شکار ہو گئے۔ جو کماتے جوئے میں لگا دیتے۔ دکان بکی، مکان بکا اور آخر میں کوڑی کوڑی کے محتاج ہو کر عمرے کے کاروان کا کاروبار شروع کیا۔ مگر لت آج بھی جوں کی توں ہے۔

ایک اور نیم جان زندگی سے بیزار دوست تھے جنھیں شراب کی لت لگ چکی تھی۔ گھر میں چائے کے لیے پتی لانا بھول جاتے تھے مگر شراب کی بوتل لانا نہیں بھولتے تھے۔

ایک حضرت کو بات چیت کے دوران دونوں بھنویں بار بار اوپر کرنے کی عادت تھی۔ جو عزیز رشتے دار انھیں جانتے تھے، وہ تو ان کی بیماری سے آگاہ تھے مگر نئے لوگ ان کی بار بار دونوں بھنوؤں کے اچانک اوپر اٹھنے پر مضطرب ہو جاتے تھے۔

ایک اور عزیز جنھیں گفتگو کے دوران گردن میں جھٹکا لگتا تھا، جس سے گردن اور ایک گال باہر کی جانب کھنچتا تھا، ان کی یہ عادت کب اور کیسے پختہ ہوئی، ان سمیت کوئی نہیں جانتا۔

ایک اور جاننے والے تھے جو دوران بات چیت موسلا دھار تھوک کی بارش کرتے

تھے۔ وہ قطعاً بے خبر رہتے تھے کہ مقابل کے چہرے پر جو پانی نظر آ رہا ہے، وہ اس کا پسینہ نہیں بلکہ جناب کا لعابِ دہن ہے۔ ہنستے وقت تھوک کی برسات اور زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس لیے زیادہ تر لوگ ان کے سامنے ایسی کسی بھی بات سے کتراتے تھے جس سے ان کی ہنسی نکلنے کا ذرہ بھر بھی امکان نکل سکتا۔

ایک بھاری بھر کم مولوی صاحب کو کم از کم ہر دس منٹ بعد با آواز بلند ریح خارج کرنے کی بری لت تھی۔ جماعت چاہے آخری رکعت میں ہی کیوں نہ ہو، وہ باز نہ آتے اور عین آخری رکوع میں با آواز بلند ریح خارج کر ڈالتے جس سے پیچھے کھڑی جماعت کی پہلے ہنسی نکلتی، جو بعد ازاں قہقہے میں تبدیل ہو جاتی۔ ان کو ہر فرض نماز کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار دفعہ پڑھوانی پڑھتی۔ من چلے نوجوان ان کی یہ شہرت سن کر دور دور سے ان کے زیرِ امامت نماز پڑھنے آتے۔ ایک دفعہ ایک من چلے نے مؤذن کو باتوں میں لگا کر مائیک مولوی صاحب کی تشریف کے بالکل قریب فٹ کر دیا اور نماز شروع ہوتے ہی آواز اذان والے سپیکر کے ساتھ مربوط کر دی۔ اس کے بعد مسجد کے اسپیکر سے وہ آواز پورے شہر نے سنی جو تاریخ میں کسی مسجد سے نہ سنی گئی ہو گی۔ مولوی صاحب نے چونکہ نماز شروع کروا دی تھی، سپیکر فل تھا، پورا محلہ مولوی صاحب کی آواز سن رہا تھا۔ مولوی صاحب نے بہت ضبط کیا مگر چوتھی رکعت کے آخری رکوع میں اتنی زور سے دھماکہ کیا کہ مسجد کے شیشے ٹوٹ گئے۔ سپارہ پڑھنے کے لیے آئے بچوں کے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ فائر بریگیڈ مسجد کے دروازے پر پہنچ گئی، اہلِ محلہ بظاہر زخمیوں کی مدد کو پہنچ گئے مگر جب اندر پہنچے تو مولوی صاحب سجدے میں اور باجماعت مقتدی سب بے ہوش پائے گئے۔

ایک اور بظاہر معتبر انکل جنھیں غیبت کرنے کی بری عادت تھی، جب انھیں موقع ملتا وہ غیر موجود شخص کی چغلی کرنا شروع کر دیتے۔ ان کی یہ عادت اس قدر پختہ تھی کہ وہ اکیلے میں بھی غیر موجود لوگوں کی خامیاں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے سوجایا کرتے۔

ایک اور دوست جنھیں پورا سال بلا ناغہ روزے رکھنے کی عادت پڑ چکی تھی، وہ پورا

سال روزے رکھنے کے چکر میں رہتے تھے۔ ان سے گھر والے بھی تنگ ہوتے اور ان کے عزیز واقارب بھی۔

ایک اور بڑے میاں جو اپنا پورا دن مصلے پر گزار کر ارد گرد کے لوگوں کو آخرت پر لیکچر دیتے تھے، انھیں سارا دن نوافل پڑھنے کی عادت تھی۔ وہ اپنا کھانا بھی مصلے پر تناول کیا کرتے تھے۔

ایک اور عزیز کے نو عمر بیٹے کو وڈیو گیم کی بری لت تھی۔ وہ سارا دن گیم کھیلنے میں گزارتا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے تھے مگر عادت ہر نئے دن اور پختہ ہو رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں بار بار جھپکتا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے وقت ہر لمحے ڈوڈاڈوڈوڈوڈو کی آواز آیا کرتی۔ ویڈیو گیم میں بندوق پکڑے لوگوں کو گولیوں سے بھونتا رہتا۔

ایک اور گرم گفتار صاحب جنھیں نہانے کی عادت تھی، موصوف چوبیس گھنٹے میں کم از کم پانچ چھ بار نہایا کرتے تھے۔ رات گئے بھی اگر کبھی ان کی آنکھ کھلتی، تو جب تک نہانہ لیتے، نیند قریب نہ آتی۔

ایک اور عزیز کو ہر وقت صفائی ستھرائی کی عادت تھی۔ میل ہو نہ ہو، رگڑ رگڑ کر چیزوں کو چمکاتے رہتے تھے۔ بار بار ہاتھ دھوتے، دھلی ہوئی ہر پلیٹ، چمچ اور گلاس کو بھی دوبارہ رگڑ رگڑ کر دھو کر استعمال کرتے۔ بستر کی چادر پر چھوٹا سا نشان بھی نظر آتا تو اسے فوراً بدل دیتے۔

ایک اور رشتے دار کو دن بھر چائے پیتے رہنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ تقریباً ہر وقت چائے کا ٹوٹا کپ ہاتھ میں پکڑے نظر آتے۔

ایک اور جاننے والے کو ناک میں انگلی ڈالنے کی عادت تھی۔ جہاں فراغت ملتی، موصوف ناک میں انگلی ڈال کر کبھی ناک کے بال کھینچتے اور کبھی ناک کا گند، جس کا دور دور تک کوئی نشان نہ ہوتا، زبردستی نکالنے کی تگ ودو میں رہتے۔

اسی طرح ایک اور عزیز کو کان میں انگلی ڈالنے کی عادت تھی۔ وہ ہر پانچ منٹ بعد

ایک انگلی کان میں ڈال کر گھنٹی کی طرح پورے سر کو بجانے کی کوشش کیا کرتے۔

ایک اور خاتون تھیں جنھیں باآواز بلند ڈکار نکالنے کی عادت تھی۔ جب وہ ڈکار خارج کرتیں، ارد گرد کے بچے خوشی سے ناچنے لگتے۔

ایک اور وکیل صاحب تھے جنھیں اونچا بولنے کا مرض تھا۔ بات کتنی بھی رازداری میں کہنے والی کیوں نہ ہوتی، وہ پورا والیوم کھول کر اونچی آواز میں ہی بولتے۔ جب انھیں ان کی اس بری عادت کو درست کرنے کے بارے میں بتایا جاتا تو دلیل یہ دیتے کہ اونچی آواز میں بات کرنے سے بات مقابل کے دل میں اترتی ہے۔

ایک اور خاتون جنھیں غیر مقبول فضول قسم کے ملکی اور غیر ملکی پکوان بنانے کی عجیب عادت تھی، وہ پورا سال عجیب و غریب قسم کے مصالحے، ساس، چٹنیاں خریدتیں اور نت نئی ترکیبیں استعمال کر کے اچھا خاصا کھانا برباد کر دیا کرتیں۔

اب اس عادت کا تذکرہ جو بہت سوں میں پائی جاتی ہے، وہ ہے سمارٹ فون مستقل تکنے اور سکرول کرنے کی لت۔ یہ طبقۂ کثیر اٹھتے بیٹھتے اس چوکور ڈبیا نما مشین کو گھورنے میں، سکرول کرنے میں یا بٹر بٹر دیکھنے میں مگن رہتا ہے۔

ہر وقت بولنے کی عادت بھی بہت سوں کو ہے مگر ایک دوست جسے خاموش رہنے کی عجیب عادت تھی، خاموشی اتنی کہ جس سے ارد گرد کے لوگوں کو چڑ ہو جائے۔ اس کا سلسلۂ کلام 'ہوں، ہاں، ہم' جیسے مختصر الفاظ سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔

ایک دوست جسے ہنسنے کی مزاحیہ لت تھی، موقع بے موقع ہنسنا اس کا معمول تھا۔ مرگ ہو، غمی یا وبال، اس کی بتیسی کھلی رہتی تھی۔

ایک امیر دوست کو ہر وقت پریشان رہنے کی عادت تھی۔ یاسیت اس کے چہرے حلیے ہر جگہ سے جھلکتی تھی۔

ایک اور موٹی عینک پہننے والے پڑھے لکھے صاحب تھے، ان کو ہر کام میں کیڑے نکالنے کی بری لت تھی۔ کام کتنا بھی سلیقے سے کیا گیا ہو، وہ نقص نکال ہی لیتے تھے۔

ایک اور کانگڑی نیم جان دوست تھا، اس کو ورزش کی بظاہر اچھی عادت تھی مگر انتہائی شدید ہونے کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہو چکا تھا۔ صبح شام ہر وقت ورزش کا لباس پہنے وہ کھیل کود کرتا دکھائی دیتا تھا۔ دفتر بھی جاگنگ کے کپڑے پہن کر پہنچ جاتا۔

ایک نوجوان کو موٹر سائیکل کی سواری کی لت تھی جو شوق سے شروع ہو کر وبالِ جان بن چکی تھی۔ ہر وقت وہ اس پر چڑھ کر مٹر گشت کرتے۔ کئی بار ہاتھ پیر بھی ٹوٹے مگر وہ باز نہیں آتے۔

ایک اور امیر لونڈا تھا جسے ریس کی موٹر کار دوڑانے کی لت تھی۔ ہر وقت تیز رفتار سے کار دوڑاتا۔ کبھی کسی کو ٹھوکتا کبھی خود ٹھکتا۔ ایک دن بے چارہ جان لیوا ایکسیڈنٹ میں بھری جوانی میں دنیا سے ہی کوچ کر گیا۔

ایک اور خود ساختہ پروفیسر کو فلسفہ کی لت تھی۔ دن بھر لایعنی گتھیاں سلجھانے میں مگن رہا کرتے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا کرتے۔ وقت سے پہلے کن پٹیاں سفید کیے مختلف سوچوں میں دن رات گزارا کرتے۔

ایک محبت میں ناکام دوست کو بری شاعری کی لت تھی۔ اوٹ پٹانگ چیزیں لکھ کر زبردستی لوگوں کو پڑھ کر سناتا اور تعریف کی بھیک مانگتا۔ اگر کوئی داد نہ بھی دیتا، خود ہی ترنم سے اکیلے پڑھ کر سر دُھنا کرتا۔ اس کی زبردستی شادی کروائی گئی مگر اس کے بعد شاعری تو بہتر ہو گئی لیکن حالات اور خراب ہو گئے۔

ایک بظاہر سمجھ دار حلیے کے صاحب تھے جن کو بونگیاں مارنے کی لت تھی۔ جہاں فراغت ہوتی، بونگیاں مار کر ٹائم پاس کیا کرتے۔ ہر بات میں سے بونگی کا عنصر تلاش کر لیتے۔

ایک اور دوست جن کو کتابیں پڑھنے بلکہ چاٹنے کی عادت تھی، بغیر کتاب کے بن پانی کی مچھلی بن جاتے۔ کتاب ہاتھ آتے ہی چپک کر گھنٹوں پڑھتے ہی چلے جاتے۔

ایک دُور کے عزیز کو کثرتِ مباشرت کی لت تھی۔ ہر وقت ان کا دل مجامعت کرنے کو چاہتا رہتا۔ بیوی ان سے تنگ تھی۔ جسم میں سکت ہوتی یا نہیں، لیکن ہر روز اپنی بیگم کو مجبور

کیا کرتے۔

ایک اور صاحب تھے جن کا چھالیہ پان منہ میں رکھے بغیر دن نہیں کٹتا تھا۔ سارا دن جگالی کرتے تھے اور جگہ جگہ پیک تھوکتے رہتے تھے۔

ایک دفتر کے ساتھی ہوا کرتے تھے جن کو ہچکی کی عادت تھی۔ جہاں مد مقابل کوئی معقول سوال پوچھتا، موصوف جواب کی بجائے ہچکیاں لینے لگتے۔ لہٰذا تنگ آ کر بات آئی گئی ہو جاتی۔

ایک اور ٹھرکی دوست تھے، خدا مغفرت کرے، انھیں عورتوں پر بری نظر ڈالنے کی بیماری تھی۔ ہر حلیے، ہر عمر کی عورت کے جسمانی ایکسرے کیے بغیر اپنے سامنے سے نہیں گزرنے دیتے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے، گال پچک چکے تھے مگر ان کی عادت جوں کی توں تھی۔

ایک دفتر کی ساتھی خاتون جنھیں میک اپ کی لت تھی، دن بھر اپنے منہ پر پلستر کرتیں۔ ہر گھنٹے بعد لپسٹک کا لیپ دوبارہ کیا کرتی تھیں۔ آدھی تنخواہ میک اپ کے سامان، آدھی رنگارنگ نوعیت کے انڈر گارمنٹس پر خرچ کیا کرتی تھیں۔

ایک اور دُور کے رشتے دار جنھیں پورا سال مجلسِ ماتم داری کی عجیب عادت تھی، وہ سارا سال محرم سمجھ کر گزارتے۔ ہر روز کالی قمیض سفید شلوار زیب تن کیا کرتے۔ اونچی آواز میں نوحے، دوہے، مصائب لگا کر پھوٹ پھوٹ کر اکیلے ہی روتے۔ جب انھیں کوئی یاد کرواتا کہ قبلہ، محرم تو کب کا گزر چکا ہے، تو جواباً کہتے، آنے والا تو ہے بس اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔

ایک اور عزیز جو مکہ شریف میں کرین گرنے کے واقعے میں کرین کی زد میں آ کر بہشتی ہو گئے، کو حج و عمرہ کی عادت تھی۔ ہر ماہ بعد عمرہ کی سعادت کو جاتے اور ہر سال حج ضرور کیا کرتے تھے۔

ایک پچاس کے پیٹے کے گول مٹول جاننے والے ہیں جنھیں انگوٹھا چوسنے کی عجیب بچگانہ عادت تھی۔ انھیں جب بھی موقع ملتا، اپنا انگوٹھا چوسنا شروع کر دیتے۔ سوتے وقت بھی

انگوٹھا چوسنا ان کا معمول تھا۔

ایک محلے دار کو بال بڑھانے کی عادت تھی۔ ان کی جان ان کے بالوں میں تھی۔ دن رات بالوں پر مختلف قسم کے ٹانک اور جڑی بوٹیوں کے آمیزے لگا لگا کر کبھی دھوپ سینکتے، کبھی چوبارے پر کھڑے بال سکھاتے دکھائی دیتے۔

ایک سکول کا ساتھی جس کو دانتوں سے ناخن کترنے کی عادت تھی۔

اور ایک دوسرا ساتھی طالب علم اپنے ناخنوں سے ناخنوں کے ارد گرد ماس کو چھیلتا رہتا تھا، حتیٰ کہ ناخنوں کے ارد گرد خون رسنے لگتا تھا، مگر وہ باز نہ آتا۔

کچھ لوگوں کو ہر جملے کے آخر میں مخصوص فقرہ یا کوئی خاص لفظ بولنے کی عادت ہوتی ہے۔ ایک عزیز ہر بات کے آخر میں "ہیں جی" لگا دیا کرتے تھے۔

ایک اور تن تنہا صاحب تھے جنھیں یوٹیوب پر اپنی تقریری ویڈیو اپ لوڈ کرنے کی لت تھی۔ وہ سارا سال بغیر ناغہ کیے یوٹیوب پر اپنا بھاشن دیا کرتے اور خود کو ایک ننھا منا پیغمبر سمجھا کرتے۔

ایک اور انتہائی نفیس و سادہ سا انسان بھی تھا، جسے ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے کی عادت تھی۔ وہ ہر وقت کہانیاں وغیرہ لکھنے میں مگن رہا کرتا، اس کے سر یہ خبط سوار تھا کہ اسے مختصر زندگی میں کچھ بڑا کام کرنا ہے، ایک عظیم لکھاری بننا ہے۔

(جب تک عادتوں کا سلسلہ جاری ہے، یہ بھی جاری وساری ہے!)

چھوٹا اور بڑا پنجرہ

زمانوں پہلے کسی سوداگر کے پاس ایک ہدہد تھی۔ سوداگر ہر روز ہدہد کے پنجرے کو ایک گھنٹے کے لیے اپنے کمرے کے باہر بالکونی کی دیوار پر کھونٹی پر لٹکا دیتا اور باقی وقت پنجرے پر دبیز چادر چڑھا کر ہمیشہ کمرے کے اندر رکھتا۔

جس دوران ہدہد باہر کھلی فضا میں کھونٹی پر لٹکی ہوتی، وہ باہر کی دنیا کا جی بھر کر نظارہ کرتی اور دل ہی دل میں سوچتی، ایک دن وہ بھی اس پنجرے سے باہر نکلے گی اور ہوا میں اڑتے باقی پرندوں کی طرح آزادانہ اُڑانیں بھر سکے گی۔

ایک دن جب ہدہد کو سوداگر نے ہمیشہ کی طرح باہر نکالا تو اسے قریب ہی دیوار پر بیٹھی ایک مینا نظر آئی۔ ہدہد نے مینا کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اپنی مخصوص آواز میں ایک درد بھرا نغمہ شروع کیا۔

زمانے ہوئے مجھ کو پنجرے میں قید
نکالو مجھے کر کے . پنجرے میں چھید
پنجرے کے باہر کی دنیا ہے کیا
کبھی جان پاؤں گی میں سارا بھید؟

مینا نے ہد ہد کا درد بھرا گیت سننے کے بعد اس کی مدد کا سوچا اور اس کے قریب آ کر مسکرائی اور پھر بولی:

ہد ہد اس پنجرے کے باہر بھی ایک
بڑا ایک پنجرہ ہے جس میں انیک
اڑتے ہیں پنجرے میں وہ سب پرند
ذرا غور کر میری آنکھوں میں دیکھ

ہد ہد مینا کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گئی گویا پنجرے کے باہر کی دنیا بھی در اصل ایک پنجرہ ہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑا پنجرہ ہے جس میں کچھ اوپر اڑا جا سکتا ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ ہر پنجرے کی طرح اس بڑے پنجرے کے بھی حدود و قیود ہیں۔ دیواریں ہیں، چھت ہے اور دروازہ بھی۔

مینا ہد ہد کو بھید کی بات بتا کر بڑے پنجرے میں پھر سے اڑ گئی۔

ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ سوداگر نے ہد ہد کا پنجرہ اٹھایا اور اندر لے جا کر اس پر ہمیشہ کی طرح پھر ایک چادر اوڑھا دی۔

اجو بوا

اجو بوا کا پورا نام عزیز النسا تھا مگر سارا محلہ انھیں اجو بوا کے نام سے ہی جانتا تھا۔ وہ اور ان کے خاوند بڑے میاں کہاں سے اس محلے میں آکر آباد ہوئے تھے، محلے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ دونوں کا سن شاید پچاس پچپن کے قریب ہوگا، بے اولاد تھے۔

بڑے میاں کو جلد ہی گلی کے اسکول میں چپڑاسی کی نوکری مل گئی اور وہ قریبی مسجد میں مؤذن بھی بن گئے۔ اجو بوا اور بڑے میاں کو اسکول کا ایک کمرہ رہنے کے لیے بھی دے دیا گیا۔

اسکول کی آدھی چھٹی میں اجو بوا بڑا سا گھونگھٹ نکالے چھوٹا سا سٹال لگائے بچوں کو ٹافیاں اور ٹیڈی بسکٹ بیچا کرتیں۔

میں، آفتاب اور عاطف جو چوتھی میں میرے ہم جماعت تھے، ہم تینوں اجو بوا سے ٹافیاں اور ٹیڈی بسکٹ خریدتے ہوئے خوب بھاؤ تاؤ کیا کرتے اور ان کا دھیان بٹا کر ایک دو ٹیڈی بسکٹ کھا بھی جایا کرتے۔ اجو بوا ہم تینوں کی مستیوں کی شکایت کبھی بڑے میاں کو لگاتیں اور کبھی کبھار غصے میں میرے گھر اماں جان کو بھی اپنے مخصوص انداز میں شکایت لگانے پہنچ جاتیں:

"اری بہن، ذرا خاور میاں کو سمجھائیے، ہم سے فضول کی مستی نہ کیا کریں نہیں تو

بتائے دے رہے ہیں، ہاں!"

اجو بوا کے جاتے ہی اماں جان سے ہمیں خوب ڈانٹ پڑتی۔ اماں سمجھاتیں، "بیٹا اجو بوا اکیلی ہیں، نہ ان کی کوئی اولاد ہے نہ کوئی رشتے دار۔ انھیں تنگ مت کیا کرو۔"

اور پھر جمعرات کو چار بجے کبھی فیرنی، کبھی زردہ اور کبھی پلاؤ کٹوری میں ڈال کر میرے ہاتھ اجو بوا کے یاں بھجوا دیتیں تاکہ ان کا غصہ اتر جائے۔

اور ہوتا بھی یہی، جونہی میں انھیں کٹوری تھماتا، اجو بوا میرے لیے اونچی آواز میں دعائیں دینا شروع کر دیتیں۔

ہم سب پڑھ لکھ کر جوان ہوگئے، حصولِ معاش کے لیے پردیس چلے گئے۔ سال دو سال بعد کبھی گھر کا چکر لگتا تو اجو بوا سے بھی ملاقات ہو جاتی۔

وہ بالکل ویسی کی ویسی ہی تھیں، اپنی گلی سے باہر کی دنیا سے انھیں کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ اس دوران ایک دن گھر فون پر بات ہو رہی تھی تو پتا چلا اجو بوا کے خاوند بڑے میاں کا انتقال ہو گیا اور اجو بوا بالکل اکیلی رہ گئیں۔

اماں جان بھی بہت دکھی تھیں۔ بے چاری اجو بوا اس عمر میں کہاں جاتیں۔ میں نے اماں کو مشورہ دیا، کیوں نا اجو بوا کو اپنے گھر میں جگہ دے دی جائے؟ اسکول والے بھی شاید انھیں کمرہ خالی کرنے کا بولنے والے تھے۔ اماں جان کو میرا مشورہ پسند آیا اور وہ اجو بوا کو کسی طرح قائل کر کے ہمارے گھر لے آئیں۔

اس بار جب میں چھٹی پر گھر گیا تو اجو بوا گھر پر ہی تھیں۔ بڑا سا گھونگھٹ جوں کا توں تھا، مجھے دیکھتے ہی بڑے میاں کو یاد کر کے رونے لگیں:

"ہائے خاور میاں ہم دنیا میں اکیلے رہ گئے۔۔۔

اب اس دنیا میں ہمارا کوئی نہیں بچا۔۔۔"

میں نے حوصلہ دیا اور کہا:

"اجو بوا ہم سب ہیں نا۔۔۔ ہم رکھیں گے نا آپ کا خیال! آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟

اماں جان ہیں، رضیہ ہے۔ ہمارے ابا جان بھی تو بہت جلد دنیا چھوڑ کر چلے گئے تھے نا۔ یہی دنیا ہے، صبر کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں اجو بُوا؟"

"ہاں خاور میاں سچ کہتے ہو۔ صبر کر کے ہی سانس چل رہی ہے۔"

اجو بُوا نے آنسو پوچھے اور پھر چھالیہ کاٹنے میں مگن ہو گئیں۔

اس دوران میں نے پرانے دوستوں سے ملاقات کا سوچا۔ عاطف اور آفتاب بھی شہر میں آئے ہوئے تھے۔ ان سے فون پر ملنے کا وقت طے کیا۔ سب دوست اکٹھے ہوئے تو ایک کو سینما دیکھنے کا خیال سوجھا۔

میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ کیوں نا اجو بُوا کو بھی آج ساتھ لے چلیں۔ بچپن میں مفت میں ان کے ٹیڈی بسکٹ اُڑایا کرتے تھے آج ان کو بھی تھوڑی تفریح کیوں نا کرائی جائے؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا:

"خیال برا نہیں۔"

"مگر کیا اجو بُوا اس عمر میں جائیں گی بھی ہمارے ساتھ سینما دیکھنے؟"

آفتاب نے ہنستے ہوئے کہا۔

عاطف بولا:

"بھئی کچھ بھی بول کر لے جائیں گے۔"

"کچھ بھی!"

"مثلاً؟"

میں نے پوچھا۔

"بھئی یہی کہ کسی درگاہ یا امام باڑے جا رہے ہیں یا کسی کی بیٹھک میں میلاد وغیرہ ہے، ہاہاہا۔۔۔"

ہم تینوں ہنسنے لگے۔

میں نے کہا:

"نہیں نہیں، یہ غلط ہو گا۔ ہم انھیں بتادیں گے کہ تفریح کے لیے نکل رہے ہیں بس۔ مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گی۔"

"توچلو پھر چلتے ہیں۔"

سب مرے گھر کے لیے نکل پڑے۔

گھر پہنچے تو اجو بُوا ہمیشہ کی طرح گھونگھٹ نکالے چھالیہ چھیل رہی تھیں۔

ہم تینوں نے یک زبان سلام کیا۔ اجو بُوا نے جواب دیا اور عاطف اور آفتاب کی طرف کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے پھر میری طرف دیکھا اور حیرانی سے بولیں:

"ہائے ہائے خاور میاں، کون ہیں یہ جنھیں زنان خانے تک گھسائے چلے آرہے ہو؟"

میں نے کہا:

"اجو بُوا یہ عاطف میاں اور آفتاب میاں ہیں جو میرے ہم جماعت تھے۔"

"اچھا! تو یہ تم دونوں ہو۔ بہت ہاتھ پاؤں نکال لیے تم دونوں نے۔ بیٹھو، بیٹھو۔ پان کھاؤ گے؟"

اجو بُوا نے پوچھا۔

"جی نہیں اجو بُوا ہم آپ کو آج ساتھ لے جا کر کہیں سیر سپاٹے اور تفریح کروانے لے جانا چاہتے ہیں۔"

اجو بُوا نے گھونگٹ کا ایک سرا دانت میں دباتے ہوئے کہا:

"بیٹا ہم تو پچھلے تیس سال سے اس محلے سے باہر نہیں نکلے، تم ہمیں ساتھ لے جا کر کیا دکھاؤ گے؟ خدا بخشے تمھارے بڑے میاں کو، تقسیم ہند کے بعد جب ہم یہاں لٹے پٹے پہنچے تو کئی سال تو کمرے سے باہر نکلتے بھی ہمیں ڈر لگتا تھا۔ وہ تو بڑے میاں تھے جو ہمارا ڈر اتارنے کے لیے ایک دن کسی طرح ہمیں پوری گلی کی سیر کروالائے اور ہمارا تھوڑا ڈر کم ہوا۔ نہ خاور میاں نہ، ہم نہ جائیں گے کہیں اس محلے کو چھوڑ کر! خدا جانے کوئی مؤا ہماری چادر ہی کھینچ لے۔"

ہم تینوں دوست ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

عاطف نے ہمت کی اور بولا:

"اجو بوا تقسیم ہند کو چالیس سال گزر گئے، آپ ابھی تک خوف زدہ ہیں؟"

اجو بوا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے روہانسا منہ بنا کر کہا:

"تم لوگوں کے لیے چالیس سال ہوئے ہوں گے، میرے لیے تو کل ہی کی بات ہے۔

جب میں اپنے وطن سے نکلی تھی تو میری اور بڑے میاں کی شادی کو ایک ہی سال ہوا تھا، میرا چھٹا مہینہ چل رہا تھا۔ راستے میں بلوائیوں نے ریل پر دھاوا بول دیا اور ہمیں ریل سے اتر کر بھاگنا پڑا۔ اس دوران ہم کچھ دیر کے لیے بچھڑ گئے تھے۔ ایک کم بخت بلوائی میرا پیچھا کرنے لگا۔ اس نے مجھے دبوچ لیا اور میرا ہار گلے سے کھینچنا چاہا اور میری چادر جگہ جگہ سے پھاڑ دی۔ وہ ہار میری دادی کی نشانی تھی مگر میں نے بھی ہمت نہ ہاری اور اس سے مزاحمت کرتی رہی اور خوب جم کر مقابلہ کیا مگر اس نے بھاگنے سے پہلے میرے پیٹ پر اتنی زور سے لات ماری کہ میں سنبھل نہ سکی اور نیچے گر کر بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو بڑے میاں مجھ ڈھونڈ چکے تھے۔ لیکن تب تک ہمارا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، مجھے باہر نکلنے سے ڈر لگتا ہے۔ یہ گلی یہ محلہ ہی میری کل کائنات ہے۔ لیکن اب سوچتی ہوں ان دنوں کتنی ہی مجھ جیسی اور تھیں، جن کے لیے ایک کوچے سے دوسری گلی تک کا سفر مجھ سے بھی زیادہ ڈراؤنا تھا۔"

اجو بوا کی بات سن کر ہم سب بھی غم زدہ ہو گئے۔

اجو بوا کے ساتھ جو ہوا وہ واقعی دل دہلا دینے والا تھا۔ جس ٹراما اور اذیت سے وہ گزریں، اس کے بعد ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا، انھی کی طرح کسی کو اپنا چہرہ دکھانے سے ڈرتا۔ شاید اب اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا تھا کہ ہم ان کے اس خوف کو کم کریں اور انھیں اس مستقل گھٹی ہوئی زندگی اور اس پہناوے سے نجات دیں۔

ہم دوست اور بھی زیادہ ان سے ضد کرنے لگے کہ انھیں اس گلی سے باہر کی دنیا بھی

ایک بار ضرور دکھانی چاہیے۔

کسی طرح ہم نے اجو بؤا کو راضی کیا اور انھیں مختلف باغات کی سیر کروائی۔ اجو بؤا شروع میں بہت ڈری سہمی، بڑا سا گھونگھٹ نکالے ہر شے کو ڈر ڈر کر دیکھ رہی تھیں۔ دوسرے باغ میں جا کر ان کا ڈر ذرا اُترا تو وہ مختلف پھولوں اور پیڑوں کو چھو چھو کر بڑے اشتیاق سے دیکھتیں اور ہمیں بتاتیں کہ ان کے وطن میں بھی ایسے ہی پھول اور پیڑ ہوا کرتے تھے۔ وہ ایسے پیڑوں پر اپنی سکھیوں کے ساتھ جھولا جھولتی تھیں۔

اجو بؤا کا چہرہ اپنے وطن کی باتیں بتاتے ہوئے گلاب کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

اپنے ارد گرد بہت سی خواتین کو بغیر گھونگھٹ کے دیکھ کر آہستہ آہستہ ان کا خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔

سارا دن باغات کی سیر کے بعد بالآخر شام میں ہم اجو بؤا کے ساتھ سینما ہال پہنچے تو پہلے تو انھیں سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا جگہ ہے۔ بولیں:

"خاور میاں، یہ کس قسم کا امام باڑہ ہے؟ نہ کوئی ممبر ہے نہ کوئی جھروکا۔ اور اگر یہ کسی کی بیٹھک ہے تو یہ کرسیاں آمنے سامنے کی بجائے عجیب طریقے سے کیوں لگی ہیں؟ یہ کہاں لے آئے ہو تم لوگ مجھے؟"

"اجو بؤا یہ سینما ہے۔"

عاطف بولا۔

"کچھ دیر میں پردے پر پکچر دکھے گی۔"

"سینما؟ یہ کیا بلا ہے؟"

اجو بؤا نے حیرانی سے پلّو درست کرتے ہوئے کہا۔

"ارے کہیں رام لیلہ نوٹنکی دکھلانے تو نہیں لے آئے مجھ بڑھیا کو؟ وہ سب میں نے دیکھ رکھا ہے بچپن میں۔"

اجو بؤا نے کھانستے ہوئے کہا۔

"نہیں اجو بُوا نہیں، یہ سینما ہے سینما، یہاں بڑے پردے پر پکچر دکھائی جائے گی۔ کچھ دیر میں یہ کرسیاں بھر جائیں گی تو پکچر شروع ہو گی۔ ہم ذرا جلدی اندر آ گئے ہیں۔"

آفتاب نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، جو بھی ہے یہ جناو نما۔ مگر ان کم بختوں کو اتنے بڑے کمرے میں کوئی ایک کھڑکی تو بنانی چاہیے تھی۔ نہ تازہ ہوا آ رہی ہے کہیں، نہ کہیں روشن دان۔ پتا نہیں کس موے مستری سے بنوایا ہے یہ مکان۔"

تھوڑی دیر میں ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا اور ہال کی روشنی یک دم گل کر دی گئی۔

اجو بُوا نے زور سے چیخ ماری اور بولیں:

"یہ لو، بتی چلی گئی! کم بختو لالٹین ہی لے آؤ کہیں سے۔ ایک کمرے میں لاری کی طرح اتنے سارے لوگ پھنسا کے بٹھا دیے۔"

ارد گرد کے لوگ گردن اٹھا اٹھا کر دائیں بائیں دیکھنے لگے کہ یہ کون بول رہا ہے۔

میں نے اجو بُوا سے ہولے سے کہا:

"اجو بُوا آہستہ بولیں، آہستہ! یہاں خاموشی سے اندھیرے میں پکچر دیکھی جاتی ہے۔ اندھیرے میں!"

"کیا دیکھا جاتا ہے اندھیرے میں؟ ہائے ہائے غضب خدا کا، اندھیرے میں اندھیرا ہی دکھے گا اور کیا۔ یہ کہاں ٹامک ٹویاں مارنے لے آئے ہو تم لوگ مجھ بڑھیا کو۔"

اجو بُوا نے چبا کر کہا۔

میں نے اجو بُوا کے کان کے پاس جا کر پھر کہا:

"خدا کے لیے کچھ دیر خاموش ہو جائیے اور سامنے پردے کی طرف دیکھیں، وہاں ابھی کچھ چلایا جائے گا۔"

"پردے پر کچھ چلے گا۔ پردے میں نے بہت سی رکھے ہیں بیٹا، مجھے سب علم ہے مگر پردے پر کچھ چلایا بھی جا سکتا ہے یہ میرے علم میں نہیں۔"

اتنے میں اچانک تیز روشنی پردے پر پڑی اور کان پھاڑنے جیسی اونچی آواز میں ایک اشتہار چل پڑا۔ اسے دیکھ کر اجو بُوا ایک دم گھبرا کر سیٹ پر اچھل پڑیں اور خوف سے سیٹ پر دونوں پاؤں رکھ کر اکڑوں بیٹھ گئیں۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر سامنے پردے کو پہلی دفعہ دیکھنے لگیں۔ ہم نے شکر کیا کہ چلو سینما نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول تو کرائی۔

مگر ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ اجو بُوا اونچی آواز میں پھر بولیں:

"کم بختو ٹی وی کی آواز ہی آہستہ کر دو، مغرب کا وقت ہو چلا ہے۔"

آگے اور پیچھے کی سیٹوں کے لوگوں کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ دونوں لائنیں ایک ایک کر کے خالی ہو گئیں۔

اتنے میں سینما کی انتظامیہ کے دو لوگ اندر داخل ہوئے اور میرے قریب آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتے، اجو بُوا جھٹ سے ایک سے مخاطب ہوئیں:

"بیٹا چیک کرنا فیوز اڑا ہے یا سارے علاقے کی بتی گئی ہے مگر ٹی وی چل رہا ہے تو اللہ ماری اوپر کی بتیاں بھی جلا دو۔"

انتظامیہ کے بندے نے دونوں آنکھیں باہر نکال کر کہا:

"آپ لوگ یا تو باہر چلے جائیں یا خاموشی سے پکچر دیکھیں۔"

"ہائیں ہائیں، کیوں جاویں ہم باہر؟ ہیں! کیا مفت میں بیٹھے ہیں یہاں؟؟ ارے کون ہیں یہ کل موہے؟؟ ایک تو پیسے لے کر بغیر بتی کے بٹھار کھا ہے اوپر سے نا کھٹر کی ہے نا پنکھا۔ پھر کانوں کے پردے پھاڑنے کا شور دھن، ڈھن، چھن، ٹھا، ٹھا چلا رکھا ہے۔ کم بختو اتنی دیر سے کہہ رہی ہوں مغرب کا وقت ہے، ہڑ ہڑ بند کر دو، بند کر دو مگر حرام ہے جو کسی کے ماتھے پر جوں بھی رینگی ہو۔"

اجو بُوا لگا تار غصے میں بول رہی تھیں۔

پورے سینمے میں بیٹھے لوگ سکرین کو چھوڑ کر اجو بُوا کی گفتگو ہنس ہنس کر سن رہے تھے۔ اتنے میں کسی من چلے نے تالیاں بجادیں۔ سارا ہال ہی دیکھا دیکھی تالیاں بجانے لگا۔

پورے ہال میں کوئی ایک بھی گردن سینما سکرین کی طرف نہیں تھی۔

ہال کی انتظامیہ نے تنگ آ کر فلم روک دی اور روشنی مکمل بحال کر دی۔

ہال میں بیٹھے تمام افراد اجو بُوا سے ان کے ماضی کے قصے سننے میں مگن ہو گئے۔

یہ نشست دو گھنٹے تک جاری رہی۔

واپسی پر اجو بُوا بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم نے غور کیا کہ پہلی بار ان کا گھونگھٹ سرک کر بہت پیچھے جا چکا تھا اور وہ بہت پر اعتمادی، سکون اور وقار سے ہمارے ساتھ چل رہی تھیں۔

میں نے دل میں سوچا، ان کی ماضی کی بھیانک یادداشت کو کھرچنے کے لیے ایسی تفریح شاید بہت ضروری تھی۔

اجو بُوا اتنی خوش تھیں کہ بولیں:

"اگلے ہفتے کتنے بجے نکلنا ہے خاور میاں، بیٹھک کے لیے؟"

ہم سب مل کر ہنسنے لگے۔

دو معبد!

دونوں لڑاکا قبایل آج جرگے میں آمنے سامنے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر اپنے معبد کی توہین کا الزام لگا رہے تھے۔

سوریا قبیلے کے سردار سسو نے پنچوں سے کہا:

"یہ پہلا واقعہ نہیں جب ہمارے معبد کی توہین کی گئی ہو۔ دو ماہ پہلے بھی آگیہ قبیلے کے کچھ شر پسندوں نے رات کے اندھیرے میں ہماری خانقاہ کی باہری دیوار پر لید سے سورج دیوتا کی شبیہ بنا کر معبد کی توہین کی تھی۔"

آگیہ قبیلے کے ایک بوڑھے کاہن نے غصے سے درمیان میں لقمہ دیا:

"اور جو ہمارے معبد کی توہین سوریا قبیلے کے نوجوان لونڈے عرصۂ دراز سے کھلے عام کرتے آئے ہیں، اس کے بارے میں تم کیا کہو گے سردار سسو؟"

"ابھی دس دن پہلے کسی نے وہ پوترا گنی جس کی ہم معبد میں صدیوں سے پوجا کرتے آ رہے ہیں اور کبھی بجھنے نہیں دیتے، اسے سوریا قبیلے کے شیطان صفت نشے میں دھت لڑکے نے پیشاب سے بجھانے کی گھٹیا کوشش کی۔ وہ تو اچھا ہوا، اس وقت میں اپنے تیغ کے چلے کے لیے اٹھا ہوا تھا اور میں نے اسے رنگے ہاتھوں دبوچ لیا۔ غضب ہو جاتا، اگر وہ آگ بجھ جاتی تو نہ آج یہ جہان ہوتا نہ ہی ہم سب زندہ ہوتے۔"

سوریا قبیلے کے لوگ آگیہ قبیلے کے بوڑھے کی بات سن کر زور زور سے ہنسنے لگے جس پر آگیہ قبیلے کے جوان پیچ و تاب کھانے لگے۔

سرپنچ نے دونوں فریقین کو خاموش رہنے کا کہا اور حکم دیا کہ سب کو بات کرنے کا باری باری موقع دیا جائے گا۔

سوریا قبیلے کے سردار سسو نے دوبارہ بات شروع کی اور بولا:

"پنچو! آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ کیا سورج دیو جو پوری دھرتی کو روشنی دیتا ہے، اس کے سامنے کیا یہ معمولی آگ کوئی معنی رکھتی ہے؟ ہمارے معبد میں موجود سورج دیو کی جان جو ایک سرخ پتھر میں ہے، جس کے گرد ہم نے سات گھیرے بنا رکھے ہیں، اگر غلطی سے بھی اس پتھر کو ذرا سا بھی نقصان پہنچ جائے تو سورج اسی وقت فنا ہو جائے اور یہ دنیا ایک لمحہ میں ختم ہو جائے۔ کیا سورج دیو اور آگ جیسی حقیر شے کا بھی کوئی مقابلہ ہے؟ میں کہتا ہوں کیا طوفان آ جاتا اگر وہ آگ بجھ جاتی؟"

سردار سسو نے زور ڈال کر سرپنچ کی طرف دیکھ کر کہا۔

سرپنچ نے سردار سسو کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اب باری تھی آگیہ قبیلے کے سردار آگو کی، آگو نے اپنی بات کا آغاز کیا اور بولا:

"پنچو! آپ ہی غور سے فیصلہ کیجیے، سورج جو رات میں بجھ جاتا ہے، بارش میں چھپنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کبھی دن چڑھے نکلتا ہے، کبھی سرے سے نمودار ہی نہیں ہوتا، وہ کیا عظیم و پوتر اگنی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ایسی آگ جو جب سے دنیا بنی ہے، مسلسل ہمارے معبد میں جل رہی ہے اور صرف اس آخری دن بجھے گی جس دن دنیا کا انت ہو گا اور ہر شے کا اختتام ہو گا۔ سورج بے چارہ ہمارے اگنی دیوتا کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی من چلے نے سورج کا مذاق اُڑا بھی دیا تو کیا طوفان کھڑا ہو گیا؟ سورج تو ہر دن غروب ہو کر اپنی توہین خود ہی کرتا ہے، کیا ہوا جو کسی نے لید سے سورج کی شکل دیوار پر بنا دی؟"

اس بار آگیہ قبیلے کے لوگ سردار آگو کی بات سن کر ہنسی ٹھٹھہ کرنے لگے اور سوریا

قبیلے کے لوگ لڑنے کے لیے پر تولنے لگے۔

سر پنچ نے اونچی آواز میں پھر سب کو خاموشی کا حکم دیا۔

سر پنچ نے دونوں فریقین کو ایک دوسرے کے معبد کے احترام کا حکم دیا اور آیندہ کے لیے تنبیہ کی کہ ایک دوسرے کی خانقاہوں سے دُور رہیں۔

دونوں قبائل اپنی اپنی فتح کا جشن منانے لگے اور واپس اپنے اپنے معبدوں میں پوجا پاٹ کے لیے نکل گئے۔

کچھ دن دونوں قبائل کے درمیان امن و آشتی سے گزرے۔ ایک روز پھر واویلا اٹھا کہ سوریا قبیلے کے کسی شرارتی لڑکے نے آگیہ قبیلے کے کاہن کا مضحکہ خیز حلیہ ان کے معبد کی دیوار پر بنا دیا جس میں کاہن آگ پر بیٹھا ہے اور اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دھواں اٹھ رہا ہے۔

اس خاکے کو دیکھنے کے بعد آگیہ قبیلے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان سے بھی رہا نہ گیا اور ان میں سے ایک نے اپنا حلیہ سوریا قبیلے جیسا بنایا، سر پر سوریا کا نشان تلک لگایا اور صبح صبح ان کے معبد پہنچ گیا۔ اس وقت کاہن بالکل اکیلا تھا۔ تھوڑی دیر میں جب باقی پیروکار پہنچے، اس نے ان پر آستین میں چھپائے ہوئے خنجر سے اچانک حملہ کر دیا۔ کاہن نے اور باقی پیروکاروں نے اسے فوراً دبوچ لیا اور مجمع اکٹھا کر کے سیدھے جلوس کی صورت میں پنچوں کے پاس پہنچے۔ سارے راستے وہ مغوی کو پیٹتے رہے اور نعرے لگاتے رہے؛ نہیں چلے گی، نہیں چلے گی، سوریا معبد کی توہین نہیں چلے گی۔"

دوسری طرف آگیہ قبیلے والے بھی اپنے کاہن کا مذاق اڑانے پر سیخ پا دکھائی دیتے تھے۔ وہ سب بھی پنچایت پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی یک زبان "بند کرو، بند کرو، کاہن کی توہین بند کرو" کے واشگاف نعرے لگا رہے تھے۔

پچھلی بار کی نسبت آج دونوں فریقین سخت برہم دکھائی دے رہے تھے۔ پنچ جو دونوں مذاہب کی مفاہمت کی واحد امید تھے، خود سر جوڑے پریشان بیٹھے تھے کہ اس مسئلہ کا کیا ایسا دائمی حل نکالا جائے جس سے سوریا قبائل اور آگیہ قبائل کے مابین دیرپا امن قائم ہو سکے اور

یہ دونوں اپنے اپنے سخت گیر عقائد سے چھٹکارا پاسکیں۔

دونوں قبائل کے کاہن، دونوں قبائل کے سردار اور دونوں قبائل کے عوام کی تمام تعداد آج یہاں پہلی بار اکٹھی ہوئی تھی۔

دونوں قبائل سرپنچوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔اِس کے پیچھے ان دونوں قبائل کا یہ عقیدہ تھا کہ سرپنچ کو ناراض کرنے کا مطلب سوریا اور اگنی کو ناراض کرنے جیسا فعل ہے، جس کی سزا قحط اور طوفان کی صورت میں ملتی ہے۔

لیکن خود سرپنچ دونوں فریقین کی صلح کروا کروا کر اور دونوں قبائل کی ہٹ دھرمی سے اب تنگ آ چکا تھا۔

سرپنچ کے دماغ میں ایک ترکیب آئی جس کے تحت ان دونوں سرپھرے قبائل کے مابین امن قائم کیا جاسکتا تھا۔

سرپنچ نے اپنے ایک وفادار ساتھی کو دونوں قبائل کے معبدوں میں بھیجا اور ایک میں سے وہ مقدس پتھر غائب کرنے کا کہا اور اس کی جگہ سرخ پھولوں کا گلدستہ رکھنے کو کہا اور دوسرے میں آگ کو بجھا کر اس کی جگہ بھی ویسے ہی سرخ پھولوں کا گلدستہ رکھنے کا کہا۔

دونوں قبائل اس وقت پنج گھاٹ پر موجود تھے۔

سرپنچ نے ہمیشہ کی طرح دونوں کے دلائل سنے اور دونوں کو صبر اور برداشت کی تلقین کی۔

اس دوران سرپنچ کے معاونِ خاص اپنے دونوں کام نمٹا کر واپس پنچایت میں پہنچ گیا۔

آگ بجھنے اور سوریا پتھر کے اٹھنے پر نہ ہی کوئی زلزلہ آیا نہ طوفان۔

دونوں قبائل جب واپس اپنے معبد پہنچے تو ایک جگہ آگ کی جگہ پھول اور دوسری جگہ مقدس پتھر کی جگہ پھول دیکھ کر حیران ہو کر سجدوں میں گر گئے۔

دونوں طرف کے چالاک کاہنوں نے صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے فوراً اعلان کیا کہ یہ سب سوریا دیوتا اور اگنی کا معجزہ ہے۔

دونوں طرف کے کچھ ذہین پیروکار سوال کرنے لگے، اب تک تو ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ آگ کے بجھتے ہی دنیا ختم ہو جائے گی اور مقدس پتھر کو کچھ ہونے کا مطلب دنیا کا اختتام ہے مگر اب اچانک ان پھولوں کو نیا معبد بتایا جا رہا ہے، ضرور اس کے پیچھے کچھ گڑبڑ گوٹالا ہے۔

دونوں طرف کے کاہنوں کے پاس ایسے عقلی سوالات کا کوئی موزوں جواب نہیں تھا۔ دونوں آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ دونوں طرف کے قبائل کے سردار سسو اور سردار آگو بھی کاہنوں کے فرضی ہوائی قصوں سے بدظن ہونے لگے۔

سب کو اس حد تک یقین تھا کہ معبد میں ذرا سی تبدیلی سے بھی دنیا ختم ہو جائے گی مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

مگر اب بھی کچھ سادہ لوح قبائلی ایسے موجود تھے جنھیں کاہنوں نے نئی کہانی سنانی شروع کر دی تھی کہ آگ اور اس کا برتن آسمان میں اٹھا لیے گئے ہیں اور اسی سے ملتی جلتی کہانی سوریا کے مقدس پتھر کے لیے بھی سادہ لوح قبائلیوں کو رٹا دی گئی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ایسے لوگ بڑھنے لگے تھے جو ان فرضی قصوں پر سوالات اٹھا رہے تھے۔

مجموعی طور پر سرپنچ کی حکمت عملی کامیاب رہی تھی۔ صرف وہی مٹھی بھر لوگ جو اب بھی کاہنوں پر یقین رکھتے تھے، باقی بچے تھے۔ ان کی اصلاح کے لیے ایک دن سرپنچ نے وہ آگ کا پتیلہ اور وہ پتھر دونوں ایک گزرگاہ پر رکھوا دیے۔ اگلے دن اس مقام پر قبائلیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر کوئی حیران تھا اس کوڑے اور کاٹھ کباڑ کے مقام پر اتنے مقدس تبرکات راتوں رات کیسے پہنچ گئے۔

اس وقت دونوں طرف کے کاہنوں کی ہزیمت دیدنی تھی۔

دونوں طرف کے قبائلیوں پر اب مکمل طور پر کھل چکا تھا کہ اب تک انھیں آگ اور سورج کے نام پر بیوقوف بنایا جاتا رہا ہے۔

وہ دن ہے اور آج کا دن، دونوں قبائل اتفاق اور محبت کے ساتھ خوشی خوشی زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔

Death of Old Brainia

بوڑھا برینیا غیر معمولی انسانوں میں سے ایک چھوٹا اور معمولی درجے کا انسان تھا۔ برینیا اوائل عمری میں تھوڑا کند ذہن تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کو دوسروں کے ذہن پڑھنے کا آسان گر سیکھنے میں زمانے لگے تھے۔ دن رات کی ریاضت اور مختلف مشقیں کرنے کے بعد وہ اب بڑھاپے میں جا کر اس قابل ہوا تھا کہ جب چاہتا، کسی بھی جاندار کے ذہن میں گھس جاتا اور وہاں کیا کچھ چل رہا ہوتا، پوری طرح جان جاتا۔

بوڑھا برینیا ہمیشہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا کہ کچھ انسان جانتے بوجھتے کیوں غلط فیصلے لیتے ہیں، غلط راستہ چنتے ہیں، غلط زندگیاں جیتے ہیں، غلط بیانی سے کام لیتے ہیں اور خوراک سے لے کر رہن سہن ہر طرح کے فیصلہ لیتے۔ وہ اکثر اپنے گردو پیش اور انجان مختلف انسانوں کے اذہان کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ وہ بغور ان کے ذہن کا معائنہ کرتا، انھیں ان کے ذہن ہی میں گھس کر اچھے اور مفید مشورے دیتا اور ایک دن خاموشی سے ان کے اچھے اور برے انجام دیکھ کر آگے بڑھ جایا کرتا اور پھر کسی دوسرے انسان کے ذہن میں اس کا حال جاننے گھس جاتا۔

اسے یہ جاننے کا بے حد شوق تھا کہ انسان جب غلط فیصلہ کرتے ہیں یا کوئی بھی غلط قدم اٹھاتے ہیں تو اس وقت ان کے ذہن میں کیا کچھ چل رہا ہوتا ہے۔

زندگی کے چھوٹے چھوٹے فیصلوں سے بڑے بڑے فیصلے لیتے انسان اسے اپنے اردگرد ہر وقت مختلف چھوٹی بڑی صورتِ حال سے نبرد آزما ہوتے نظر آتے۔

اس دن وہ انجان خریداری کرتے لوگوں کے ذہنوں کے مطالعے کی نیت سے گھر سے نکلا تھا۔ ایک بڑے شاپنگ سٹور میں بوڑھے برینیا نے ایک ادھیڑ عمر انسان کو دیکھا جس کا پیٹ باہر کو نکلا ہوا تھا، کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر مستقل پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ شخص اپنا دوپہر کا کھانا چننے میں مگن تھا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ مختلف کھانوں میں سے کون سا کھانا چنے۔

اسے شش و پنج میں دیکھ کر بوڑھے برینیا نے اس کے ذہن میں گھسنے کا فیصلہ کیا اور گھستے ہی اسے اس کی صحت کے حساب سے سبزیاں، سلاد اور پھل کی طرف اس کی توجہ دلائی مگر اس نے ان خیالات کو زبردستی ذہن سے جھٹک دیا اور چینی اور کریم سے بھرا ایک رول اٹھالیا اور ساتھ ہی کوئی مشروب تلاش کرنے لگا۔ برینیا نے ٹھیک موقع سمجھتے ہوئے اس کے ذہن میں سبز چائے کے تصور کو ابھارا مگر اس نے حیرت انگیز طور پر زبردستی اسے بھی ذہن سے جھٹک دیا اور دس چمچ چینی والی سوڈا کی بوتل اٹھالی اور ہلکی ہلکی چال اور جھکی کمر کے ساتھ سٹور سے باہر نکل گیا۔ اس نے آخری کوشش کی اور اس کے ذہن میں اس فیصلے کے مستقبل میں ہونے والے انجام کی ہلکی سی تصویر کشی کی کہ وہ سٹروک کی حالت میں اسپتال کے بستر پر بیمار پڑا ہے مگر حیرت انگیز طور پر اس نے اس خیال کو بھی برا واہمہ سمجھ کر فوراً جھٹک دیا اور چلتے چلتے پھولے سانس کے ساتھ سوڈا کی بوتل کھول کر پینے لگا اور ساتھ کریم رول بھی کھانے لگا۔

بوڑھے برینیا نے غور کیا، اس شخص کے ذہن میں ہر لقمہ چباتے ایک عجیب ہیجان کی سی کیفیت تھی۔ وہ اس خوراک کا انجام جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ خود پر ظلم کر رہا ہے اور اپنے جسم کو تباہ کر رہا ہے مگر زندگی سے بیزار اور خود کو سزا دینے جیسی آوازیں بھی اس کے ذہن کے ایک کمرے میں سے ہلکی آواز میں برابر، بغیر رکے چل رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہا

تھا کہ وہ خود کو کسی قسم کی سزا دے رہا ہے اور وہ اسی قابل ہے کہ خود پر ظلم کرے اور بیمار ہو کر مرے۔ اچانک اس نے جھنجلاہٹ میں ایک سگریٹ بھی سلگالیا۔ اس کا سانس پہلے ہی پھولا ہوا تھا، اس کا دل معمول سے تیز دھڑکنے لگا۔ اتنا تیز جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ اس کے ماتھے پر سرد موسم کے باوجود پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس نے انھیں پونچھا اور سگریٹ مزید لمبا کھینچ کر پینا شروع کر دیا۔

برینیا اسے دیکھ کر بہت مایوس ہوا اور فوراً باہر نکل آیا اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ برابر کی ایک کاسمیٹکس کی دکان میں گھس گیا۔ وہاں اس نے ایک خاتون کو دیکھا جو کچھ میک اپ کی چیزیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے غور کیا کہ اس نے چہرے کی جھریاں چھپانے کے لیے اچھا خاصا پاؤڈر پہلے ہی لگا رکھا تھا اور وہ اسی قسم کے نئے پاؤڈر کی تلاش میں تھی۔ برینیا کو اس کے انداز سے تعجب ہوا اور اس نے اس کے ذہن کی سیر پر جانے کا فیصلہ کیا۔ خاتون کے ذہن میں گھستے ہی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے ذہن کے ایک کمرے میں مسلسل ایک آواز چل رہی تھی جو اسے بار بار کہہ رہی تھی، تم بوڑھی لگ رہی ہو! تم بوڑھی لگ رہی ہو! بڑھاپے کو چھپاؤ، بڑھاپے کو چھپاؤ۔

بوڑھے برینیا نے اس کے ذہن کے ایک نئے کمرے کو کھولا جس پر بھاری تالا پڑا تھا۔ بوڑھے برینیا نے اس کی تمام کھڑکیاں کھولیں اور وہاں ایک نئی آواز کو اس کے ذہن میں چلانے کی کوشش کی جو کچھ اس طرح تھی؛ بڑھاپا کوئی عیب نہیں، اسے چھپانا حماقت ہے۔ برینیا نے اس کی توجہ مختلف پھلوں اور سبزیوں کی طرف دلائی جن کے استعمال سے اس کی جلد قدرتی بہتر ہو سکتی تھی مگر اس نے غور کیا، اس خاتون نے ان آوازوں کو سننے کے باوجود ذہن سے فوری جھٹک دیا اور ذہن کے اس کمرے کی تمام کھڑکیاں بند کر دیں اور پھر تالا ڈال دیا تاکہ وہ آواز اسے سنائی نہ دے اور فوراً بالوں کو رنگنے کی دو بوتلیں اور جھریوں کو چھپانے کے لیے پاؤڈر کی دو ڈبیاں اٹھالیں۔

برینیا نے اس کے ذہن سے باہر نکلنے میں عافیت جانی اور آگے بڑھ گیا۔

آگے چل کر بزرگ برینیا ایک ریستوران میں گھسا۔ اسے وہاں ایک بھاری بھر کم شخص ایک ٹیبل پر کھانا کھاتا نظر آیا جو پسینے میں شرابور، بہت ندیدے طریقے سے کھانوں پر ٹوٹا پڑا تھا۔ برینیا نے اس کے ذہن میں داخل ہو کر اسے آگاہ کیا کہ اتنا کھانا اس کے لیے ٹھیک نہیں، مگر اس نے فوراً اس خیال کو ان سنا کر دیا۔ برینیا نے خیال کو اور واضح اور بلند کیا مگر حیرت انگیز طور پر اس نے اسے پھر ان سنا کر دیا۔ برینیا نے غور کیا کہ اس شخص کا ذہن باقیوں سے ہٹ کر ایک بڑے ہال نما کمرے کی مانند تھا جہاں کوئی اور کمرہ نہ تھا۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے پلیٹ میں الٹی سیدھی چیزیں ڈال کر ٹھیک سے چبائے بغیر تیزی سے نگل رہا تھا۔

برینیا نے غور کیا کہ یہ شخص پچھلے دو کیسز سے ہٹ کر اپنے ذہن کی کسی بھی آواز پر ذرا بھی کان نہ دھرتا تھا۔ اچھے برے کسی بھی مشورے پر توجہ نہ دینے والے اس شخص کے ذہن کو دیکھ کر برینیا بہت حیران ہوا۔ بظاہر کسی عقل سلیم سے عاری جانور اور اس فربہ شخص کے خالی ذہن میں برینیا کو کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔

برینیا نے اس کے ذہن سے باہر نکل کر آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لیا۔ اسے ایک شراب کے نشے میں دھت شخص بیٹھا نظر آیا جو اس وقت بھی ایک ہاتھ میں جام لیے بیٹھا عجیب عجیب نظروں سے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ برینیا نے اس کے ذہن میں چکر لگانے کی ٹھانی۔ وہ جونہی اس کے ذہن میں گھسا، وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر ارد گرد پڑی مختلف چیزیں توڑنے لگا۔ برینیا نے اس کے ذہن میں ایسے بے ہنگم شور کو سنا جو اس سے پہلے کبھی اس نے نہ سنا تھا۔ اس کا ذہن کئی منزلہ تھا جہاں بہت سے کمرے تھے۔ وہاں کوئی نہ کوئی بے ہنگم آواز چل رہی تھی مگر وہ شرابی شخص اپنے ذہن کے ایک خاص کمرے کی، جو بظاہر تہ خانے جیسا تھا، آواز سنتا تھا، جہاں سے "توڑ دو، مار دو!" کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ برینیا نے ایک نئی آواز کو اس کے ذہن میں چلایا؛ "سو جاؤ، پُر سکون ہو جاؤ!" مگر وہ شرابی اس آواز پر غصے سے بھر کر اور چیزیں توڑنے لگتا۔ مجبور برینیا اسے اس کے حال پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

اگلے موڑ پر برینیا نے دیکھا کہ دو شخص آپس میں بحث کر رہے تھے، جو ہر اگلے لمحے

جھگڑے کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو جھوٹا اور دغاباز قرار دے رہے تھے۔ برینیا کو ان دونوں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ ان میں سے ایک شخص کے ذہن میں یہ جاننے کے لیے گھسا کہ کیا وہ واقعی سچ کہہ رہا ہے؟ جونہی برینیا اس باتونی شخص کے ذہن میں گھسا، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ذہن میں ہر جگہ تعفن اور بُو کے ڈیرے تھے، جبکہ اس کا ظاہری حلیہ بہت صاف ستھرا اور معطر تھا۔ اس کے ذہن میں ہر جگہ ایک ہی آواز چل رہی تھی، "جھوٹ بول بچ جائے گا! جھوٹ بول بچ جائے گا!" برینیا کو پہلی بار اُبکائی آنے لگی، وہ فوراً باہر نکلا اور دوسرے شخص کے ذہن میں گھس گیا۔ دوسرا شخص بظاہر انتہائی سادہ لوح انسان تھا اور وہ اپنی جان چھڑوانے کی تگ ودو میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ذہن کے تمام کمرے کشادہ، صاف اور ہوادار کھڑکیوں سے سجے تھے۔ برینیا نے اس شخص کے ذہن میں جو اس وقت خوف کی وجہ سے سہما تھا، ایک آواز لگائی: "خاموشی سے لمبی سانس لو، خاموشی سے لمبی سانس لو!"

اس شخص نے اس آواز کو سنا اور خاموش ہو گیا۔ تنگ آکر دوسرا شخص بھی بڑبڑاتا آگے بڑھ گیا۔ برینیا اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر آتے ہی تھکا ہارا بوڑھا برینیا کچھ دیر ستانے کے لیے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے ذہن کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ مر چکا تھا مگر اس کا ذہن ابھی زندہ تھا، جہاں ایک آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی: "تم زندہ ہو، تم زندہ ہو!" دورانِ نیند اسے شدید دل کا دورہ پڑا، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اس کی بیوی اور بچے اس کی لاش کے گرد بیٹھے رو رہے تھے۔

برینیا بہت حیران ہوا اور اچانک اس کے ذہن میں ایک نئی آواز چلنا شروع ہوئی۔ 'ذہن کو سلا دو برینیا، تم مر چکے ہو، مر چکے ہو!' یہ آواز اس سے پہلے آج تک اس نے اپنے ذہن میں نہ سنی تھی۔ شاید کوئی دوسرا اُس کے ذہن میں داخل ہو چکا تھا۔ بوڑھے برینیا نے اس نئی آواز پر لبیک کہا اور زندگی میں پہلی بار اپنے ذہن کا مین سوئچ ہمیشہ کے لیے آف کر دیا اور ابدی نیند سو گیا۔

کرہ ارض ریفارم ٹینڈر

کرہ ارض کے ریفارم کا ٹینڈر کھولا جا چکا تھا۔ تمام سیاروں کی ریفارم کمپنیاں اپنی اپنی بولی لگا رہی تھیں۔ ہر کمپنی مختلف اعداد و شمار اکٹھے کرنے کے بعد کرہ ارض کے ریفارم اور اس پر اٹھنے والے خرچ اور اس کی تفصیلات اپنے اپنے طور پر بنا رہی تھیں۔

یہ تمام ریفارم کمپنیاں اپنے کام کی ماہر کمپنیاں تھیں اور ان میں سے کچھ تو کرہ ارض جیسے کتنے ہی نئے سیارے تعمیر کرنے کا وسیع تجربہ بھی رکھتی تھیں۔

میری ملاقات ان ہی میں سے کسی کمپنی کے ایک قابل ٹھیکیدار سے ہوئی جو پہلے بھی کئی سیاروں کو ریفارم کر کے انھیں رہنے کے قابل بنا چکا تھا۔

میری اور اس کمپنی کے ٹھیکیدار کی کرہ ارض کے ریفارم کے حوالے سے تفصیلی بات چیت ہوئی، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

میں: السلام علیکم، جی ٹھیکیدار صاحب! آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے مجھے انٹرویو دینے کے لیے وقت نکالا۔

ٹھیکیدار: وعلیکم السلام! جی پوچھیے، آپ کو کیا پوچھنا ہے؟

میں: شکریہ ٹھیکیدار صاحب۔ یہ بتائیے کہ جو نئے ٹینڈر کھلے ہیں کرہ ارض کے ریفارم

کے حوالے سے، ان میں کس قسم کے ریفارم ہوں گے؟ کچھ تفصیل بتائیے ہمارے قارئین کو!

ٹھیکیدار: جی یہ ریفارم کے ٹینڈر رہیں جیسے دوسرے ٹینڈر ہوتے ہیں۔ سب چوپائے، دوپائے بنانے کے ٹینڈر کی طرح اس ریفارم کے ٹینڈر کی منظوری کے بعد مختلف طرح کے کام ہوں گے۔ جہاں جہاں کرہ ارض میں ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے، وہاں گھاس فلور کی بحالی، سبزے کے کارپٹ کی تبدیلی، اوزون وال پیپر کی تبدیلی، سمندری پول کی صفائی، سیم تھور والے کھیتوں کے ہوم گارڈن کی گوڈی، نئے پودے اور درخت لگائے جانے کا کام، زیرِ زمین خستہ و بدحال بنیادوں کی مرمت، پہاڑوں کی چٹختی دیواروں کی جگہ نئی دیواروں کی تعمیر، آب و ہوا کے اے-سی کی سروس، سورج کے ہیٹر کے فلٹر کی تبدیلی، کرہ ارض کی آسمانی چھت سے جالے اتارنے کا کام، پنکھوں کی صفائی اور کچھ نئی قسم کے بیل بوٹے لگانے کا کام شامل ہے۔

میں: ٹھیکیدار صاحب! یہ تو کافی لمبا چوڑا کام لگ رہا ہے۔ خرچ بھی کافی اٹھ جائے گا مالکان کا، نہیں؟

ٹھیکیدار: جی ہاں، تھوڑا وقت تو لگے گا مگر میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کام ریفارم والا ہے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے کرہ ارض کو ایک دفعہ گرا کر نیا سیارہ بنانا سستا پڑے۔

میں: ٹھیکیدار صاحب، میں نے سنا ہے آپ یہ کام یہاں پہلے بھی کر چکے ہیں؟

ٹھیکیدار: جی ہاں، ہماری کمپنی اس طرح کے کاموں کا وسیع تجربہ رکھتی ہے۔ پانچ ہزار سال پہلے بھی ہم اس سیارے پر ریفارم کا کام کر چکے ہیں مگر اس وقت تھوڑے پانی کی دھلائی سے ہی کام جلد نپٹ گیا تھا۔ ہم نے ایک سمندر سے پورے کرہ ارض کو دھو دیا تھا اور کام سستے میں نمٹ گیا تھا مگر اس بار کام اُس وقت کی نسبت کہیں زیادہ ہے اور وقت اور خرچ بھی پہلے کی نسبت زیادہ اٹھے گا۔ صرف اوزون کے وال پیپر کی تبدیلی میں ہی کئی صدیاں لگ سکتی ہیں۔ پھر گھر کے سمندری پول کی

صفائی میں بھی اچھا خاصا سرمایہ اور وقت لگے گا۔

ہم نے اپنی کوٹیشن حکومتِ وقت کو دے دی ہے۔ اگر ہمیں ٹینڈر مل گیا تو ہم فوراً کام شروع کر دیں گے۔

میں: ٹھیکدار صاحب، یہ بتایئے کام شروع کب اور کہاں سے ہو گا؟ میرا مطلب سب سے پہلے آپ ریفارم کس شعبے میں کریں گے؟

ٹھیکیدار: ہماری پوری کوشش ہو گی کہ کرہ ارض کے رہائشی جنھوں نے اس گھر میں یہ سارا گند ڈالا ہے اور توڑ پھوڑ کی ہے، انھیں کم سے کم تکلیف ہو مگر ظاہر ہے اس کام کی نوعیت ایسی ہے کہ رہائشیوں کو تھوڑی بہت تکلیف تو اٹھانی ہی ہو گی مثلاً یہ کہ جہاں ہم ریفارم رنگ روغن کاٹ پیٹ کر رہے ہوں گے۔ وہاں سے اہلِ علاقہ کو ذرا دور رہنا ہو گا۔ اور جہاں تک آپ کا یہ سوال ہے کہ ریفارم کی پہل کہاں سے ہو گی تو اس کا حتمی تو میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میرے تجربے کے حساب سے ہمارا کام آب و ہوا کے اے سی کی سروس سے شروع ہو گا جس کی صفائی کے بعد ہی اوزون کے وال پیپر کی تبدیلی کا کام شروع ہو پائے گا۔

اور پھر بتدریج ہم پہاڑوں کے در و دیوار کے پلستر، گھاس فلور اور سبزے کے کارپٹ کی تبدیلی اور اخیر میں سمندری پول کی صفائی کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرے اندازے کے مطابق کافی مشکل کام ہو گا اور اس کے لیے ہمیں کافی لیبر درکار ہو گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پول میں رہائشیوں نے سارے گھر کا کاٹھ کباڑ، پلاسٹک، فضلہ سب بغیر کسی تمیز کے پھینک رکھا ہے جس کی وجہ سے سارے دریائی اور نہری پائپ بری طرح بند ہو کر ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ان دریائی پائپوں کی صفائی ہو گی یا نئے دریائی پائپ ڈالنے ہوں گے، میں فی الوقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میں: اوہ ہو ہو ہو، ٹھیکیدار صاحب یہ تو بہت ہی لمبا کام بتا رہے ہیں آپ! اگر میں ٹھیک سمجھی ہوں تو آپ کے پروگرام سے لگ رہا ہے کہ اس ریفارم کے دوران کرہ

ارض کے گھر کے مالکان کو کچھ عرصہ اپنی تمام نقل و حرکت بھی روکنی ہو گی؟ اگر پائپ ہی بند ہوں گے تو ظاہر ہے سب ہو دیاں ابلنے لگیں گی۔ آپ نے تو ڈرا ہی دیا ٹھیکیدار صاحب۔

ٹھیکدار: جی ہاں، آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا محترمہ۔ نقل و حرکت کو روکے بغیر یہ ریفارم کا کام مکمل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ بہت پیچیدہ کام ہے جس میں کسی قسم کا خلل پوری عمارت کو گرا سکتا ہے۔ میری مراد ہے دوزان ریفارم کرہ ارض کی بنیادوں کی مرمت سے لے کر اوزون کے وال پیپر کی تبدیلی اور دریائی پائپوں کی ریپئر یا تبدیلی جیسا نازک کام کر رہے ہوں گے جن میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ کرہ ارض کے رہائشی ہماری ہدایات کی سختی سے پیروی کریں بصورت دیگر نتائج کے ذمہ دار رہائشی خود ہوں گے۔

میں: جی میں سمجھ سکتی ہوں آپ کی بات ٹھیکیدار صاحب، یہ واقعی ایک مشکل کام ہے اور جسے احتیاط سے ہی کیا جانا چاہیے۔ مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کی جو مقابل کمپنیز ہیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور اس کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ ٹھیکہ آپ ہی کی کمپنی کو ملے گا؟ میرا مطلب کہیں آپ کی بجائے یہ ٹھیکہ انھیں تو نہیں مل جائے گا؟

ٹھیکیدار: جی ہاں، دوسری کمپنیز بھی یقیناً اس ٹینڈر کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گی مگر ان کمپنیوں اور ہم میں جو واضح فرق ہے وہ یہ ہے کہ ہم ریفارم ایکسپرٹ ہیں جبکہ وہ کمپنیاں نئے سیارے بنانے کا تجربہ رکھتی ہیں۔ ریفارم کا کام ایک لحاظ سے نئے سیارے کی تعمیر سے زیادہ مشکل اور گنجلک کام ہے اور ہماری کمپنی کو یہی ایج حاصل ہے جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ریفارم کا ٹینڈر ہم یقیناً حاصل کر لیں گے۔

میں: جی مجھے بھی آپ سے بات چیت کے بعد یہی لگتا ہے، اچھا یہ بتائیے ٹھیکیدار

صاحب، اگر دوران ریفارم کرہ ارض کو مجبوراً گرانا پڑ گیا یا میرا مطلب بنیادیں ہلنے سے حادثاتی طور پر سیارہ تباہ ہو گیا تو اس صورت میں آپ کی کمپنی کوئی ہرجانہ بھرے گی یا متبادل سیارہ تعمیر کر کے دے گی؟ معذرت چاہتی ہوں، سوال تھوڑا ٹیڑھا اور مشکل ہے مگر میری مجبوری ہے، امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے۔

ٹھیکیدار: جی نہیں، اس میں ایسی برا منانے والی کوئی بات نہیں، ہماری کمپنی کی ایک ساکھ ہے اور وہ ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ کاروبار میں نقصان گھاٹا تو لگا ہی رہتا ہے۔ آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ مالکان پر منحصر ہے کہ وہ انشورنس وغیرہ کرواتے ہیں اور معاہدے میں یہ شق شامل کرتے ہیں یا نہیں۔

مگر آپ کو بتاتا چلوں ماضی میں ایک ایسے ٹینڈر میں اس سے ملتی جلتی صورتِ حال کا سامنا ہم کر چکے ہیں، جس کا آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا۔ ایک دوسرے سیارے میں اسی قسم کے حالات تھے جیسے ہمیں یہاں نظر آ رہے ہیں۔ جب ہم نے وہاں ریفارم کا کام شروع کیا تو وہاں کے رہائشیوں کو ایک دوسرے عارضی سیارے میں منتقل کیا گیا تھا جس پر اُن کا اچھا خاصا خرچہ اٹھا تھا۔ مگر اس کا فائدہ انھیں یہ ہوا کہ دوران ریفارم جب سیارے کی ایک طرف کی بنیاد بیٹھ گئی اور سیارہ بری طرح ایک طرف جھک گیا اور پھر خلافِ توقع کچھ سالوں میں تباہ بھی ہو گیا مگر ان کے صحیح اقدام اور انشورنس کی وجہ سے انھیں نیا سیارہ رہنے کے لیے مل گیا اور وہ اسے بہت صاف ستھرے اور اچھے طریقے سے استعمال کر رہے ہیں۔

مگر کرہ ارض کے باسی، مجھے نہیں لگتا اس قسم کی حکمت عملی اپنائیں گے، کیونکہ جیسا میں نے آپ کو بتایا، پانچ ہزار سال پہلے بھی یہ ایک دفعہ ریفارم کروا چکے ہیں۔ سارے نئے پائپ ڈال کے دیے گئے تھے انھیں، مگر اب حالات آپ کے سامنے ہیں۔ سب کچرے سے بھرے ہیں۔ یہ تو رہائشیوں پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ گھر کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ہم تو صرف اپنا کام ہی کر کے دے سکتے ہیں۔

میں: اپنا قیمتی وقت دینے کے لیے بہت بہت شکریہ ٹھیکیدار صاحب۔ جلد ہی آپ سے دوبارہ بات ہو گی، بہت خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔

ٹھیکیدار: جی ضرور، مجھے بھی بہت اچھا لگا آپ سے بات کر کے۔
آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟
کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

میں: میرا نام ابجکلیول ہے۔
جی میں شادی شدہ ہوں۔
میرے آٹھ کروڑ کے قریب بچے ہیں۔
اور آپ کا اسم گرامی؟

ٹھیکیدار: جی میرا نام اکیلا ہے۔
میں شادی شدہ نہیں ہوں۔
البتہ میرے بچے ہیں سات ارب اناسی کروڑ

میں: ماشاءاللہ۔

تسبیح!

پروین گھروں میں کام کاج کر کے اپنی اور اپنے بچوں کی روزی روٹی چلاتی تھی۔ خاوند عظیم ایک ٹانگ سے اپاہج تھا۔ کسی اچھے زمانے میں ایک مصروف چوراہے پر ٹھیلے پر گول گپے بیچا کرتا تھا۔ اس وقت ان کا گزارا بہت اچھا ہوتا تھا، تین وقت کا اچھا کھانا ملتا تھا۔ شومیٔ قسمت، ایک دن تیزی سے موڑ کاٹتے کوئی موٹر سیدھی اس بے چارے کی ریڑھی میں جا گھسی۔ عظیم کی ریڑھی کے بخیے تو اُدھڑے سو اُدھڑے، عظیم کی اپنی ایک ٹانگ بھی اس ناگہانی حادثے میں شدید زخمی ہو گئی۔ حادثے کے بعد لوگوں نے عظیم کو قریبی خیراتی ہسپتال میں پہنچایا۔ خیراتی ہسپتال کے ڈاکٹر نے لاعلاج سمجھ کر اسی دن عظیم کی ٹانگ کو کاٹ ڈالنا مناسب سمجھا۔ عظیم کی جان تو کسی طرح بچ گئی مگر اس کی اور اس کے بچوں کی زندگی مکمل تباہ ہو گئی۔ بعد میں پتا لگا موٹر کا ڈرائیور حادثے کے وقت نشے میں تھا مگر پولیس کو کچھ دے دلا کر صاف بچ نکلا۔

میاں کی اچانک معذوری کے بعد مجبوراً سارے گھر کا بوجھ پروین کے کاندھوں پر آن پڑا۔ پروین اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لیے گھروں میں صفائی ستھرائی کے کام کرنے لگی۔ اجرت بہت کم ملتی تھی جبکہ اس کے گھر کے اخراجات زیادہ ہوتے تھے۔ پروین اس کمی کو پورا کرنے کے لیے چھوٹی موٹی چوریاں کرنے لگی۔ ہر چوری کے بعد وہ سچے دل سے توبہ کرتی مگر پھر اپنی بے بسی سے مجبور ہو کر کبھی پیاز چرا لیتی، کبھی لہسن اور کبھی چینی۔ جہاں بھی وہ کام

کرتی۔ اس کی مشکوک حرکتوں کی وجہ سے مالکان اسے فوراً جواب دے دیتے۔

اس بار جس گھر میں پروین کو نوکری ملی تھی وہاں ویسے تو بہت سی قیمتی چیزیں تھیں، جیسے مہنگی گھڑیاں، زیورات، نقدی، عمدہ و نفیس کپڑے مگر یہ سب نوکروں کی چوری کے ڈر سے تالے میں رکھے جاتے تھے۔ اور تو اور کھانے کی چیزوں کو بھی اس گھر میں تالے میں رکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ریفریجریٹر پر بھی موٹا تالا ڈال رکھا تھا جس کی چابی بڑی بیگم کے پاس ہی رہا کرتی تھی۔ پروین ہزار کوشش کے باوجود ابھی تک چھوٹی موٹی گری پڑی کھانے کی چیزوں کے علاوہ کوئی لمبا ہاتھ نہیں مار سکی تھی۔ مالکن بڑی بیگم بھی گھاگ اور انتہائی کنجوس خاتون تھیں۔ نہ جانے کتنی پروین جیسیوں کو اب تک بھگتا کر چلتا کر چکی تھیں۔

مگر پروین بھی اس بار تہیہ کر کے آئی تھی کہ اس گھر سے کوئی نہ کوئی قیمتی چیز تو ضرور چرا کر ہی دم لے گی۔

مالکن ہر وقت تسبیح گھماتے پروین پر عقاب کی طرح نظریں جمائی رکھتی تھیں۔ گھر میں ہر لمحہ پروین کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھی جاتی۔

ایک دن پروین نے سو روپے ادھار مانگنے کی کوشش کی تو مالکن نے تیس روپے اس شرط پر دیے کے تنخواہ میں سے برابر کٹیں گے۔

ایک روز پروین کو موقع ملا، مالکن غسل خانے میں تھیں، پروین نے اِدھر اُدھر کچھ کام کی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر حرام تھا جو کچھ بھی تالے سے باہر ملتا۔ اچانک پروین کی نگاہ مالکن کی تسبیح پر پڑی۔ پروین نے اسے ہی غنیمت سمجھا اور فوراً اپنے پلّو میں باندھ لی اور فوراً غسل خانے کے باہر سے ہی مالکن سے اجازت لے کر وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔ گھر آتے ہی سب سے پہلے پروین نے وضو کیا اور مصلیٰ بچھا کر اسی تسبیح کو ہاتھ میں پکڑ کر توبہ استغفار کرنے لگی۔ اس کے خاوند نے دُور سے پوچھا: 'کیوں، اس بار کیا مال اڑایا نیک پروین؟'

'کچھ خاص نہیں، البتہ اس بار مجھے وہ چیز ملی ہے کہ کیا بتاؤں۔ سارے گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے اور کل جب میں اسے بیچوں گی تو دو چار روپے بھی مل ہی جائیں گے۔"

اگلے دن جب پروین وہ تسبیح لے کر چور بازار پہنچی تو پتا لگا کہ وہ یاقوت، ہیرے، مرجان، روبی سٹون، فیروزے سے بنی نایاب سلک دھاگے سے تیار کردہ قیمتی تسبیح ہے، جس کی قیمت کم سے کم بھی لاکھوں روپوں میں ہے۔

پروین نے فوراً اسے بیچا اور سیدھی اپنے خاوند کو لے کر بہت ہی بڑے ہسپتال پہنچی جہاں بہت ہی مہنگی، اصل کے نزدیک ترین نقلی ٹانگیں بنائی جاتی تھیں۔ پروین نے عظیم کی مصنوعی ٹانگ بنوائی جس کے بعد وہ کچھ دن میں ہی چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ پیسوں سے دہی بھلوں کے کاروبار کے لیے نئی مضبوط لوہے کی چادر والی ریڑھی خرید کے عظیم کو دی اور ایک سارجنٹ کو رشوت دے کر عظیم کو ایک مصروف سڑک پر عین کھمبے کے پیچھے محفوظ جگہ بھی دلوا دی جہاں اس کا کام دنوں میں اٹھ گیا۔ ان سب کاموں کے بعد بھی اس کے پاس بہت سے روپے بچ گئے تھے۔

پروین اور اس کے کنبے کی زندگی کے سب دلدّر دُور ہوتے ہی پروین کے دل میں اب کچھ دنوں سے گناہوں کا بوجھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس نے باقی پیسوں سے عمرہ وزیارات کا منصوبہ بنایا اور پاک ہستیوں کے دربار جا پہنچی۔ وہاں جا کر گڑ گڑا کر اس نے اپنے سارے گناہوں کی معافی مانگی تب جا کر اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ وہاں سے واپسی پر پروین نے سستی تسبیحیں تبرک کے طور پر خریدیں اور بہ خیر و عافیت اپنے وطن واپس آ گئی۔ اگلے ہی دن ایک تسبیح لے کر وہ سیدھی اپنی پرانی مالکن کے گھر جا پہنچی۔ مالکن نے دیکھتے ہی پوچھا:

"تُو۔۔۔ اتنے دن سے تُو کہاں گم تھی؟"

اور۔۔۔ ابھی مالکن بات کر ہی رہی تھی کہ پروین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مالکن کو تبرک کی تسبیح تھماتے ہوئے فوراً لقمہ دیا۔

"جی بڑی بیگم ساب جی، میں تو عمرے کے لیے چلی گئی تھی جی۔ میری منت تھی نہ جی۔ جب میرا خاوند چلنے لگے گا نہ جی، تو کام چھوڑ دوں گی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا جی۔ آپ کی دعا سے وہ اب خود کی چاٹ کی ریڑھی لگانے کے قابل ہو گیا ہے۔ یہ تسبیح میں تمام روضوں

سے مس کر کے صرف آپ کے لیے لائی ہوں بیگم صاحبہ۔"

مالکن نے اس کی بات کرنے کا انداز اور نیک خیالات سن کر اپنی تسبیح کی چوری کا الزام پروین پر لگانے کا فیصلہ فوراً ترک کر دیا اور اس کے بعد فوراً جو پانچ ریال کی تسبیح پروین نے اسے دی تھی، ہاتھوں میں تھام کر عقیدت سے چومنا شروع کر دی۔

اس دوران مالکن اور پروین دونوں کی آنکھوں میں موٹے موٹے روحانیت میں ڈوبے آنسو تیرنے لگے۔

مزدور لوگ!

اسے غریب غربا، ہاتھ سے کام کرنے والے مزدوروں سے سخت چڑ تھی۔ اسے لگتا تھا یہ طبقہ اپنا کام ٹھیک سے نہیں کرتا۔ وہ جب بھی کبھی کسی مزدور پیشہ شخص کو کوئی کام سونپتا، اسے کام مکمل ہونے کے بعد پچھتاوا ہوتا اور وہ ان سے جرح کرتا کہ آخر وہ کم عقل لوگ اپنا کام ٹھیک سے کیوں نہیں کرتے۔

اس بار بھی جب اس نے دو مزدوروں کو گھر کے رنگ روغن کے لیے نہ صرف کام دیا بلکہ انھیں تمام ضروری سامان بھی خرید کر دیا مگر جب کام مکمل ہوا تو اسے دیواروں میں جگہ جگہ نقائص نظر آنے لگے۔ کسی کسی دیوار پر پلستر خراب ہونے کی وجہ سے رنگ ٹھیک سے اٹھا بھی نہیں تھا۔ اسے ہمیشہ کی طرح پھر خود پر بہت افسوس ہوا کہ آخر اس نے اتنے ناکارہ مزدوروں کو کام کیوں دیا، جن کی وجہ سے اس کے گھر کی دیواروں کا پہلے سے زیادہ ستیاناس ہو گیا۔ اس نے مزدور لڑکے کو پاس بلایا اور ناک پر رومال رکھتے ہوئے غصے سے پوچھا:

"یہ کیا حالت بنا دی تم نے میرے قیمتی گھر کی دیواروں کی؟ تم لوگ اتنے کام چور کیوں ہوتے ہو؟ آخر ٹھیک سے کام کیوں نہیں کرتے؟"

ان میں سے ایک مزدور لڑکا جو کام کی تھکن سے چور اور پسینے سے شرابور تھا، بولا:

"صاحب جی پلستر ٹھیک نہیں تھا نیچے، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم نے تو دل

و جان سے پوری محنت کی تھی۔ ہم صبح سات بجے سے شام سات بجے تک کام کرتے رہے ہیں، جتنا زور لگ سکتا تھا لگایا۔ ہماری محنت کے صلے میں آپ ہمیں ڈانٹیں تو نہ جی۔ ہم سے جتنا اچھا ہو سکتا تھا اتنا کیا ہے صاحب جی۔"

اس نے غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا:

"تم لوگ ہو ہی نالائق، غلطی میری ہے جو میں نے تم جیسے نالائقوں کو چنا۔ تم لوگوں کی یہی سزا ہے کہ تمھارے پیسے کاٹے جائیں تو تمھیں پتا لگے محنت سے کیسے کام ہوتا ہے۔"

"صاحب جی ایسا نہ کریں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے، ہیں ان کے سکولوں کی فیس میں کیسے دوں گا جی؟"

ہیڈ مزدور کے ساتھی نے روہانسی آواز میں استدعا کی۔

"نہیں نہیں، ایسے کیسے دے دوں میں تمھیں پورے پیسے؟ ہیں؟ کوئی مذاق ہے؟"

اس نے ماتھے پر تیوری چڑھاتے ہوئے دونوں مزدوروں کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔ اب یہ ڈرامے بازی بند کرو۔ موٹے موٹے جھوٹے ٹسوے بہا کر مجھے مجبور نہ کرو۔ یہ لو پکڑو پیسے، صرف دس فیصد کاٹے ہیں میں نے۔ اتنے تو ویسے بھی تم نے حرام کے ہی رکھے ہوئے تھے۔ چلو بھاگو یہاں سے۔"

اس نے حقارت سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں اس کا دوست کالا چشمہ اُتارتا اندر داخل ہوا۔

"یار بہت گرمی ہے۔ اے سی لگاؤ اے سی! یہ اتنی گندی پسینے کی بُو کیا آ رہی ہے یار؟ کوئی مزدور آیا تھا یہاں؟"

اس کے دوست نے اپنی بوشرٹ پر لگے کلون کی خوشبو سونگھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار، یہ نکمے، نہ انھیں کام آتا ہے کوئی نہ ہی ان میں عقل ہوتی ہے۔ گدھے ہیں بس، گدھے!۔۔۔ دیکھو، انھوں نے میری دیواروں کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا۔ ان کم بختوں

کو منہ مانگا معاوضہ مل سکتا تھا، اگر ٹھیک سے کام کرتے۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے؟ ان کے سروں میں دماغ ہوتا ہی نہیں۔"

اس کے دوست نے دیواروں کی طرف استہزائیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا:

"اور کام کرواؤ جاہل مزدور طبقے سے۔ اس پر میرے ساتھ ہوئی بھی ایک سنو۔"

اس کے دوست نے مسکرا کر بات شروع کی:

"پچھلے سال میری کار ذرا سی لگ گئی۔ میں نے سوچا ڈیلر کی بجائے یہیں کہیں قریب سے کسی مقامی ڈینٹر سے سستی بنوا لیتا ہوں مگر مجھے کیا پتا تھا کہ یہ سارے مزدور جاہلوں کا ٹولہ ہوتے ہیں۔ خیر میں نے گاڑی بننے دے دی، اس نے جو پیسے بتائے وہ کافی مناسب اور ڈیلر سے بنوائی کی نسبت آدھے سے کم تھے۔ میں نے یہ سوچ کر اپنی گاڑی چھوڑ دی۔

مگر یار۔۔۔ خدا کی قسم اتنی گندی بنائی گاڑی، اتنی گندی بنائی کہ کیا بتاؤں۔

جب میں نے پوچھا کہ یہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟ تو پتا کیا بولا وہ جاہل کا بچہ؟

کہنے لگا؛ 'صاحب جی ہم نے اسی بمپر اور لائٹ کو مرمت کر دیا ہے، جو ٹوٹی تھی۔ اسی لیے آپ سے صرف مزدوری کے پیسے لیے ہیں، پرزوں کے نہیں۔

میں نے اپنا ماتھا پیٹ کر کہا، 'او جاہل کی اولاد، تم نے کیا سوچ کر میری گاڑی کا بمپر مرمت کیا ہے؟ تو کہتا ہے اس وقت تو آپ نے خود کہا تھا کہ سستے سے سستا کام کر دو، ہم نے جو بھی ممکن تھا کر دیا سر جی!'

میں نے بھی پھر وہ کلاس لی نا اس کی کہ یاد رکھے گا تمام عمر۔ میں نے کہا، الٹا مجھے پیسے دو تاکہ میں اسے اے ون ٹھیک کروا سکوں۔

بس پھر کیا تھا، اس کے بعد اس جاہل کے چودہ طبق روشن ہوئے تو لگا ترلے منتیں کرنے۔

اصل میں مسئلہ ان لوگوں کے ساتھ یہ ہے کہ یہ لوگ عقل سے بالکل پیدل ہیں۔ نہ ان کو کسی کام کے کرنے کی تمیز ہوتی ہے نہ بات کرنے کا کوئی سلیقہ ہوتا ہے۔ بات کے

درمیان میں جاہلوں کی طرح بول پڑتے ہیں۔ آواز ان سب مزدوروں کی ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کر رہا ہو۔"

دونوں دوست کھکھلا کر ہنسنے لگے۔

"اچھا یار یاد آیا، کوئی جاننے والا مالی ہے تمھارا؟ اصل میں میرا گارڈن آج کل کافی روکھا ہوا پڑا ہے۔ سوچ رہا ہوں تھوڑی گوڈی ووڈی کروا کے نئے پھول بوٹے لگوا لوں۔"

اس کے دوست نے اس سے پوچھا۔

اس نے ناک چڑھا کر کہا:

"پھول بوٹے۔۔۔؟ مجھے تو پولن الرجی ہے۔ مجھے پھول بوٹوں سے ویسے بھی سخت چڑ ہے۔ میں نے تو پچھلے سال سارے درخت پھول بوٹے اکھڑوا کر پلاسٹک کے اصل جیسے پام اور ناریل کے نقلی درخت منگائے اور اصل جیسی نظر آنے والی نقلی گھاس کارپٹ لگوا لیے ہیں۔ بہت سستے مل گئے تھے مجھے چائینہ سے۔"

"اچھا، تو یہ نقلی ہیں؟ لو، میں انھیں اصلی سمجھتا تھا، ہاہاہا۔"

دوسرا دوست ہنسا اور بولا۔

"یار مجھے بھی منگوا دو دس بیس پلاسٹک کے درخت اور کارپٹ گھاس کے رول چائینہ سے۔ میں بہت تنگ ہوں اس جھاڑ سے یار۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان پھولوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ان جاہلوں کو گھر میں بلانا پڑتا ہے۔ دو دن پسینے کی بو آتی رہتی ہے گارڈن کی کرسیوں میں سے۔"

دونوں دوست پھر مل کر ہنسنے لگے۔

اتنے میں گھر کی بیل ہوئی اور ایک کمزور عمر رسیدہ عورت اپنی آٹھ دس سال کی بیٹی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔

"صاحب جی! بیگم صاحب کو کہیں میں اپنی بیٹی کو لے آئی ہوں۔ آج سے وہ برتن پوچا سب کر جایا کرے گی۔ مجھے یرقان ہو گیا ہے۔ حکیم صاب نے کہا ہے کچھ دن کام نہ کر، خود ہی

ٹھیک ہو جائے گا۔"

دونوں دوست اپنی بوشرٹ سے پھر کلون سونگھنے لگے۔

اس نے بے اعتنائی سے کام والی عورت کی طرف دیکھ کر کہا:

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔۔ جاؤ جاؤ، اسے بیگم صاحبہ کے کمرے میں لے جاؤ۔"

کام والی بچی کو لے کر بیگم صاحبہ کے کمرے کے پاس چلی گئی۔ اس نے جونہی ان کے کمرے کا دروازہ کھولا، بیگم صاحبہ نے فوراً چلا کر کہا:

"پھر دروازہ کھول دیا کسی نے؟ ساری ٹھنڈک باہر نکل گئی۔ کتنی دفعہ تجھے بولا ہے امیرن، پورا دروازہ نہیں کھولنا ہوتا اے- سی والے کمرے کا۔"

"اوہ، معاف کر دیں جی۔"

کام والی نے ڈری آواز میں کہا:

"جی یہ میری بیٹی ہے بختاور! سمجھ دار ہے، پورا کام جانتی ہے، سب کام کرے گی۔"

"لگتی تو نہیں۔۔۔۔۔۔ سمجھ دار۔"

بیگم صاحبہ نے لٹکا کر سمجھ دار کہا۔

"جی نہیں بیگم صاب جی، یہ پورا کام کرے گی، میں بیمار ہوں نہ جی۔"

"تجھے کیا ہوا ہے؟ ہٹی کٹی تو ہے۔"

بیگم صاحبہ نے تڑاک لہجے میں کہا۔

"نہیں جی، مجھے یرقان ہو گیا ہے جی۔"

"ہیں۔۔۔۔؟"

بیگم صاحبہ نے حیرت سے کہا:

"اور تُو وہ یرقان یہاں پھیلانے پہنچ گئی؟"

بیگم صاحبہ نے ناک پر دوپٹہ رکھتے ہوئے کہا:

"جا، چلی جا! اور اسے کل نہلا دھلا کر کام پر بھیجنا بس!۔۔۔ اور ہاں، اسے اتنے پیسے

نہیں دوں گی، جتنے تجھے دیتی تھی۔"

"جی بیگم صاحبہ، جیسے آپ کی مرضی! وہ دے دیں جو بہتر سمجھیں، غریب بچی ہے۔"

"ہاں ہاں، یہ پورا ملک ہی غریب ہے، امیر ہم ہی رہ گئے ہیں بس۔"

کام والی اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر واپس نکل گئی اور دونوں دوست ٹی وی پر حالاتِ حاظرہ کا پروگرام دیکھ کر ملکی سیاسی صورتِ حال پر بحث کرنے لگے۔

ایک دوست نے دوسرے کی طرف دیکھ کر افسردگی سے کہا۔

"اس ملک کا کوئی حال نہیں۔"

ایک انسان جو ہنس سکتا تھا!

میرا نام فہمیدہ ہے۔ یہ کافی پرانا کالج کے دنوں کا قصہ ہے۔ ان دنوں شگفتہ میری سہیلی ہوا کرتی تھی۔ شگفتہ کو دوسری بولیاں بہت بھاتی تھیں۔ مجھ سے ہمیشہ کہا کرتی کہ علم میں اضافے کے لیے اپنی بولی کے علاوہ دوسری بولیاں سیکھنا بہت ضروری ہے، اسی لیے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان پڑھنا لکھنا سیکھے گی تاکہ اپنے دل پسند فرانسیسی لکھاریوں کے ناول افسانے وہ انھی کی زبان میں پڑھ سکے۔ میں خود بھی عبرانی زبان سیکھنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں ان دو زبانوں کو پڑھنا اور لکھنا سیکھنے کی مشق کریں گی۔ ایک ماہ بعد دیکھیں گے کہ کون کتنی مہارت حاصل کرتا ہے۔

شگفتہ نے دن رات لگا کر فرانسیسی زبان لکھنے کی مہارت حاصل کی۔ سارا دن وہ مشق کیا کرتی۔ ادھر میں بھی عبرانی زبان کا قاعدہ ہر روز پڑھا کرتی۔ جملے لکھنے اور بولنے کی مشق کیا کرتی۔ ہم دنوں کو ایک ہی ماہ میں پوری طرح دونوں زبانیں لکھنا پڑھنا آ گئیں۔

ہم دونوں بہت خوش تھیں کہ اتنی جلدی ہم نے اپنی مادری بولی کے علاوہ دوسرے دیسوں کی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی ہے۔ شگفتہ وکٹر ہیوگو میپاساں کی کہانیاں انھی کی زبان میں پڑھ سکنے کے پوری طرح قابل ہو چکی تھی اور میں بھی قبل مسیح کی لکھی عبرانی آسانی سے پڑھنے کے قابل ہو چکی تھی۔ ہم دونوں سہیلیاں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھیں۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنے من پسند لکھاریوں کی انھی کی زبان میں لکھی کتابیں خرید کر ایک جگہ اکٹھی ہوں گی اور ایک دوسرے کو اپنی مہارت کا ثبوت پیش کریں گی۔

وعدے کے مطابق ہم اپنے من پسند ریسٹورنٹ میں اکٹھی ہوئیں اور سب سے پہلے میں نے عبرانی زبان میں لکھا ہوا ایک پورا پیراگراف بغیر کسی غلطی اور ہکلاہٹ کے شگفتہ کو فرفر سنایا۔ شگفتہ میری قابلیت سے بے حد متاثر ہوئی۔ اب باری تھی شگفتہ کی۔ اس نے بھی مجھے فرانسیسی میں لکھے دو پیراگراف تیزی سے فرفر پڑھ کر سنائے۔ اس کی فرانسیسی سن کر میرا بھی منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

ہم دونوں بے حد نازاں تھیں کہ اتنے مختصر وقت میں نئی زبان پر عبور حاصل کر لیا ہے۔

جس ریسٹورنٹ میں ہم دونوں سہیلیاں بیٹھی ارد گرد سے بے خبر خوش گپیاں کر رہی تھیں، وہیں پچھلی ٹیبل پر ایک ادھیڑ عمر صاحب اکیلے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے اور ہم دونوں سہیلیوں کی گفتگو سے محظوظ بھی ہو رہے تھے۔

اچانک وہ اٹھے اور ہم دونوں کے قریب آ کر بولے:

"پیاری بیٹیوں! معاف کرنا اگر مخل نہ بنوں تو کیا کچھ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

ہم دنوں نے یک زبان ہو کر کہا:

"پوچھیے، پوچھیے، انکل!"

وہ فوراً بولے:

"معاف کرنا قریب ہونے کی وجہ سے آپ کی کچھ گفتگو میں نے بھی سنی۔ آپ دونوں سہیلیاں واقعی مبارک باد کی مستحق ہیں مگر ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ جو زبانیں آپ نے دل لگا کر سیکھی ہیں، ان کے معنی، بول چال اور تشریح بھی سیکھی ہے یا صرف بولنا اور پڑھنا ہی سیکھا ہے؟"

شگفتہ نے شرمائی آواز میں کہا:

"انکل فی الحال صرف پڑھنا اور بولنا ہی سیکھا ہے۔ لفظوں کے معنی، تشریح ابھی سیکھنا باقی ہے۔"

"اور آپ۔۔۔؟" وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

"جی انکل، میں بھی صرف عبرانی پڑھ لکھ سکتی ہوں۔ سمجھ مجھے بالکل نہیں آتی کہ کس لفظ کے معنی کیا ہیں۔"

وہ ہم دونوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ اتنے میں اذان کی آواز سنائی دی اور وہ ہم دونوں سے اجازت لے کر فوراً ریسٹورنٹ سے ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا ریسٹورنٹ خالی ہونا شروع ہو گیا۔

شگفتہ وکٹر ہیو گو کا پسندیدہ ناول "ایک انسان جو ہنس سکتا تھا" پکڑ کر انہماک سے پڑھنے لگی اور میں بھی عبرانی کی پسندیدہ کتاب "مسٹر مانی" لہک لہک کر پڑھنے لگی۔ آج پہلی بار ہم دونوں کو تحریر اصل زبان میں پڑھنے کا حقیقی لطف آ رہا تھا۔

زمین و آسمان کی فریاد

کبھی یہ گاؤں بھی ہرا بھرا تھا۔ یہاں بھی پانی اور دھان کی فراوانی تھی۔ مگر کچھ ماہ پہلے یہاں ایسا قحط آیا تھا جس نے پورے گاؤں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

پورا گاؤں بارش کی آس لیے بھوک اور پیاس کے ہاتھوں ایک ایک کر کے مرتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کب آسمان سے پانی کی بوندیں ٹپکیں گی اور غریب بھوکے پیاسے گاؤں کے باسیوں کی پیاس بجھے گی۔

آہستہ آہستہ اس گاؤں کے رہنے والے بھوکے رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ انھیں ایک وقت میں جو روکھا سوکھا ملتا، وہ اسے کھا کے ہر روز اپنی جانب بڑھتی موت کا انتظار کرتے مایوسی میں زندگی بتانے لگے تھے۔ کچھ ہفتوں سے گاؤں کے تمام کنویں بھی سوکھ چکے تھے۔ دریا اور تالاب کا دور دور تک کوئی نشان بھی باقی نہ بچا تھا۔ سانپ، بچھو، چھپکلیاں بھی پیاس کے مارے زبان باہر نکالے بارش کا انتظار کرتے ہر روز مر رہے تھے۔

اسی اداس گاؤں میں ایک جھونپڑی میں ایک لڑکی رہا کرتی تھی جس کا نام آبیہ تھا۔ آبیہ بھی بھوک اور پیاس برداشت کر کر کے سوکھ کے کانٹا بن چکی تھی مگر ہر روز وہ رات سونے سے پہلے آسمان کی طرف دیکھ کر آسمان سے پانی برسنے کی دعا کرتی مگر ہر بار اگلا دن اور گرم ہوتا اور اس کی پسلیاں بھوک اور پیاس کی شدت سے اور زیادہ چیخنے لگتیں۔

پانی کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ سوکھا آسمان، سوکھی زمین دیکھ دیکھ کر آبیہ تھک کر نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کی ماں اور باپ دن بھر جگہ جگہ خوراک اور پانی کھوجتے۔ کبھی ان کے ہاتھ مرا ہوا چوہا لگتا کبھی کوئی چھپکلی اور کبھی سانپ۔ بھیڑ، بکریاں، مرغیاں، گائے تو پچھلے سال ہی سب مر کھپ چکے تھے اور وہ سب انھیں کھا بھی چکے تھے۔ سارا گاؤں اب کسی معجزے کے انتظار میں تھا کہ شاید بارش برسے، سب کنویں بھر جائیں۔ پھر سے ان کا گاؤں ہرا بھرا ہو جائے اور انھیں دو وقت پیٹ بھر کھانا نصیب ہو سکے۔

مگر بارش کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ پچھلے سو سال میں ان کے گاؤں میں کبھی ایسا قحط نہ آیا تھا۔ اس گاؤں سے ہزاروں میل دور ایک اور گاؤں بھی تھا جس میں پچھلے پچیس دن سے موسلادھار بارش برس رہی تھی۔ پورا گاؤں زیرِ آب آ چکا تھا۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، ہر دن موت کے منہ میں جا رہے تھے۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔

اسی گاؤں میں ایک بچہ رہا کرتا تھا جس کا نام سارن تھا۔ سارن اور اس کا کنبہ بارش اور سیلاب کی زیادتی کی وجہ سے ایک ٹیلے پر بسیرا کیے ہوئے تھے۔ پچھلے سو سال میں ان کے گاؤں میں کبھی ایسا سیلاب اور بارش نہ برسی تھی۔ پورا گاؤں آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر دعائیں مانگتا تھا کہ کاش یہ بارش تھمے، یہ سیلاب اترے اور وہ اپنی زمینوں میں پھر سے اناج بو سکیں، پھر سے بیاہ شروع ہو، مگر بارش ہر روز اور تیز ہو جاتی اور پانی آہستہ آہستہ اس ٹیلے کی اونچائی تک بڑھ رہا تھا۔ جس پر سارن اور اس کا کنبہ جان بچا کر دبکے بیٹھے تھے۔ بارش کا یہ سلسلہ نہ رکا تو ایک دو روز میں ان کی موت یقینی تھی۔

گاؤں سے ہزاروں میل دور ایک پر شکوہ شہر تھا۔ وہاں کا آسمان کالے دھوئیں سے اتنا بھر چکا تھا کہ دن اور رات کا فرق ختم ہو چکا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے رات گئے تک کام کرنے کا عادی تھا۔ کچھ عرصے سے پورا شہر کھانسی کی لپیٹ میں تھا۔ ہر کوئی کھانس رہا تھا۔ کھانسی کا حملہ اتنا شدید تھا کہ ایک اونچی آواز کی طرح پورا شہر مل کر کھانستا جس سے یوں لگتا جیسے بہت سے لوگ مل کر تالیاں پیٹ رہے ہوں۔ کھانسی کی گھن گرج سے شہر کی شیشے کی کھڑکیاں ٹوٹ

گئی تھیں، مگر کھانسی کا حملہ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ہر کوئی اس عجیب کھانسی کی لپیٹ میں تھا۔ کھانسی کی ایسی وبا کا اس سے پہلے کبھی اس شہر کو سامنا نہیں ہوا تھا۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ کوئی بھی کسی سے ایک لفظ بھی کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مسلسل اور شدید کھانسی کے باعث ایک ایک کر کے شہر کے لوگ ہر روز مر رہے تھے۔ کچھ کو کھانسی کے ساتھ زندہ رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ سارا وقت کھانستے کھانستے تھوڑا بہت کھانا نگل لیتے اور کچھ پانی پی لیتے تھے۔

اسی شہر میں ایک کتا رہا کرتا تھا جس کا نام لایل تھا۔ لایل اپنے مالک کو کھانستے روز دیکھتا اور اندر ہی اندر غمزدہ ہوتا۔ ہر رات وہ بغیر ستاروں کے کالے دھویں سے بھرے آسمان کی طرف منہ کرتا اور رو کر ہر وقت اپنی مخصوص پکار بلند کرتا۔ مگر آسمان چپ تھا، کالے دھویں کی دبیز تہہ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اسی شہر سے ہزاروں میل دور ایک جنگل بھی تھا جو کسی زمانے میں ہرا بھرا جنگل ہوا کرتا تھا۔ بہت سے جانوروں، پرندوں اور حشرات کا مسکن یہ جنگل ہزاروں میل پر پھیلا ہوا تھا، اسی جنگل میں ایک ونگی نامی چمگادڑ رہا کرتی تھی جس کے پر بہت بڑے اور طاقت ور تھے۔ ونگی کا یہ ہرا بھرا جنگل کچھ عرصے سے بھیانک آگ کی لپیٹ میں تھا۔ ایسی ہولناک آگ ونگی نے تمام عمر نہ دیکھی تھی۔ ونگی کی آنکھوں کے سامنے جنگل جل رہا تھا اور آگ ہر روز کچھ میل جنگل جلا کر خاکستر کر رہی تھی۔ ونگی بے بسی سے جلتے جنگل کے اوپر اِدھر سے اُدھر اڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بے شمار معصوم جانور اور پرندے آگ کی لپیٹ میں آ کر ایک ایک کر کے مر رہے تھے۔ ونگی کی آنکھوں اور منہ میں کالا دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ ونگی اکیلی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ جنگل کو آگ میں جلتے کئی دن گزر چکے تھے۔

ہر رات ونگی آسمان پر نگاہ کرتی اور دل خراش چیخ بلند کرتی۔

اسی جنگل سے میلوں دور ایک سمندر تھا جو کبھی سمندری گھاس سے بھرا رہتا تھا۔ شفاف شیشے کی مانند سمندر کروڑوں مچھلیوں اور کیکڑوں کا گھر تھا۔ یہ دنیا میں واحد جگہ تھی جو

خوراک اور پانی سے مالا مال تھی۔ مگر کچھ عرصے سے سمندر میں کہیں سے کوئی زہریلا مادہ آگیا تھا۔ سارا سمندر تیزی سے گدلا ہوتا جارہا تھا اور مچھلیوں کی خوراک، ان کے پودے زہریلے مادے کی وجہ سے مرجھا کر مرتے جارہے تھے۔ مچھلیاں مجبوراً سمندر میں آیا کباڑ کھانے پر مجبور ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دن میں ہزاروں مچھلیوں کی لاشیں سمندر میں بکھری دکھائی دینے لگی تھیں۔ جو زندہ باقی بچی تھیں، ان مچھلیوں میں سے ایک مچھلی کا نام ادریسا تھا جو بہت معصوم اور خوبصورت مچھلی تھی۔ اس کے ماں اور باپ دونوں سمندر میں موجود زہریلا مواد کھا کر مر گئے تھے۔ ننھی ادریسا کا دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔ اس کے ارد گرد لاکھوں مچھلیوں کی لاشیں تھیں جن کے درمیان وہ تیر کر اوپر آرہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی باہر کی دنیا سے کون سمندر میں زہریلا مواد پھینک کر انھیں مارنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی تمام کوششیں بے سود ہوتیں۔ جب بھی وہ اوپر پہنچتی، سمندر کے اوپر تیل اور کچرے کی تہہ کے پار کچھ نہ دیکھ پاتی۔ تھک کر وہ واپس گہرائی میں لوٹ آتی۔

ہر رات ادریسا اوپر کی طرف منہ کر کے گریہ وزاری کرتی اور تھک کر سو جاتی مگر آسمان چپ اور کالے دبیز دھوئیں کی تہہ بڑھتی چلی جارہی تھی۔

آسمان دھوئیں کے باعث اندھا اور بہرا ہو چکا تھا۔ آبیہ، سارن، لایل، ادریسا اور ونگی کی کوئی پکار اور دعا آسمان تک نہ پہنچ پاتی۔

آبِ حیات

انٹارکٹکا آرکٹک میں تیرتی سیلز، وھیل مچھلیاں، اور وہاں موجود برفانی ریچھ اور پینگوئنز کے لیے وہ صبح کسی قیامت سے کم نہ تھی۔ درجہ حرارت بتدریج کم ہونے کا باعث اچانک ہزاروں سالوں سے جمے گلیشیر سے برف کے کئی کوس پر پھیلے بڑے تودے میں شگاف پیدا ہوا اور وہ ٹوٹ کر سمندر میں جا گرا اور گرتے ہی اس کی تہہ سے تیزاب کی طرح کا سیال مادہ ابلنے لگا۔ یہ مادہ جو لاوے کی مانند بہتا اپنی جگہ تیزی سے بناتا آگے اور آگے کی جانب بڑھنے لگا۔ جس جگہ سے بھی اس گاڑھے تیزاب کا ریلا گزرتا، وہاں موجود برف پگھل کر اسی تیزاب کی صورت اختیار کر لیتی۔ گرد و نواح میں برف کی تہہ کے نیچے موجود سیل اور وھیل مچھلیوں کے جسم چند ہی سیکنڈ میں پہلے ہڈیوں کا ڈھانچہ اور پھر راکھ میں بدلنے لگے۔

یہ انتہائی تیز اثر کا تیزاب برفانی ریچھوں اور پنگوئنز کو لمحوں میں دیکھتے ہی دیکھتے گلا کر فنا کرتا تیزی سے گہرے سمندری پانیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چند سال پہلے عالمی درجہ حرارت پر تحقیق کرنے والی علم کیمیا و ارضیات کے ماہر سائنس دانوں کی ٹیم سیمیول سائنس دان کی سربراہی میں آرکٹک کی برف کی تہ میں لاکھوں سال سے چھپی معدنیات پر اپنی تحقیق کر چکی تھی، جہاں اس شدید اثر کرنے والے تیزاب کے انتہائی کم مہلک اثرات والے برف کے کچھ نمونے سیمیول کو نظر آئے تھے اور انھیں

محفوظ کرنے کے بعد ان نمونوں پر تحقیق کی گئی۔ سیمیول نے اپنے تحقیقی مقالے میں دنیا کو مستقبل میں ہونے والے اس خطرے سے کسی حد تک آگاہ بھی کیا تھا مگر سیمیول کی عالمی درجہ حرارت میں زیادہ اضافے کے بعد اس خطے میں کیا بحران پیدا ہو سکتا ہے، اس پر کی گئی تحقیق کو عالمی برادری نے زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا اور یہ تحقیق بھی باقی تحقیقات کی طرح دب گئی تھی۔

مگر آج وہ خطرناک ترین سیال مادہ تیزاب کی صورت میں، جس کے انتہائی کم مہلک نمونے ماضی میں سیمیول کو آرکٹک میں ملے تھے، بہت بڑی مقدار میں گہرے پانیوں میں شامل ہونے کو بڑھ رہا تھا۔

انٹارکٹکا کی برف میں تباہی مچاتا ہوا یہ مہلک ترین تیزاب اپنی جگہ بناتا لاوے کی مانند مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ آرکٹک کی برف کے تہوں کے نیچے سمندر میں سیلز اور وھیل مچھلیوں کی بڑی تعداد ایک ہی دن میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ جگہ جگہ پنگوینز اور برفانی ریچھوں کی باقیات راکھ کی صورت میں بکھری پڑی تھیں۔

سیٹیلائیٹس رپوٹس کے مطابق:

لگ بھگ ایک ماہ کے عرصے میں یہ مہلک تیزاب پوری دنیا کے سمندروں میں شامل ہو سکتا تھا۔ اس تیزاب کا اثر اتنا شدید تھا کہ اس کا ایک قطرہ پانی کی وافر مقدار کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا۔

آرکٹک کی تازہ صورت حال پر عالمی طاقتوں نے فوری طور پر ایک عالمی اجلاس بلایا جہاں دنیا بھر سے مندوبین اکٹھے ہوئے۔ اس تازہ عالمی بحران سے نمٹنے کے لیے فوری اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ چونکہ ایک ماہ کا عرصہ بہت قلیل اور مختصر تھا اور اگر یہ مہلک تیزاب بحر آرکٹک، بحر الکاہل، بحر اوقیانوس اور بحر ہند میں داخل ہو گیا تو کرہ ارض کی تمام آبی حیات اگلے چند دنوں میں ختم ہو سکتی تھیں اور اس کے بعد اگلے مرحلے میں دریاؤں میں داخلے کا مطلب ہم انسانوں کے مکمل خاتمے کی صورت میں نکل سکتا تھا۔

آج سے پہلے انسانوں کو اس طرح کے کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ گو سیمیول نے کچھ سال پہلے اپنی رپورٹ میں آرکٹک میں اس سریع الاثر تیزاب کی موجودگی کا اشارہ دیا تھا، جس کے چند قطرے بہت بڑے پیمانے پر تباہی لا سکتے تھے، مگر اس وقت کی حکومت نے ان نمونوں پر تحقیق کو اگلے مرحلے میں لے جانے میں دلچسپی نہ دکھائی۔

آرکٹک کے سمندر کے قرب و جوار کے ممالک کے پانیوں میں پٹرولنگ کرتے بحریہ کے عملے کو انتہائی احتیاط کے ساتھ اس تیزاب کے شکار علاقے کے قریب سے معلومات اکٹھی کرنے کا فوری ٹاسک سونپا گیا۔ مگر جونہی ان میں سے ایک جہاز اس آفت زدہ علاقے میں داخل ہوا، جہاں تیزاب تباہی مچاتا آگے بڑھ رہا تھا، جہاز کا پیندا تیزاب سے گلنے لگا اور چند منٹوں میں ہی پورا جہاز اپنے عملے سمیت پگھل کر محلول کی صورت میں اسی تیزاب میں مل کر بہنے لگا۔

پوری دنیا کے کیمیا کے ماہر ماضی میں محفوظ کیے گئے سیمیول کے نمونوں کی بدولت اس عجیب و غریب نوعیت کے شدید تیزاب کو سمجھنے کی کوشش میں تھے جو پورے بحری جہاز کو منٹوں میں پگھلا کر محلول بنا سکتا تھا۔ اگر واقعی یہ شدید نوعیت کا تیزاب گہرے پانی میں شامل ہو گیا تو وہاں موجود تمام بحری جہاز اور کشتیاں بھی لمحوں میں اسی طرح پگھل کر تباہ ہو سکتے ہیں۔

ان حالات میں پوری دنیا کے سمندروں میں موجود بحری جہازوں کو پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ وہ جلد از جلد گہرے پانیوں سے باہر نکل جائیں اور قریبی ساحلوں پر جہازوں کو فوری طور پر لنگر انداز کر دیں۔

اس تیزاب پر واحد تحقیق جو چند سال پہلے کی گئی تھی وہ سیمیول کی ٹیم کی ہی تھی مگر اُس وقت برف کے نمونوں میں تیزاب کم مقدار میں ہونے کی وجہ سے اس خطرناک نوعیت کے تیزاب کی شدت کا ٹھیک سے اندازہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ فوری طور پر اس فیلڈ کے ماہر کیمیا دان سیمیول کی خدمات حاصل کرنے کا حکم جاری ہوا اور سیمیول کو اس اجلاس میں بلایا گیا۔

سیمیول نے تمام صورت حال سننے کے بعد سب کو یاد دلایا کہ اس نے کچھ سال پہلے اس متوقع خطرے سے سب کو پیشگی آگاہ بھی کیا تھا مگر کسی نے بھی عالمی درجہ حرارت کے بڑھنے کی صورت میں اس تیزاب سے پیدا ہونے والی تباہی کو چند سال پہلے سنجیدہ نہ لیا گیا اور آج صورت حال نا قابل یقین حد تک خطرناک صورت اختیار کر گئی۔

پوری دنیا اپنی جانب بڑھتی تباہی کی وجہ سے خوف کی لپیٹ میں تھی۔ بعض لوگ اس آفت کو خدا کا عذاب سمجھ کر عبادات میں مگن تھے۔ کچھ کے بقول ایسے واقعات ان کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں جہاں دریا کا پانی خون آلود ہو گیا اور ارد گرد کے شہر قحط کا شکار ہوئے۔

مگر سیمیول اور اس کی ٹیم ان مفروضات میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کی بجائے عملی اقدامات پر توجہ دینے کی بات کر رہی تھی۔ ان حالات میں دنیا کے پاس اس خطرے سے نمٹنے کے لیے بہت کم وقت بچا تھا، صرف عملی اقدامات کرنے کی ضرورت تھی۔ جن میں سب سے پہلے سمندری حیات کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو زندہ پکڑ کر انھیں صاف ذخیرہ شدہ پانی میں محفوظ کیا جانا تھا تا کہ جب حالات معمول پر واپس آئیں اس وقت ان مچھلیوں اور دوسری آبی حیات کے جوڑوں کو دوبارہ صاف سمندر میں چھوڑا جا سکے۔ وھیل، ڈالفن، شارک، کچھوے، جھینگے، آکٹوپس، ستارہ مچھلیوں اور دوسری تمام اقسام کی آبی حیات کو زندہ پکڑنے کے لیے مختلف بحری جہاز جو اپنے ساتھ ہر سائز کے ایکویریم لیے ہوئے تھے، دنیا کے طول و عرض کے ان سمندروں میں فوری روانہ کیے گئے جہاں تک تیزاب کے اثرات پہنچنے میں ابھی وقت لگنا تھا۔

کچھ ہی روز میں دنیا کے تمام سمندری پانی میں تیزاب کی انتہائی کم مقدار بتدریج پہنچ چکی تھی جس کے بعد تمام ممالک کی عوام کو سمندری اور ہر قسم کے دریائی پانی سے دور رہنے کی ہدایات جاری کی گئیں مگر زیادہ تر ممالک اب بھی اسے سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے۔ کچھ ممالک کی مذہبی عبادات میں پانی کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اسلامی ممالک میں پانی سے وضو کے بغیر عبادت شروع نہ کی جاتی تھی، یہودی اور نصرانی بھی پانی کو اپنی مذہبی

رسومات میں انتہائی اہمیت دیتے تھے۔ بچوں کو پانی سے بپتسمہ دیا جانا بھی بہت ضروری تھا۔ ہندو عقائد میں پانی میں ڈبکی لگائے بغیر پاپوں سے چھٹکارا ممکن نہیں تھا۔ اشنان کیے بغیر مذہبی رسومات ممکن نہیں تھیں۔

عالمی سطح پر پانی کے استعمال کو کم کرنے کے اعلان کیے جا رہے تھے مگر زیادہ تر لوگ اسے سنجیدگی سے نہیں لے رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کی آرکٹک کے سمندر سے دنیا بھر کے سمندروں میں تیزاب کی زیادہ مقدار پہنچنے میں ایک اندازے کے مطابق ابھی بیس سے پچیس دن درکار تھے۔

ہر اگلے دن سمندری پانی میں تیزاب کی مقدار بڑھ رہی تھی۔ مچھیوں اور دیگر آبی حیات کی اموات ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔

پینے کے پانی کا واحد ذریعہ زمین کی تہہ سے نکالا جانے والا پانی رہ گیا تھا جس میں تاحال تیزاب نہیں پہنچ سکا تھا مگر گزشتہ چند دنوں بڑی مقدار میں ہینڈ پمپ لگانے سے اس ذخیرے میں بھی تیزی سے کمی ہو رہی تھی۔

کچھ ممالک اب بھی سمندری اور دریائی پانی میں ڈبکی لگا کر توبہ استغفار اور پرائسچت کرنے پر زور دے رہے تھے۔ کچھ وضو کی اہمیت پر روشنی ڈال کر اس معاملے کا رخ بدل رہے تھے جبکہ کچھ بے وقوف ماضی میں ہوئے کسی دیومالائی مصری واقعے کے ساتھ حالیہ بحران کو جوڑ کر موجودہ حالات کو خدائی عذاب بنانے پر زبردستی تلے ہوئے تھے۔

اس دوران سیمیول کی ٹیم نے دن رات ان تھک محنت کے بعد اس تیزاب کی گتھی کسی حد تک سلجھالی تھی۔ سیمیول نے پریس کانفرنس کی جس میں اس کے بقول لاکھوں سال پہلے جب پنجیہ کا حصہ زمین سے الگ ہوا اور زمین برف کے دور میں داخل ہو رہی تھی، اس وقت سے پہلے زمین پر دوسرے سیاروں سے آسمانی شہابیے گرنے کے واقعات عام ہوا کرتے تھے۔ یہ خطرناک محلول اسی دور میں کسی شہابیے کے ساتھ زمین پر پہنچا تھا اور کچھ عرصے میں ماحولیاتی تبدیلی کے باعث لمبے عرصے کے لیے برف کے نیچے جم گیا اور آج پھر سے سیال کی

صورت میں بہنے لگا۔

سیمیول کی تحقیقات کے مطابق اس سیال نما تیزاب کی قریب ترین مماثلت وینس سیارے سے اکٹھی کیے گئے جمادات و پتھروں میں بھی موجود ہے۔ جو آج بھی وہاں وافر مقدار میں موجود ہے۔ یقیناً یہ تیزاب کسی شہابیے کی صورت میں لاکھوں سال پہلے وینس یا اس جیسے کسی سیارے سے شہابیے کے ساتھ زمین پر گرا اور اس کے کچھ ہی عرصے میں زمین برفانی دور میں داخل ہو گئی اور یہ خطرناک تیزاب لمبے عرصے کے لیے برف کے نیچے دب کر جم گیا۔ اب جب کرہ ارض میں ہر سال تیزی سے درجہ حرارت بڑھ رہا ہے، اس قسم کے خطرناک محلول اور مرکبات جو برف کے دور سے پہلے شہابیوں کی صورت میں زمین پر گرتے تھے، برف کی تہوں کے نیچے سے مستقبل میں زیادہ نکلنے کا امکان بڑھ گیا ہے۔

کانفرنس کے آخر میں سیمیول نے سب کو یہ حوصلہ بھی دیا کہ وہ اور اس کی ٹیم جلد ہی اس خطرناک تیزاب کے اثر زائل کرنے والے عناصر اور مرکبات کے ابتدائی طور پر بہت امید افزا نتائج جلد ہی دنیا کے سامنے لائیں گے۔

اس حوصلہ افزا خبر سے دنیا میں ایک امید کی کرن پیدا ہوئی اور یہ بھی ثابت ہوا کہ انسان صرف سائنس اور عقل و شعور کی مدد سے ہی ان آفات کا مقابلہ کر سکتا ہے نہ کہ ٹونے ٹوٹکوں یا منتروں سے۔

مگر اب بھی کچھ ممالک میں موجود نوسر باز ٹوٹکوں پر لگا کر سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنا رہے تھے۔ کچھ نیم حکیموں نے عقل سے اندھے لوگوں کو کلونجی کو تیزاب ملے پانی میں کچھ دیر بھگو کر پانی کو استعمال کرنے کا آسان نسخہ بتا دیا تھا اور لوگ آنکھیں بند کیے اس پر عمل کر رہے تھے۔

جبکہ کچھ نے پانی پر مخصوص ورد پڑھنے کے بعد اس کو پی لینے کی احمقانہ اجازت دے دی تھی۔

کچھ نے سلیب کو پانی میں بھگو کر پانی کو استعمال کرنے کا اپنے تئیں عقلی حل تجویز کر

دیا تھا۔

جبکہ کچھ سادھوؤں نے اس زہریلے تیزابی پانی میں تلسی کے پھول شو کی مورتی کے ساتھ ڈبونے کے بعد پانی پینے کا حل بتانا شروع کر دیا تھا۔

ایک جعلی آیورویدہ ماہر سادھو نے تو ناگ دیوتا کا جھوٹا دودھ تیزاب والے مضر صحت پانی میں ملا کر استعمال کرنے کی کھلی اجازت بھی دے دی تھی۔

ایک ننگ دھڑنگ رشی منی گرو نے گائے کا پیشاب پانی میں ڈال کر تیزاب کا توڑ نکال دیا تھا۔

جبکہ ایک عالم دین نے کھجور کی گٹھلی اونٹ کے پیشاب میں کچھ دیر بھگو کر تیزاب والے پانی میں رکھ کر ہر قسم کے تیزاب کے اثر سے محفوظ رہنے کا پروانہ جاری کیا تھا۔

ایک پیٹو مولانا نے سمندروں میں متبرک چشمے کے پانی کے قطرے ڈال کر سمندروں کو ہمیشہ کے لیے پاک صاف کرنے کا واحد راستہ تجویز کیا جس پر زور و شور سے عمل بھی کیا جانے لگا۔

ایک سفید عمامے والے باریش سپریم لیڈر نے خاص متبرک مقام کی مٹی کی ٹکیاں بنا کر پانی میں ملا کر تیزابی پانی کا اثر زایل کر کے پینے کا اکسیر نسخہ ڈھونڈھ نکالا جس پر لوگ رورو کر دھڑا دھڑ عمل کرنے لگے۔

ایک سر پر صبح شام کلہ پگڑی ڈالے شیروانی پہنے منہ ہی منہ میں سے بڑبڑانے والے پرنور مسیحا نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قائد اعظم کیپ پہنا کر پانی سے صبح شام غرارے کرنے کا حکم جاری کیا اور سب کو بتایا کہ اس تیزابی پانی کی پیشین گوئی ان کے لکڑ دادا بتا کر دنیا سے گئے تھے اور اس کا شرطیہ علاج بھی صرف اور صرف انھی کے پاس ہے۔

علاج صرف یہ ہے کہ ہر گھر اپنا ایک بچہ ان کے حوالے کرے، وہ ان بچوں کو قائد اعظم کیپ پہنا کر روزانہ اپنے لکڑ دادا کی پیشین گوئیاں یاد کرائیں گے اور ان بچوں سے نہار منہ غرارے کروایں گے اور وہ متبرک غرارے والا پانی تیزابی پانی میں ملا کر سب خاص و عام

استعمال کریں جس سے پانی اور جسم کی تیزابیت دونوں فوری ختم ہو جائیں گی۔

ایک نیم حکیم کائیاں حضرت تھے، انھوں نے سنہری موقع دیکھتے ہوئے ساگو دانے کو تیزابی پانی میں ڈال کر قبض کشا گولی ایجاد کرنے میں پہل دکھائی اور مستقل قبض کے مریضوں کا علاج شروع کر دیا۔ لوگ صبح شام ان کی گولیاں کھانے لگے۔

ایک دائمی بواسیر سے تنگ مریض نے تنگ آکر تیزابی پانی سے طہارت کی تکلیف سے سد باب کا سوچا اور سب احباب کو لوٹے میں پہاڑی نمک کی ڈلی رکھنے کا مشورہ دیا جس سے جن لوگوں کو بواسیر نہیں بھی تھی، انھیں بھی شکایت ہونے لگی۔

ایک اور لمبی داڑھی والے مفتی اعظم نے اپنے چار منزلہ مکان کی چھت پر چڑھ کر اپنی موٹے عدسوں کی عینک پہن کر اعلان کیا کہ اگر ان کی بتائی ہوئی صحیح چاند کی تاریخ اور ان کے بتائے ہوئے صحیح غروب آفتاب کے مطابق اس تیزاب والے سمندری پانی کو کھلے آسمان کے نیچے رکھا جائے تو تیزاب ایک ہی گھنٹے میں ہوا میں غائب ہو جائے گا اور پیچھے شرطیہ صرف صاف، میٹھا، شفاف، پینے کا پانی بچے گا۔

ایک اور زندگی سے تنگ چودہ طبق روشن شکل کے مہندی داڑھی پر لگائے مولوی صاحب نے اپنے چینل پر سب کو یہ تاکید کی کہ سب دیندار افراد گھر کے سب برتنوں کے پیندے کو ہرا رنگ کریں اور پھر اس تیزابی پانی کو اس ہرے پیندے والے برتن میں ڈھک کر مخصوص سمت میں رات بھر پڑا رہنے دیں۔ صبح صادق تک پانی میں سے تمام زہریلے عناصر غائب ہو جائیں گے اور ان کی جگہ الٹا پانی میں شیرینی و مٹھاس پیدا ہو جائے گی۔ جس کے بعد لوگوں نے بغیر سوچے برتنوں پر سبز رنگ رنگنا شروع کر دیا، حتیٰ کے کچھ امیر سر پھرے لوگوں نے آرڈر پر سبز رنگ کے ریفریجریٹر بنوا ڈالے اور ان میں سبز رنگ کی بوتلوں میں پانی ذخیرہ کر کے ٹھنڈا کرنا شروع کر دیا۔ مگر اس پریکٹس کا ڈراپ سین تب ہوا جب ایک فریج میں سے گرم بھاپ نکلنے کے واقعات دیکھنے میں آئے جس کے بعد ایک نئے شادی شدہ جوڑے کے فلیٹ میں زوردار آواز سے فریج پھٹنے کا دل خراش واقعہ رپورٹ ہوا۔

ایک اور جل ترنگ ملک کے باریش سربراہ نے زرد رنگ کی دھوتی پہن کر یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا کہ یہ تیزاب پانچ ہزار سال پہلے ان ہی کے ملک کے ایک کیمیا دان نے اشوکا لیب میں بنایا تھا اور دنیا کے پہلے ہوائی جہاز میں ان ہی کے ملک کے پسو داس نامی سائنس دان بقلم خود اس تیزاب کو اشار کنکا کی گھپاؤں میں ایک تجربے کی نیت سے چھپا کر رکھ کر آئے تھے۔ ان کے بقول اس تیزاب کا رفع کرنے کا واحد علاج یہ ہے کے ہر ذی روح شخص ایک ٹانگ پر کھڑا ہو ماتھے پر ہر صورت زرد رنگ کا تلک لگائے۔ اور صرف اور صرف تلک لگانے والے کو ہی تیزاب کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ اس اعلان کے بعد اکثر عقل سے پیدل لوگوں نے کوٹ دھوتی پہن کے ماتھے پر زرد تلک لگا کر لیپ ٹاپ پکڑے دفتر جانا شروع کر دیا اور وہ موصوف خود بھی زردی مائل تلک لگا کر اپنی داڑھی اور بڑھانے میں جت گئے۔ ایک دن تیزابی پانی سے سب کا خوف اتارنے کے لیے چڑ کر انھوں نے ایک کھلی کچہری کا اہتمام کیا جس میں انھوں نے تلک لگا کر تیزاب والے پانی سے سب کے سامنے قومی لباس دھوتی پہن کر اشنان کرنے کا پروگرام ترتیب دیا جسے قومی ٹیلی وژن پر براہ راست نشر کیا گیا۔ مگر اشنان کے اگلے ہی گھنٹے ان کی جلد جگہ جگہ سے خراب ہونا شروع ہو گئی اور داڑھی اور سر کے بال سب تیزاب کے اثر سے جھڑ کر فوراً گر گئے۔ اس ہزیمت سے بچنے کے لیے اگلے دن مجبوراً انھیں یہ اعلان کرنا پڑا کہ انھوں نے خود یہ بھکشوؤں والا حلیہ بنایا ہے تاکہ پوجا پاٹ میں یک سوئی پیدا ہو سکے۔

ملتی جلتی صورت حال ایک اور ملک کے بادشاہ کے ساتھ بھی پیش آئی جہاں انھوں نے مقدس چشمے کے پانی کو تیزاب والے پانی کے ساتھ ملا کر استعمال کرنے کا غیر عقلی تجربہ کیا اور الٹا ان کی ٹھوڑی کی برائے نام داڑھی اور کھچڑی بال بھی سب ایک گھنٹے میں ہی صفا چٹ ہو گئی۔ اس خجالت سے بچنے کے لیے ان کے لیے فلپائن سے خاص آرڈر دے کر ان کے چوکھٹے کے سائز کی منی وگ داڑھی امپورٹ کی گئی جسے وہ مجبوراً ٹیپ سے چپکا کر پہننے لگے۔

ایک اور مسکین ملک کے سربراہ نے سمندری تیزابی پانی سے اپنے پیر بابا کی درگاہ کا

غسل کرنے کا حکم نامہ جاری کیا جن کے وہ اور ان کی زوجہ پیدائشی مرید تھے۔ مزار کے غسل کے دوران وہ خود بھی وہاں پہنچ گئے اور درگاہ کے باہر تین گھنٹے تک قبر پر سجدے میں گڑگڑا کر تیزاب کے اثر زائل ہونے کا استغاثہ بلند کرتے رہے اور ساتھ ساتھ لوٹے سے مزار کو دھوتے بھی جاتے۔ ارد گرد عوام الناس نے جب تیزاب کے پانی سے دھلنے کے بعد قبر کے تعویذ کا سنگ مرمر لش کرتا چمکتا دمکتا دیکھا تو پیر بابا صاحب کی حقانیت پر ان سمیت سب کا یقین اور پختہ ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام مقبروں، مزاروں، امام باڑوں، خانقاہوں کے متولی، مخدوم، مؤذن تیزاب والے پانی سے سنگ مرمر کی قبروں کی دھلائی کرنے میں جت گئے۔ تیزاب سے دھلائی کے بعد چمچماتی قبروں کے معجزات دیکھنے کے بعد لوگوں کا پیروں فقیروں مخدوموں پر یقین اور پختہ ہونے لگا۔ لیکن اس احمقانہ پریکٹس کا ڈراپ سین تب ہوا جب مشہور پیر بابا گلاب والے کی قبر مبارک تیزاب کے پانی کی وجہ سے چیخ کر دو حصوں میں ٹوٹ کر شہید ہو گئی اور نیچے سے پیر صاحب کا نورانی ڈھانچہ بری حالت میں نظر آنے لگا۔ جبکہ ان پیر صاحب کے بارے میں خاص و عام میں مشہور بھی تھا اور بے شمار لوگ خود آپ کی خواب میں زیارت بھی کر چکے تھے، تمام مقلدین و مریدین سب کو یقین محکم تھا کہ پیر بابا کی لحد میں تازہ گلاب آج بھی خوشبو دے رہے ہیں۔ مگر تازہ صورت حال نے پیر بابا کے اگلے ہفتے ہونے والے عرس کے پروگرام کا ستیاناس کر دیا۔

دوسری طرف ایک دور دراز کے ملک کے مچھڑ پادری نے اس تیزابی پانی کے عذاب اور نحوست سے نکلنے کا واحد حل تیزابی پانی چھڑک کر کتابوں کو نظر آتش کرنا بتایا مگر عین وقت پر جب وہ کتاب نظر آتش کرنے لگے، موصوف کو پولیس نے حراست میں لے لیا اور اسی تیزابی پانی سے جوتے بھگو کر ان ہی کی کچھ دن جیل میں چھترول کی۔

ایک اور قبضہ گروپ کے سرغنہ سربراہ مملکت نے صبح الٹے استرے کی شیو کرنے کے فوراً بعد اعلان کیا کہ اگر ان کی منصوبہ بندی کے مطابق ہیکل اور نئی بستیوں کی تعمیر و توسیع وقت پر ہو جاتی تو یہ عذاب الٰہی کبھی نہ آتا۔

ایک اور 'جہادی' تنظیم کے سپہ سالار نے حالیہ تیزابی پانی کی مصیبت کا ذمہ دار جہاد سے دوری کو قرار دیا۔ اس نے اپنے جوانوں کو حکم دیا، بغیر جگہ دیکھے ہمسایہ ملک کے گھروں میں سوئے ہوئے لوگوں پر اور کھلے سمندر پر تین چار سو میزائل برسائے جائیں سوائے اس کے اس مصیبت سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ ان کے کہنے پر بچے بوڑھے خواتین سب اس کام میں جت گئے۔ مگر یہ سلسلہ تب رکا جب ایک دو میزائل ان کے اپنے ہی گھر میں پھٹ گئے۔

ایک اور گولڈن بالوں والے ریٹائرڈ بڈھے صدر نے، جو ہر روز بیس پچیس تیتر ہوا میں اچھال کر مارے بغیر ناشتہ نہیں کرتے تھے، اعلان کیا اگر زمین میں سے سارے کا سارا تیل کھینچ کر ان کے گودام میں ذخیرہ کر لیا گیا ہوتا تو تیزابی سیال مادہ کبھی سمندروں تک نہ پہنچتا اور تجویز دی کہ اب بھی وقت ہے، سارا تیل جلد از جلد نکال کر اکٹھا کر لیا جائے۔ ان کے مشورے کے بعد تیل زیادہ نکالنے کے عمل کو اور تیز کر دیا گیا مگر ان کے تمام مشوروں پر عمل کرنے کے باوجود تیزاب کی شرح پانی میں بڑھتی ہی رہی۔

اوپر تلے اس قسم کے دل خراش واقعات نے دنیا بھر کے عوام کے ذہنوں کو جھنجوڑا، سب سادہ لوح انسانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی اور کچھ ہی دن میں سب نقلی پیروں، سادھوؤں، پادریوں، ربیوں اور سیاست دانوں پر اعتقاد و اعتماد کم ہوتا گیا۔

زیادہ تر لوگ ان ٹونکوں اور دقیانوسی خیالات اور خود غرضانہ سیاسی فیصلوں کا برا اور الم ناک انجام اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ چکے تھے اور اب زیادہ تر لوگوں پر اس قسم کے تمام نیم حکیموں، جعلی پیشواؤں، ڈھونگی پنڈتوں، کھڑوس ملاؤں، نقلی پادریوں، جھوٹے ربیوں، بد دیانت سیاست دانوں کی قلعی مکمل طور پر کھل چکی تھی۔ دنیا بھر کے انسان اب اسی انتظار میں تھے کہ کب اس تیزاب کا کوئی ایسا سائنسی عقلی توڑ سامنے آئے جو حقیقی طور پر سائنسی و عقلی بنیادوں پر تسلیم شدہ ہو۔

تقریباً ایک ہفتے بعد سائنس دان سیمیول نے ایک لائیو پریس کانفرنس میں یہ خوش خبری سب کو سنائی کہ اس کی ٹیم نے بالآخر انتھک محنت کے بعد ایک ایسا محلول بنا لیا ہے جسے

گہرے سمندر میں شامل کرنے کے بعد تیزاب کا اثر کچھ ہی دن میں ختم ہو کر مکمل زائل ہو جائے گا اور پھر آبی حیات کو دوبارہ سمندر میں واپس بھیجا جا سکے گا اور تمام بنی نوع انسان بھی پانی کو بغیر کسی خوف کے استعمال کر پائیں گے۔

سیمیول اور اس کی ٹیم اس عظیم کامیابی کے بعد حقیقی معنوں میں مبارک باد کی مستحق تھی۔ دنیا بھر سے انھیں مبارک اور نیک تمناؤں کے پیغامات بھی آنے لگے۔ اگلے چند ہی دن میں ہوائی جہازوں اور دوسرے فضائی ڈرون کے ذریعے اس محلول کو انٹارکٹکا سمیت دنیا کے تمام سمندروں میں چھڑکا گیا، جس کے اثرات بہت جلد سامنے آنے لگے۔ پانی کا رنگ بدلنے لگا اور سمندر کی نیلاہٹ پھر سے محسوس ہونے لگی۔ ان کامیاب نتائج کے بعد ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ ہر کوئی اس عظیم کامیابی پر دل سے خوش تھا۔

وہ تمام ممالک جو ٹوٹکوں اور من گھڑت قصوں پر انحصار کرتے ہوئے اس آفت کا مقابلہ کرتے ہوئے شرمندہ ہوئے تھے، انھیں بھی اپنی حماقت کا کچھ کچھ اندازہ ہوا اور ان سب نے بھی آئندہ سے ٹوٹکوں، وردوں اور غیر عقلی طریقوں سے علاج نہ کرنے کا عہد کیا۔

کچھ ہی دن میں دنیا بھر کے سمندروں، دریاؤں، جھیلوں سے حفاظت کے لیے اکٹھی کی گئی زندہ آبی حیات کو سمندروں میں دوبارہ چھوڑنے کے عمل کا آغاز ہوا۔

سمندروں میں ڈالفن رقص کرتے ہوئے ادھر سے ادھر خوشی سے ناچ کر انسانوں کا شکریہ ادا کر رہی تھیں، ایک وھیل کی آنکھوں میں موٹے موٹے خوشی کے آنسو تھے، کچھوے اپنی گردن اوپر سے نیچے کر کے انسانوں کے شکر گزار تھے کہ ان کی بدولت انھیں دوسری زندگی ملی۔ پنگوئین برف کی چٹانوں پر چڑھ کر گردن اونچی کیے خوشی کے گیت گانے لگے۔

سیل اور برفانی ریچھ بھی گلے مل کر مسرت کے نغمے گاتے نظر آئے۔

چھوٹی بڑی مختلف رنگوں کی مچھلیاں نیلے پانیوں میں مل کر رقص کرتی نظر آئیں۔

آج ہر کوئی خوش تھا۔۔۔ سمندری بگلے، پیلکن، مرغابیاں نہ جانے کتنے روز سے خالی

سمندر پر پرواز کر کر کے مایوس ہو چلی تھیں، آج سب مچھلیوں کو پھر سے اپنے گھر سمندر میں واپس آتے دیکھ کر ان کی خوشی بھی دیدنی تھی۔

آکٹوپس، ستارہ مچھلیوں کے گلے لگ کر ان کے حال پوچھتی نظر آئیں۔ جھینگے بھی ادھر سے ادھر اچھلتے نظر آرہے تھے۔

دنیا بھر کے سربراہانِ مملکت، وزرا، بادشاہ و ملکائیں سمندری حیات کی سمندر میں واپسی کو لائیو دیکھ رہی تھیں۔ سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

اگلے دن تمام ممالک نے عہد کیا کہ آج کے بعد وہ عالمی درجہ حرارت کو کنٹرول میں رکھنے کے عملی اقدامات کریں گے اور آئندہ دس سال میں یہ دنیا ایک بدلی ہوئی دنیا نظر آئے گی، جو آج کی دنیا سے زیادہ بہتر ہوگی، پرامن ہوگی۔ جس دنیا میں ہر انسان، چرند، پرند، آبی حیات اور حشرات الارض کا بھی خیال رکھا جائے گا۔

اگلی صبح واقعی الگ ہی دنیا تھی۔ سیمیول سوئٹزر لینڈ میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ پہاڑی پر موجود اپنے ولا سے نیچے جھیل کا نظارہ کر رہا تھا، جہاں گاہے بگاہے سیلمون مچھلیاں پانی میں اچھل اچھل کر کھیل کود رہی تھیں۔

جدیدیت

کسی گاؤں میں خاور نامی لڑکا رہا کرتا تھا۔ خاور زیادہ وقت بستی سے دور گاؤں سے بالکل باہر چبوترے پر حکایات سنا کرتا۔ خاور کے اباجان اس کی اس عادت سے بہت تنگ تھے۔ جب بھی خاور گھر لوٹتا، اس کو خوب ڈانٹ سننے کو ملتی۔ وہ اسے ہمیشہ یہی کہتے، ایسی حکایات سن کر اس کا دماغ خراب ہو جائے گا مگر خاور کو ایسے قصے کہانیوں اور حکایات میں بڑا لطف آتا تھا۔

زمانہ یونہی گزر گیا اور خاور بڑا ہو گیا۔ اب اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس کا ایک بیٹا ہوا، جس کا نام جاور تھا۔ خاور جاور کو اپنے ساتھ ہمیشہ گاؤں سے باہر ڈیرے پر اس چبوترے پر لے جایا کرتا جہاں بچپن سے حکایات اور قصے کہانیاں سنتا آیا تھا اور آج بھی وہ سنائی جاتی تھیں۔ جاور کو خاور کی نسبت وہاں بیٹھ کر ہمیشہ کے سنے سنائے قصے سن کر بوریت ہونے لگتی تھی۔ انھی دنوں گاؤں میں نیا نیا ریڈیو آگیا۔ جاور کے ایک دوست نے ایک دن جاور کو ریڈیو پر کچھ گانے اور پروگرام سنائے۔ جاور انھیں سن کر بے حد متاثر ہوا۔ اب اس کا معمول بن گیا، جب اس کا باپ اسے گاؤں سے باہر ڈیرے پر قصے کہانیاں سننے کے لیے بھیجتا، وہ وہاں جانے کی بجائے سیدھا اپنے دوست کے پاس پہنچ جاتا اور دونوں گھنٹوں من پسند ریڈیو پروگرام سنتے۔ خاور کو ایک دن اس کی بھنک مل گئی کہ جاور چھپ چھپ کر ریڈیو سنتا ہے اور ریڈیو پروگرام اس کے سر پر بری طرح سوار ہو چکے ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے پر سختی کرنی

شروع کردی اور اسے بتایا کہ اسے اس بری اور بے حیا شیطانی مشین سے دور رہنا ہوگا ورنہ وہ اس کا گھر سے نکلنا ہی مکمل بند کر دے گا۔ جاور کے دل و دماغ میں ریڈیو بری طرح سوار تھا اسے گاؤں کے چبوترے پر ہزاروں بار سنے ایک ہی جیسے قصوں سے سخت چڑ ہو چکی تھی مگر اس کا باپ خاور اسے مجبور کرتا کہ اسے وہی سننا ہے اور ریڈیو جیسی واہیات مشین سے ہر حال میں دور رہنا ہے۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ جاور چھپ چھپا کر کبھی کبھار ریڈیو سن لیتا۔ کچھ عرصے بعد جاور کے باپ خاور کا ہیضے سے انتقال ہو گیا اور جاور نے کچھ سال بعد شادی کر لی اور شہر جا بسا۔ جاور کے ایک بیٹا پیدا ہوا دلاور۔ جاور نے گھر میں ریڈیو لا رکھا تھا جس پر وہ دن بھر دلچسپ ٹرانسمیشن سنتا اور اس میں جب بچوں کے اور دینی پروگرام آتے وہ بڑے شوق سے اپنے بیٹے کو سناتا۔ انھی دنوں دلاور کے ایک دوست کے ابا سٹیج آرٹسٹ تھے، ایک دن دلاور اپنے دوست کے ساتھ سٹیج ڈرامہ دیکھنے گیا۔ اسے وہ سٹیج ڈرامہ بہت بھلا لگا۔ اب جب بھی اس کے دوست کے ابا کا کوئی ڈرامہ تھیٹر میں چلتا، دلاور ضرور دیکھنے جاتا۔ اسے لاؤڈ سپیکر پر اداکاروں کی آوازیں اور فنکاری بہت بھلی لگتی۔ تین چار بار دیکھنے سے ہی دلاور اس تھیٹر کا دیوانہ بن گیا تھا۔ اس کے باپ کو جب اپنے بیٹے کی اس نئی سرگرمی کا پتا لگا تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے اسے سمجھایا کہ یہ لاؤڈ سپیکر اور یہ تھیٹر شیطانی کام ہیں، اسے ان سے دور رہنا ہوگا۔ وہ گھر پر آرام سے ریڈیو سنا کرے جس پر بے انتہا اچھے اور معلوماتی پروگرام آتے ہیں۔ وہ انھیں سنے تو اس کا علم یقیناً بڑھے گا۔ اس نے دلاور کو بتایا کہ وہ اس فضول عادت میں پڑ کر اپنی زندگی خراب کر رہا ہے۔ مگر تھیٹر دلاور کے دل و دماغ میں بری طرح سوار ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت اسی کے خواب دیکھتا۔ جاور اسے بہت سمجھاتا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ کچھ عرصہ بعد دلاور کا باپ جاور ٹی بی کے مرض سے چل بسا۔ دلاور نے کچھ عرصے بعد ایک سٹیج آرٹسٹ لڑکی سے شادی کر لی اور دونوں نے مل کر اپنی سٹیج نوٹنکی کمپنی کھول لی اور جگہ جگہ جا کر سٹیج پروگرام کرنے لگے۔

دلاور کا آگے چل کر ایک بیٹا ہوا جس کا نام اس نے جناور رکھا۔ جناور شروع سے ہی تھوڑا منہ پھٹ اور ضدی قسم کا بچہ تھا۔ اسے سٹیج ڈراموں سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ دلاور بہت کوشش کرتا کہ اس کا بیٹا سٹیج کی رمزوں کو سمجھے اور اس کے بعد سٹیج کو آگے لے کر جائے مگر جناور کو اس فیلڈ میں ذرہ برابر بھی دل چسپی نہ تھی۔

انھی دنوں جناور کے ایک دوست کے پاس نیا نیا ٹی وی سیٹ آیا تھا۔ جناور نے جب زندگی میں پہلی بار جیتے جاگتے، چلتے بولتے لوگ ٹی وی سکرین پر دیکھے تو وہ بے حد متاثر ہوا۔ اسے بہت حیرت ہوئی، اس کا باپ اور ماں کتنے فضول کام میں لگے ہوئے ہیں حالانکہ ٹی وی سے بہترین اور کیا کام ہو سکتا ہے۔ جناور نے اپنے باپ کو بتایا، "ابو جی، آپ کس بے کار کام میں لگے ہیں، دنیا بدل رہی ہے۔ آگے ٹی وی کا زمانہ ہے۔ آپ اس کام کو چھوڑیں اور ٹی وی اور سینما میں قسمت آزمائی کریں۔" اس کے باپ نے اسے سمجھایا: "بیٹے جناور، ٹی وی سینما اوپر والے کا عذاب ہے۔ ان سے دور رہو، ان کے کبھی قریب بھی نہ پھٹکو۔"

جناور اپنے باپ کی بات پر کھلکھلا کر ہنسا۔

زمانہ یونہی گزرتا گیا۔ دلاور کو ایک دن دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ جناور نے بھی کچھ عرصے بعد ایک لڑکی کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہنا شروع کر دیا جہاں انھوں نے ایک بیس انچ کا ٹی وی سیٹ بھی لا کے رکھ لیا۔ دونوں زیادہ وقت ٹی وی دیکھتے رہتے۔ اس دوران ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی، دلاری۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد دونوں نے شادی کر لی۔ جناور اپنی چھوٹی سی بیٹی کو سارا وقت ٹی وی کے پروگرام دکھاتا رہتا جنھیں دیکھ دیکھ کر دلاری آہستہ آہستہ بڑی ہو رہی تھی مگر وہ ایک ہی جیسے پروگرام دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئی تھی۔ ایک دن کہنے لگی۔ "پاپا آپ یہ کیا بور چینل ہر وقت دکھاتے رہتے ہیں۔ ہر وقت ایک جیسی باتیں کرتے رہتے ہیں ان ڈراموں میں، اوپر سے اس فضول بڑے سے ڈبے میں ایک ہی جیسے اشتہار بھی چلتے ہیں، ایک ہی جیسے ایکٹر اور ایکٹریسز ہیں۔ مجھے نہیں دیکھنا یہ سب۔"

جناور کو بڑی حیرت ہوئی۔ اتنا اچھا ٹی وی سیٹ، اتنے اچھے سب ڈرامے اور پروگرام

ہیں، پھر بھی دلاری کو پسند نہیں آ رہے۔

جناور نے کہا: ”گڑیا بیٹی، یہ بہت ہی اچھے ڈرامے ہیں۔ تم انھیں باقاعدگی سے دیکھا کرو۔“

دور بدل رہا تھا۔ دلاری کی ایک سہیلی کے پاس نئی نئی کیبل لگی تھی جس پر دور دیسوں کے دل چسپ پروگرام آتے تھے۔ دلاری نے جب وہ دل چسپ پروگرام، ڈرامے، اشتہار وغیرہ دیکھے تو اس کی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی۔ گھر آتے ہی اپنی ماں اور باپ سے کہا:

”یہ آپ کیا فرسودہ ایک ہی چینل دیکھ دیکھ کر اپنا وقت خراب کر رہے ہیں۔ کیبل لگوائیں، کیبل۔“

”کیبل؟“ جناور نے غصے سے کہا۔

”کہاں سے پتا لگا تمھیں اس بے حیا چیز کا؟“

”بے حیا چیز؟“

دلاری نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

”ہاں بیٹی، کیبل پر فحش اور بے ہودہ پروگرام آتے ہیں جو انتہائی برے اور اخلاق باختہ ہوتے ہیں۔“

”مگر میں تو بہت ہی اچھے اور معیاری پروگرام دیکھ کر آئی ہوں پاپا۔“

دلاری نے کہا۔

”کیا تم کیبل دیکھ کر آ رہی ہو؟ خبردار جو آیندہ گھر سے باہر کبھی قدم بھی نکالا۔“

جناور نے غصے سے کہا۔

دلاری اس واقعے کے بعد بس اب کبھی کبھار چپکے سے اپنی سہیلی کے پاس اپنے من پسند پروگرام دیکھ لیا کرتی۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ دلاری کا باپ جناور کثرت سگریٹ نوشی سے کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور ایک روز اسی بیماری کے ہاتھوں مر گیا۔

کچھ سال بعد دلاری کی بھی شادی ہو گئی۔ اس نے سب سے پہلے گھر میں کیبل لگوائی اور اس پر سارا دن اپنے من پسند ڈرامے، کوکنگ کلاسز اور چترہار دیکھنے لگی۔ کچھ عرصے بعد دلاری کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اس نے نئے دور کے حساب سے وائی فائی رکھا۔ وائی فائی بچپن سے ہی بہت ہونہار اور لائق بچہ تھا۔ ہر وقت پڑھائی میں مگن رہتا۔ حساب کتاب میں اس کی خاص دل چسپی تھی۔ اسے اپنی ماں کے ہر وقت کیبل دیکھنے سے بہت کوفت ہوتی۔ اس کی ماں اسے بتاتی، وہ صرف معلوماتی پروگرام دیکھتی ہے بس یا کھانے پکانے کی ترکیبیں۔

ان دنوں نیا نیا کمپیوٹر مارکیٹ میں آیا۔ وائی فائی نے ضد کی کہ اسے بھی کمپیوٹر لے کے دیا جائے۔ دلاری اور اس کے میاں نے بیٹے کو سمجھایا کہ حساب کتاب کے لیے رجسٹر بہی کھاتے بہترین ہیں، اس فضول مشین کو لے کر صرف روپوں کا نقصان ہو گا مگر وائی فائی بضد رہا کہ اسے کسی بھی حال میں کمپیوٹر لینا ہے۔ اس کے باپ نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور اڑ گیا کہ نہیں لے کے دوں گا، نہیں لے کے دوں گا یہ فضول چیز۔ جب رجسٹر ہیں، قلم ہے، تو اس کا کیا کام۔ وائی فائی نے اپنے والدین کو سمجھایا اور بولا:

"ممی، ڈیڈی! آپ پرانے خیالات کے ہیں جو صرف ٹی وی اور کیبل کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ دنیا میں اب کمپیوٹر کی قدر ہے۔"

مگر اس کے والدین ٹس سے مس نہ ہوئے۔

وائی فائی نے بھی غصے میں گھر چھوڑ دیا اور کچھ عرصے بعد پردیس چلا گیا۔ وہاں اسے کمپیوٹر کی فیلڈ میں اچھی نوکری مل گئی۔

زمانہ گزرتا گیا۔ وائی فائی نے وہیں شادی کر لی جس سے اس کا ایک بیٹا پیدا ہوا، ون جی! ون جی بہت ہی ذہین بچہ تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی اس نے کمپیوٹر میں مہارت حاصل کر لی اور سارا دن کمپیوٹر پر مختلف پروگرام بناتا رہتا۔ وہ اپنے بیٹے کی کارکردگی سے بہت خوش تھا مگر ایک دن اچانک ون جی اسکول سے گھر آیا اور ضد کرنے لگا کہ اسے سمارٹ فون خرید کے دیا جائے۔ وائی فائی نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ کمپیوٹر کے ہوتے ہوئے اسے اس فضول چیز کی کیا

ضرورت ہے مگر وائی فائی کے دل و دماغ میں موبائل فون کا بھوت سوار تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا:

"موم، تم ڈیڈ سے کہو، ڈیڈ کا تو شاید دماغ چل گیا ہے۔ بغیر سمارٹ فون کے میں اسکول جاتا اچھا لگوں گا؟ تم خود بتاؤ۔"

اس کی ضد کے آگے اسے سمارٹ فون لے کے دے دیا گیا مگر اب وہ سارا دن اس پر جھکا رہتا اور کوئی کام نہ کرتا۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ وائی فائی نے ایک دن کسی کاروباری پریشانی سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ کچھ عرصے بعد ون جی نے ٹو جی نامی لڑکی سے شادی کر لی اور ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انھوں نے تھری جی رکھا۔ تھری جی بہت تیز طرار بچہ تھا۔ اس کی پانچویں سالگرہ پر اسے نیا سمارٹ فون تحفے میں ملا۔ وہ اس پر ہر وقت ٹک ٹاک اور دوسری ایپس استعمال کرتا رہتا۔

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ون جی نے تھری جی کی شادی اپنی زندگی میں ہی فور جی نامی لڑکی سے کروا دی مگر چند سال گزرنے پر بھی جب اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی تو ایک دن تھری جی نے اپنا طبی معائنہ کروایا۔ پتا لگا کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا اور اس کا واحد حل یہی ہے کہ وہ کوئی بچہ گود لے لیں۔ مگر تھری جی کی بیوی فور جی نہیں مان رہی تھی۔ دونوں میں اس بات پر طلاق ہو گئی۔ اس کی بیوی نے ایک کتا فائیو جی پال لیا اور تھری جی نے بھی ایک ففتھ جنریشن پائی جان نامی روبوٹ خرید لیا۔

زمانے گزرتے گئے، پائی جان روبوٹ کو تھری جی کے زندگی گزارنے کے ست طریقوں سے کچھ اختلاف ہونے لگے تھے۔ ایک دن پائی جان روبوٹ نے سوئے ہوئے تھری جی کے منہ پر تکیہ رکھ کر اسے قتل کر دیا۔

اور اس طرح یہ پوری کہانی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور دوسری پائی جان روبوٹ کی زندگی کی کہانی کی ابتدا ہو گئی۔

Transi & Boizay

ٹرانسی ماگی کی اکلوتی اولاد تھی۔

جس دن وہ پیدا ہوا، نہ اس کا باپ وہاں موجود تھا نہ ہی کوئی اور رشتے دار۔ ایک دائی نے اس کی ماں کی مدد کی اور ٹرانسی نے دنیا میں پہلی بار آنکھ کھولی۔ صرف دائی اور اس کی ماں جانتی تھیں کہ وہ مکمل لڑکا نہیں ہے مگر اس کی ماں نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا اور اس راز کو اپنے سینے میں ہمیشہ کے لیے دفن کر لیا۔

ٹرانسی کے باپ کو چوری اور منشیات کے کاروبار میں ملوث ہونے کے جرم میں سات سال قید ہو گئی تھی۔ وہ جب قید کاٹ کر واپس وطن آیا تو اپنی اکلوتی اولاد ٹرانسی کو پہلی بار دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ وہ بھی اسے ہمیشہ لڑکا ہی سمجھتا رہا۔

ٹرانسی کو کچھ عرصہ بعد اسکول میں داخل کروا دیا گیا جہاں وہ دل لگا کر پڑھنے لگا اور جلد ہی وہ سکول کے لائق ترین بچوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔

ٹرانسی اپنی ذات میں گم رہنے والے بچوں میں سے ایک تھا۔ اس کی زیادہ دوستی خاموش طبع بچیوں کے ساتھ ہوتی۔ ٹرانسی اس وقت نہ جانتا تھا ایسا کیوں ہے، کہ وہ خود کو لڑکیوں کے زیادہ قریب پاتا تھا۔ لڑکیاں بھی اس کے انداز دیکھ کر اس سے دوستی کرنے میں

ہچکچاہٹ نہ رکھتی تھیں۔

پہلی بار اسے اپنے مختلف ہونے کا احساس تب ہوا جب وہ سوئمنگ پول میں باقی بچے بچیوں کے ساتھ تیر رہا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے لڑکوں جیسے بال بہت عجیب لگ رہے تھے۔ شانیہ جو اسی کی کلاس میں پڑھتی تھی، اس کے گردن تک لمبے سنہرے بالوں کو اس نے انگلی سے چھو کر دیکھا۔ اس کا دل بھی چاہا کہ کاش اس کے بال بھی لمبے ہوتے۔ اس نے گھر آکر اپنی ماں سے کہا کہ وہ اب کبھی بال نہیں کٹوائے گا۔

اس کی ماں نے اسے بہت کہا کہ تم لڑکی نہیں ہو لڑکے ہو، تمھارے بال صرف چھوٹے ہی اچھے لگیں گے۔ اس نے سکول میں موجود تین اور لڑکوں کا حوالہ دیا کہ ان کے بال تو لمبے ہیں، کیا وہ لڑکے نہیں؟

اس کی ماں خاموش ہوگئی۔ وہ جانتی تھی، آج نہیں تو کل ٹرانسی جان جائے گا کہ نہ وہ لڑکا ہے نہ لڑکی، مگر وہ اپنی ضد سے مجبور ٹرانسی کو لڑکے کے روپ میں ہی دیکھنا چاہتی تھی۔

ٹرانسی نے ضد کر کے لمبے بال رکھ لیے اور اسی طرح نویں کلاس تک پہنچ گیا۔ سکول میں سٹیج ڈراموں میں اسے ہمیشہ لڑکی کے رول کے لیے چنا جاتا اور وہ اس دوران لڑکیوں کے کپڑے پہن کر بہت خوش ہوتا۔ لپ سٹک اور میک اپ کر کے وہ ہمیشہ بے حد مسرور ہو جاتا۔ اس دوران ایک لڑکی سے اس کی دوستی ہوئی جو جلد ہی اس دن ختم ہو گئی جب ٹرانسی نے اس لڑکی کا بوسہ لینے سے ہچکچاہٹ دکھائی۔ نہ جانے کیوں جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا اس کو اب لڑکے زیادہ اچھے لگنے لگے تھے۔ اس کو اب صرف لڑکیوں جیسا بننا اور دکھنا اچھا لگتا تھا، ان کی قربت نہیں۔

وقت گزرتا گیا اور ٹرانسی نے امتیازی نمبروں سے کالج کا امتحان پاس کیا اور اسے ایک اچھی یونی ورسٹی میں سکالر شپ بھی مل گئی، جہاں سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک بڑی فرم میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی۔

وہ لڑکپن سے ہی جان چکا تھا کہ وہ مخنث ہے اور اس کی جنس لڑکیوں کے زیادہ

قریب ہے۔ ایک دن اس نے لڑکیوں والے کپڑے پہنے، میک اپ کیا اور اپنے گھر گیا۔ اس کا باپ اس وقت نشے میں شرابور تھا، اسے اس حلیے میں دیکھ کر وہ شدید غصے میں آ گیا اور اس پر بری طرح جھپٹ پڑا۔ اس کے سب کپڑوں کو پھاڑ ڈالا اور اچانک اس کی نظر ٹرانسی کے نامکمل عضو تناسل پر پڑ گئی جسے دیکھ کر وہ سکتے میں آ گیا۔ اس کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

ٹرانسی کا باپ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے پہلے ہی کافی کمزور ہو چکا تھا۔ کچھ دن بعد اس کی ماں سے جھگڑا کرتے اس کو دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

ٹرانسی کی ماں گو خود بھی ذہنی مریضہ بن چکی تھی اور مارفین کے نشے کی عادی تھی مگر ٹرانسی ماں ہونے کے ناطے اس کی پھر بھی بہت عزت کرتا تھا۔

باپ کی موت کے بعد ماں نے اسے ایک دن پاس بٹھایا اور وعدہ لیا کہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھ چکا ہے اور کماتا بھی ہے، وہ بس کسی طرح اس کی آخری خواہش پوری کرے۔

اس کی ماں کی خواہش تھی کہ ٹرانسی جلد شادی کر لے۔

ٹرانسی نے اپنی ماں سے کہا:

"ماں تم جانتی ہو میں نامکمل لڑکا ہوں، نامکمل لڑکی۔ پھر بھی تم میری شادی کی کیوں خواہش مند ہو؟"

اس کی ماں ماگی بولی:

"مجھے صرف تجھے شادی شدہ دیکھنا ہے ٹرانسی، تو کسی بھی حال میں میری زندگی میں شادی کر لے، میں تیری بیوی اور تیرے بچوں کو دیکھ کر مرنا چاہوں گی۔"

ٹرانسی اپنی ماں کی اس عجیب خواہش کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

ٹرانسی نہیں جانتا تھا وہ کیا کرے اور کیسے ذہنی اور جسمانی بیمار نشے کی عادی اپنی ماں کی آخری خواہش پوری کرے۔

ساری رات اس نے اسی اضطراب میں گزاری۔ آخر اس نے ایک جنس کے ماہر ڈاکٹر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر سیکسر ملک کے جنس کی تبدیلی کے ماہر سرجنوں میں سرفہرست

تھے۔ ٹرانسی نے جب اپنا معاملہ ان کے سامنے رکھا تو انھوں نے اس کے کچھ ٹیسٹ کیے اور نتائج دیکھنے کے بعد اسے بتایا کہ ٹرانسی کے ایک چھوٹے سے آپریشن اور ٹیسٹو ٹسٹرون کے کورس کے بعد مکمل لڑکی بننے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اور انھیں پوری امید ہے وہ ٹیسٹوٹسرون کی مناسب مقدار لینے سے بچے کی ماں بھی بن سکتا ہے کیوں کہ حیرت انگیز طور پر اس کے جسم میں بچہ دانی موجود ہے۔

ٹرانسی کے لیے اس خبر میں ایک عجیب سی خوشی بھی تھی اور پریشانی بھی۔ خوشی یہ کہ وہ ہمیشہ سے خود کو لڑکی کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا اور پریشانی یہ تھی کہ اب وہ اپنی ماں کی خواہش کو کیسے پورا کرے۔۔۔

جب اس نے اپنی اس ذاتی پریشانی کا ذکر ڈاکٹر سیکسر سے کیا تو انھوں نے ٹرانسی کو تسلی دی اور بتایا کہ ان کے پاس اس کا بھی حل موجود ہے۔

ٹرانسی نے پوچھا وہ کیا؟

ڈاکٹر سیکسر نے کہا، ان کے پاس بہت سے کیسز آتے ہیں اور اس سے ملتا جلتا ایک اور کیس حال ہی میں آیا ہے جہاں ایک لڑکا جس کا نام بوئے زے ہے جس کا خاندان اسے شروع سے ہی لڑکی سمجھتا ہے اور وہ خود بھی بچپن سے لڑکپن تک خود کو لڑکی ہی سمجھتی تھی، آہستہ آہستہ اس کے ہارمونز میں تبدیلی ہوئی اور اس کا جسم لڑکوں کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ اس کی مونچھ داڑھی نکل آئی، سینے پر بال زیادہ نکلنے لگے اور وہ اسے مجبوراً شیو کرنے لگی۔ اس بچی نے حال ہی میں جب ان سے رابطہ کیا تو ڈاکٹر سیکسر اس کے مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک آپریشن کے بعد وہ بھی یقیناً لڑکا بن سکتی ہے۔ اگر ٹرانسی چاہے تو وہ اس کی ملاقات اس سے ملتے جلتے کیس والے اس لڑکے بوئے زے سے کروا سکتے ہیں، ”شاید تم دونوں ایک دوسرے کے قریب آجاؤ۔“

ڈاکٹر سیکسر نے پُرجوش انداز میں کہا۔

ڈاکٹر سیکسر نے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس ایسے بہت سے کیسز آتے ہیں مگر بہت کم

ٹرانسی اور بوئے زے جیسے ہوتے ہیں۔ جہاں جنس کی مکمل تبدیلی کا معاملہ نہیں صرف شناخت کا معاملہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔

زیادہ تر کیسز میں جنس کی تبدیلی والے یا ایسے لوگ آتے ہیں جو نہ ہی لڑکا ہوتے ہیں اور نہ ہی لڑکی، ان ٹرانس جینڈرز کی بھی وہ ممکن مدد کر کے انہیں ان کی خواہش کے مطابق ہینڈل اور علاج کرتے ہیں جن میں سے بیشتر بچہ پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سیکسر نے ٹرانسی کو کہا کہ وہ بوئے زے سے بات کریں گے، اگر اس نے دل چسپی ظاہر کی تو وہ ٹرانسی کا موبائیل نمبر اسے دیں گے۔ شاید تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔

ڈاکٹر سیکسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹرانسی نے حامی بھر لی اور ڈاکٹر سیکسر کا شکریہ ادا کیا۔

دو دن بعد ٹرانسی کے فون پر ایک گمنام کال آئی۔ جب ٹرانسی نے فون اٹھایا تو بھاری لہجے میں دوسری طرف سے کوئی بولا۔ "ٹرانسی میں بوئے زے ہوں، ڈاکٹر سیکسر نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا۔ آپ آج دوپہر میں کیا کر رہی ہیں؟ کیا ہم لنچ میں مل سکتے ہیں؟"

ٹرانسی نے خوش دلی سے جواب دیا:

"جی کیوں نہیں۔ میرا آفس پینس ٹاور کے نزدیک ہے۔"

اچھی بات ہے۔ تو پھر ملتے ہیں۔ آج دن بارہ بجے ای کو ال ریستوران میں۔"

بوئے زے نے پر جوش انداز میں کہا۔

ٹرانسی نے اپنا سب سے اچھا نیلے رنگ کا زنانہ جوڑا نکالا اور لائیٹ سا میک اپ کر کے ٹھیک بارہ بجے ای کو ال ریستوران پہنچ گئی۔

اندر بوئے زے گرے سوٹ، سفید شرٹ، نیلی ٹائی لگائے پہلے سے وہاں موجود تھا۔ بوئے زے نے ٹرانسی کو دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا۔ بوئے زے میں ایک عجیب سی کشش تھی اور ٹرانسی تھوڑی دیر بات کرنے میں ہی اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ بوئے زے بھی ٹرانسی

میں بہت دل چسپی لے رہا تھا۔

ٹرانسی اور بوئے زے دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی زندگی کی مختصر کہانیاں سنائیں۔

کچھ دن دونوں کی ملاقاتیں چلتی رہیں اور ایک دن بوئے زے نے ٹرانسی کو پرپوز کر دیا۔ ٹرانسی بھی دل و جان سے بوئے زے کو چاہنے لگی تھی۔ اس نے فوراً حامی بھر لی۔ اب مرحلہ تھا اس شادی کو کیسے ممکن بنایا جائے۔ دونوں نے اس کے لیے عجیب ترکیب نکالی۔ بوئے زے ٹرانسی کو لڑکے کے حلیے میں اپنے والدین سے ملوانے اپنے گھر لے گئی۔ بوئے زے کی ماں اور باپ دونوں نے ٹرانسی کو دیکھتے ہی پسند کر لیا اور ادھر ٹرانسی بھی بوئے زے کو اپنی ماں سے ملوانے لے گیا۔ ٹرانسی کی ماں بھی بوئے زے کا ملکوتی حسن دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گئی اور اس نے ٹرانسی سے کہا کہ اسے ایسی ہی بہو کی تلاش تھی۔ اس دوران ٹرانسی اور بوئے زے دونوں باقاعدگی سے ڈاکٹر سیکسر سے اپنا علاج بھی کرواتے رہے اور دونوں کا جسم باقاعدہ مرد اور عورت میں بدل گیا۔

مگر اپنے بڑوں کی خوشی کی وجہ سے ٹرانسی لڑکا بنی رہتی اور بوئے زے لڑکی کے بھیس میں رہتا۔

اور پھر وہ دن آن پہنچا جب ٹرانسی اور بوئے زے کی باقاعدہ شادی کے دن کا اعلان ہوا۔ وہ دونوں پریشان تھے کہ شادی کے دن کیسے لوگوں کو چکمہ دیں۔

ٹرانسی نے اپنی ماں کو یہی بتایا تھا کہ بوئے زے کا دنیا میں کوئی نہیں اور بوئی زے نے ٹرانسی کے بارے میں بھی یہی بات اپنے والدین سے کر رکھی تھی۔

مجبوراً دونوں کو دو شادیوں کی پارٹیز کرنی پڑیں۔ ایک ٹرانسی کی ماں کی خوشی کے لیے جہاں ٹرانسی دلہا بنا اور بوئے زے دلہن اور دوسری بوئے زے کے خاندان کے سامنے جہاں ٹرانسی دلہا بنا اور بوئے زے دلہن۔

جیسے تیسے تمام معاملات بغیر کسی کو پتا چلے نپٹ گئے۔ اب دونوں باقاعدہ میاں بیوی اور

بیوی میاں کے نام سے دو مختلف شہروں میں رجسٹرڈ تھے۔

مگر اب وقت آ گیا تھا کہ دونوں اس جھوٹ کو بے نقاب کر دیں اور دنیا اور اپنے خاندان کا مقابلہ کریں۔

ٹرانسی ماں بننے والی تھی۔ وہ زنانہ کپڑوں میں ماں کے گھر پہنچی اور اس نے ہمت کر کے اپنی ماں کو یہ خوش خبری سنائی کہ ماں، میں ماں بننے والی ہوں۔ ماں کا منہ اس کے حلیے اور بات کو دیکھ کر کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

"کیا بک رہے ہو؟"

ٹرانسی کی ماں ماگی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ماں! میں سچ کہ رہی ہوں۔ میں ماں بننے والی ہوں اور میری جو بھی اولاد ہو گی، میں اسے وہی شناخت دوں گی جو سچ ہو گی۔"

ٹرانسی نے بھرائی آواز میں کہا۔

ماگی ٹرانسی کی بات سن کر رونے لگی۔

"نہیں، تم لڑکا ہو--لڑکا ہو--لڑکا ہو--"

اتنے میں بوئے زے مردانہ لباس میں وہاں آ گیا۔ ماگی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔ ماں کو روتا دیکھ کر ٹرانسی نے ماں کو گلے لگایا اور کہا۔

"ماں میں وہی ٹرانسی ہوں، صرف لباس اور ذرا سا حلیہ بدلا ہے۔ روتی کیوں ہو ماں؟ کیا تم خوش نہیں کہ نانی بننے والی ہو؟ دادی اور نانی بننے میں کتنا فرق ہوتا ہے ماں؟"

ٹرانسی نے روہانسی آواز میں کہا۔

ماگی نے بڑھ کر ٹرانسی کا ماتھا چوم لیا اور بولی۔

"نہیں، دادی نانی میں کوئی فرق نہیں، صرف نام کا فرق ہے بس۔"

اور وہ تینوں مسکرا دیے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں یہ خوش خبری سنانے بوئے زے کے گھر گئے۔ بوئے زے کے

ماں باپ بوئے زے کو اس حلیے میں اور ٹرانسی کے بڑھے پیٹ کے دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ انھیں سمجھ نہ آئی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔

بوئے زے نے اپنی ماں سے کہا:

"ماں! تمھارا بیٹا باپ بننے والا ہے، مبارک نہیں دو گی؟"

بوئے زے کی ماں نے نم آنکھوں سے دونوں کو گلے لگالیا۔

ریس کا آخری کھلاڑی!

آگے بڑھنا اہم ہے رفتار نہیں
ایک انچ آگے بڑھنا بھی آگے بڑھنا ہے

دوڑ میں اختتامی لائن پر ایک انچ آگے پہلے قدم رکھنے والا جیت کا حق دار ضرور ٹھہرتا ہے مگر میراتھن میں سب سے آخر میں آنے والا کھلاڑی بھی اپنی جگہ ایک عظیم کھلاڑی ہوتا ہے۔

ایک رات سات بجے میراتھن دوڑ شروع ہوئی۔ اس میراتھن ریس میں تمام دوڑ لگانے والے ایک ایک، دو دو، پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے فنشنگ لائن پر آگے پیچھے لگ بھگ چار گھنٹے میں پہنچ گئے مگر صرف ایک کا انتظار تھا جو فنشنگ لائن سے ابھی میلوں دور تھا۔ وہ ایسا ایتھلیٹ تھا جو جسمانی طور پر تو کمزور تھا مگر ذہنی طور پر اور ہمت میں باقی سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ اپنی جسمانی طاقت کے حساب سے وہ بغیر کسی پریشر کے آگے بڑھتا رہا۔ دوڑ میں حصہ لینے سے پہلے اور ریس کے دوران اس کے ذہن میں کسی سے جیتنے کا مقصد کبھی نہ آیا۔ اس کے ذہن میں صرف خود سے جیتنے کا مقصد تھا۔ جس مقصد کو لیے وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ ریس کو دیکھنے آئے ارد گرد کھڑے لوگ اسے دیکھ دیکھ کر حیران تھے۔ بہت سے لوگ اس کے آگے بڑھنے کی رفتار پر ہنس بھی رہے تھے۔ کچھ اسے تیز بھاگنے کے لیے مجبور کرنے لگے، کچھ اس کا مذاق اڑانے لگے۔ کچھ نے کہا یہ ریس صرف تیز بھاگنے والوں کی تھی، تو نے

اس رفتار سے اس میں بھاگنا تھا تو ریس میں آیا ہی کیوں۔ ایک تماش بین عورت بولی، "تجھے ریس چھوڑ دینی چاہیے۔ اگر تُو اور بھاگا تجھے ایسا چکر آئے گا کہ تُو گر جائے گا۔"

ایک زمین پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے آدمی نے کہا: "مجھ سے شرط لگا لو، یہ کبھی فنشنگ لائن تک نہیں پہنچ پائے گا۔"

ایک اور بولا، "یہ کوئی دیوانہ ہے جو خود کو سب سے اچھا کھلاڑی سمجھنے کے خبط میں بھاگ رہا ہے۔"

اچانک ایک شخص اسے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھنے کی آفر کرنے لگا، بولا: "تُو اور بھاگا تو مر جائے گا۔ چھوڑ ریس اور میرے ساتھ بیٹھ جا۔"

مگر وہ سب سے لاتعلق ہو کر اپنی طاقت کے حساب سے بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ فنشنگ لائن پر لوگوں نے اس کا انتظار کرنا وقت کا زیاں سمجھا اور انعامات دینے کی تقریب کا آغاز کر دیا۔

جیتنے والوں میں ٹرافیاں بانٹ دی گئیں۔ اوّل آنے والے کو سب سے بڑی ٹرافی دی گئی۔ دوسرے اور تیسرے کو اس سے ذرا چھوٹی ٹرافی اور ہار پہنا دیے گئے۔

اس دوران اوّل آنے والے کو کسی نے کان میں بتایا کہ ریس کا آخری کھلاڑی اب بھی بھاگ رہا ہے، شاید کوئی بہت احمق ہے جو اب تک نہیں پہنچا۔ بے چارہ ابھی بہت دور ہے!

جیتنے والے کھلاڑی نے سوچا، کون ہے یہ کھلاڑی؟ کیوں نہ اس سے ملا جائے۔

تقریب ختم ہو گئی۔ سب لوگ گھروں کو چلے گئے مگر اوّل آنے والے نے اس کا انتظار کرنے کا عجیب فیصلہ کیا۔ وہ فنشنگ لائن پر گھنٹوں بیٹھا رہا۔ آخر کار نپے تلے قدم اٹھاتا وہ کھلاڑی اگلے دن صبح چار بجے فنشنگ لائن پر پہنچا۔ اس کے استقبال کے لیے اوّل آنے والا کھلاڑی وہاں موجود تھا۔ اس نے اسے اپنی ٹرافی دی اور بتایا کہ صحیح معنوں میں وہی اس ریس کا فاتح ہے۔

سورج پہاڑ کی اوٹ سے اچانک باہر نکلا اور دونوں کھلاڑیوں کو روشنی کے ہار پہنا دیے۔ دونوں کھلاڑیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

اردو کہانی اکیسویں صدی میں داخل ہونے سے پہلے بھی اپنے امکانات کی سرحدیں انوکھے اور نامعلوم سمتوں اور علاقوں میں دریافت کر رہی تھی لیکن اب اردو کہانی پوری دنیا میں اسرار اور حیرت کے نئے سفر پر گامزن ہوتے ہوئے ہر لمحہ ہمیں چونکانے کے لیے اپنے دامن میں نت نئے کردار اور ان کا افسوں کہیں نہ کہیں سے تلاش کر کے لے آتی ہے۔ کہانی کبھی بھی کہیں سے آجاتی ہے، ہر لمحہ کہانی ایک حیرت بھی ہے اور تجربہ بھی ہے۔ لگتا ہے وہ ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ یہ بات میں نے اپنی کہانیوں کے مجموعے "کہانی مجھے ملی" میں بیان کیا تھا اور اب سلمان بخاری نے اپنے مجموعے "دورنگا" میں اپنے دیباچہ میں بھی بیان کی ہے جس کا عنوان انھوں نے "بیدار تخیل" رکھا ہے۔ سلمان بخاری جاپان کے شہر کاناگاوا کین میں رہتے ہیں۔ اس بیان میں انھوں نے کہانی کو یادداشت سے جوڑتے ہوئے زمانوں کے مدوجزر میں تلاش کیا ہے۔ خیال جب جاگ رہا ہو تو وہ زمان و مکاں کو توڑ کر کہیں بھی رشتہ جوڑ لیتا ہے اور پھر کہانی وہاں موجود ہوتی ہے۔ سلمان بخاری کے ان افسانوں یا کہانیوں کو سمجھنے کی یہ ایک کلید ہے۔ انسان کی تسخیر کی تمنا کی معراج اور ازلی مجبوریوں کے درمیان ان کہانیوں نے کہیں جنم لیا ہے۔

اصغر ندیم سید

AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road,Lahore.
Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844
E-mail:publicationa.aks@gmail.com